فقہ النساء

محمد عطیہ خمیس

فقہ النساء

محمد عطیہ خمیس

مترجم: سید شبیر احمدؒ

فہرست مضامین

حدث اکبر کی حالت میں جو امور منع ہیں ۱۰۹

فطری مسنون طریقے ۱۲۳

عریانی اور لباس ۱۳۳

محرم کون ہیں ۱۴۱

حدودِ ستر ۱۵۴

عیدین کی نماز اور خواتین ۲۲۵

زکوٰۃ ۲۳۷

عورت اور صدقات ۲۵۷

صوم (روزہ) ۲۶۸

رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ۲۷۷

حج ۳۲۳

رمیِ جمار (کنکریاں مارنا) ۴۱۶

طواف (خواتین کی مشکلات) ۴۲۹

☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اردو زبان میں یہ اپنے موضوع کی پہلی اور منفرد کتاب ہے۔ اس میں مسلم خواتین کے لیے صرف عبادات سے متعلق احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ آئندہ ہم مسلمان عورتوں کے بارے میں شخصی قوانین (نکاح و طلاق، خلع، وراثت وغیرہ) معاملات (خرید و فروخت، تجارت، شراکت، قرض وغیرہ) جہاد اور سرکاری خدمات کے سلسلے میں احکام شریعت پر مشتمل کتاب لائیں گے۔ مسلمان عورت معاشرے کا ایک نہایت اہم اور متحرک عنصر ہے۔ اسلامی تہذیب کے خدوخال روشن کرنے اور اسلامی انقلاب کو بروئے کار لانے میں جس طرح مردوں کی خدمات ہیں، اسی طرح عورتوں کی بھی زریں خدمات ہیں۔ تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ، جہاد و دفاع، تمدنی و عمرانی اصلاحات، ادب و شعر اور تدریس و تالیف غرض ہر شعبہ زندگی میں خواتین نے تاریخ میں غیر معمولی کارنامے سرانجام دیے ہیں۔

آج بھی اگر ہم معاشرہ کے اندر صالح انقلاب برپا کرنا چاہیں اور معاشرے کی ناہمواریوں کو دور کرنا چاہیں تو خواتین کو ہم قدم بننا ہوگا۔ بلکہ ماضی کی نسبت آج خواتین کے اشتراک کی زیادہ ضرورت ہے اور خواتین کی جدوجہد بھی اب زیادہ نتیجہ خیز اور اثر انگیز ثابت ہو رہی ہے۔ یہ اشتراک تب ہوسکتا ہے کہ خواتین احکام شریعت سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ کتاب فقہ النساء اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔

زیر نظر کتاب 'فقہ النساء' اپنی افادیت کے لحاظ سے ایسی ہے کہ اسے جہیز میں بچیوں

کو دیا جانا چاہیے۔ نیز یہ کتاب گھر میں بڑی خواتین سے لے کر چھوٹی بچیوں تک کے لیے ایک اچھا استاذ شریعت ہے۔ اس میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں وہ تحقیق و تدقیق کی میزان سے گزرے ہیں اور ہر مسئلے کے بارے میں مختلف مسالک بیان کر کے شریعت اسلامی کی وسعت اور ہمہ گیری واضح کی گئی ہے۔

خاکسار

خلیل احمد حامدی

ڈائرکٹر ادارہ معارف اسلامی، منصورہ لاہور

۳؍نومبر ۱۹۹۲ء

دیباچہ طبع جدید

عورت کسی بھی معاشرے کو سنوارنے اور اصلاحِ معاشرہ کے اہم کام میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ اسلامی تہذیب کے خدوخال نمایاں کرنے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد میں مسلمان عورتوں کی خدمات اسی طرح سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں، جس طرح مسلمان مردوں کی خدمات میں، تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ، صحت عامہ، جہاد و دفاعِ وطن، تمدنی و عمرانی انقلاب، معیشت و اقتصادیات، ادب و شعر اور تدریس و تالیف۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ اور ہر میدان میں مسلمان خواتین نے تاریخ عالم میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں اور تابناک مثالیں قائم کی ہیں جو آج بھی جاری ہیں۔ خواتین منصفانہ معاشرے کے قیام کی جدوجہد میں برابر کی شریک ہیں۔

یوں تو پورے ملک میں بحیثیت مجموعی شرح خواندگی افسوسناک حد تک کم ہے لیکن خواتین میں یہ شرح بہت کم ہے۔ اس لیے خواتین کے اندر دینی معلومات مردوں کی نسبت کم ہیں۔ ایک عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ خواتین سے متعلق فقہی مسائل خاص طور پر عبادات سے متعلق احکام و مسائل پر مشتمل ایک معیاری کتاب شائع کی جائے تاکہ خواتین احکامِ شریعت سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے عالم اسلام کے معروف محقق محمد عطیہ خمیسؒ کی مفید کتاب 'فقہ النساء' کا اردو زبان میں ترجمہ مولانا سید شبیر احمد مرحوم سے کرایا گیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں شائع کی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اب تک اس کے نو ایڈیشن شائع کیے جا چکے ہیں۔

اب دسواں ایڈیشن شائع کرتے وقت کتابت کے بجائے کمپوزنگ کے ذریعے شائع کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ پسند کی جائے گی۔ حلقہ خواتین کی ذمہ داروں اور کارکنوں سے

درخواست ہے کہ اس مفید کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت عام خواتین کے اندر کی جائے۔ لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں بھی رکھوائی جائے تاکہ اس سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہو سکے۔

خاکسار

محمد اسلم سلیمی

ڈائریکٹر ادارہ معاف اسلامی، منصورہ، لاہور

۳۰/ ذی الحجہ ۱۴۲۱/ ۲۶/ مارچ ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حمد وثناء اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جس نے اپنی محکم کتاب میں ارشاد فرمایا:

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات:١٣)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے، جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

نیز یہ ارشاد فرمایا:

وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (المؤمن:٤٠)

''اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔''

اور صلوٰۃ وسلام ہو بنی نوعِ انساں کے سردار حضرت محمد ﷺ پر جو نبیِ برحق ہیں اور اللہ کی طرف سے برحق رہنمائی کرنے والے ہیں، جنھوں نے ہمیں عورتوں سے حسن سلوک کا حکم دیا اور عورتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت میں پورے اہتمام وانہماک کا حکم دیا۔ آپ کا ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے، جو رات کے وقت بیدار ہو کر

خود بھی نماز پڑھتا ہے اور اپنی بیوی کو بھی جگاتا ہے اور وہ بھی نماز پڑھتی ہے اور اگر وہ اٹھنے کو تیار نہ ہو تو اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرمائے اس عورت پر جو رات کو اٹھتی ہے، خود بھی نماز پڑھتی ہے اور اپنے خاوند کو بھی جگاتی ہے اور وہ بھی نماز پڑھتا ہے اور اگر وہ انکار کرے تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتی ہے۔''

اے اللہ! تو صلوٰۃ وسلام اور برکتیں نازل فرما اس نبی امین وکریم پر جو سب کا محبوب ہے، اسی طرح جیسے تو نے اپنا صلوٰۃ وسلام اور برکتیں نازل فرمائیں سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر۔ بے شک تو حمید ومجید ہے۔

ہمارے ادارے ''شباب سیدنا محمد ﷺ'' نے ایک مدت سے اپنی توجہ مسلمان عورت کی بہتر تربیت اور صحیح رہنمائی کی طرف مبذول کر رکھی ہے کیوں کہ عورت کی تعلیم و تربیت خاندان کی اصلاح کی بنیادی عوامل میں سے ہے اور اگر خاندان کی اصلاح ہو جائے تو پوری قوم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

''ماں کی گود ایک ایسا مدرسہ ہے کہ اگر اس کی تعمیر و اصلاح کر لی جائے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک عمدہ اور مضبوط اخلاق و کردار کی پود تیار ہوگئی۔''

ماں ان تمام نامور معلّمین کی اصل استاد ہے، جن کی تعلیم وحکمت پوری دنیا پر چھاتی رہی ہے۔ اپنی بیٹیوں کی بہتر تعلیم و تربیت کرو، کیوں کہ مشرق کی پسماندگی کی اصل علت عورت میں صحیح تعلیم و تربیت کا فقدان ہے۔

امت مسلمہ کا روشن مستقبل اور اسلام کا عروج و غلبہ دونوں اس بات پر موقوف ہیں کہ ایک ایسی نئی نسل تیار کی جائے، جو ایمان و اطاعت کی فضا میں پروان چڑھے، تقویٰ و اخلاقِ فاضلہ کی حامل ہو، پاکیزگی وعفت کے جوہر سے آراستہ اور قوت وشجاعت سے بہرہ ور ہو، اور یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ معاشرے میں ایسے مسلمان مرد اور عورتیں نہ پیدا ہو جائیں، جو صحیح معنوں میں مسلمان کہلائے جاسکتے ہوں۔

مغربی استعمار نے ماضی میں ہمارے ملکوں کے اندر طرح طرح کے فتنے پیدا کیے،

بے راہ روی اور بگاڑ کے اسباب زیادہ سے زیادہ پھیلائے۔ اباحیت اور بد اخلاقی کو رواج دیا، مسلمان گھرانوں کو مغرب کی بے دین تہذیب کے ذریعے سے جو عریانی اور اختلاط مرد و زن کی علمبردار تھی، کھوکھلا کر دیا اور اللہ و رسول کی تعلیمات کے بارے میں غفلت میں مبتلا کر دیا۔ ان تمام حالات کے پیش نظر اب ہمارا فرض ہے کہ ہم مسلمان عورت کی مدد کریں اور اسے تباہی سے نکالیں تاکہ پھر ہمارا ہر گھر حق اور راست بازی کا قلعہ اور ایمان و حیا داری اور اسلامی تعلیمات سے تعلق واستواری کا مستحکم گہوارہ بن جائے۔

آج بہت سی ایسی باتیں دیکھنے میں آ رہی ہیں جو اچھے مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ماضی میں مسلمان عورت اسلامی اقدار سے، جس قدر دور ہوگئی تھی اب اس کے برعکس ہم بہت سی مسلم خواتین کو اللہ کے دین اور اسلامی تعلیمات کی طرف ذوق و شوق کے ساتھ رخ کرتا ہوا دیکھ رہے ہیں، بالخصوص پردے کے بارے میں اسلامی احکام کی طرف ان کی رغبت بڑی حوصلہ افزا ہے اور اس مبارک اور پاکیزہ رجحان کی بنا پر جو اَب ہر طرف پھیلتا جا رہا ہے، جامعات کی تعلیم یافتہ طالبات میں یہ ذوق بطور خاص روز افزوں ہے۔ یہ صورت اغیار کی نظروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ ایک غیر ملکی خبر رساں ادارے نے مصر کی جامعات میں باپردہ طالبات کے اعداد و شمار جمع کیے تو معلوم ہوا کہ تقریباً چھ ہزار طالبات ایسی ہیں، جو تعلیم کے دوران پردہ کی پابندی کرتی ہیں۔ ان خواتین اور لڑکیوں میں دینی احکام و مسائل جاننے اور ان پر عبور حاصل کرنے کا شدید احساس موجود ہے اور ان کی طرف سے مجھے بارہا ایسے سوالات موصول ہوتے رہتے ہیں، جن میں وہ خواتین سے متعلق اسلام کے احکام دریافت کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان خواتین اور طالبات میں یہ جاننے کی شدید پیاس پائی جاتی ہے کہ عبادات و معاملات کے سلسلے میں خواتین کے لیے اللہ اور رسول کے احکام کیا ہیں؟ اور از روئے اسلام خواتین کے حقوق و فرائض کیا ہیں؟

الغرض دینی موضوعات پر متعدد خواتین کی طرف سے اس نوعیت کے بکثرت سوالات مجھ سے پوچھے گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ایسے ہی سوالات دوسری خواتین کے ذہنوں میں بھی گردش کر رہے ہوں گے، چناں چہ میں نے اسی احساس کے پیش نظر

یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ اس کتاب میں اسلام کے صرف پانچ بنیادی ارکان سے متعلق احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں اور یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ صرف ان احکام و مسائل کا ذکر کیا جائے، جو بالخصوص عورتوں سے متعلق ہیں اور عام فقہی مسائل کو چھوڑ دیا گیا ہے کیوں کہ وہ دیگر کتب فقہ میں بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔

میں نے یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ مسائل پیش کرتے وقت فقہ کے چاروں مذاہب کا نقطۂ نظر پیش کردوں تاکہ پڑھنے والیوں کی معلومات میں اضافہ ہو اور وہ دینی احکام میں سے اپنے لیے اس مسئلہ کا انتخاب کرسکیں، جس پر ان کا دل مطمئن ہو۔

ان مسالک میں دراصل اصولوں کا اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ محض فروعی اختلاف ہے اور ان چاروں مسالک کے، جس عالم نے بھی کسی مسئلے میں جو رائے اختیار کی ہے اس کے پاس اپنی اس رائے کے حق میں کوئی نہ کوئی دلیل وسند موجود ہے۔

مجھے امید ہے کہ میں نے اس کتاب میں اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے ان تمام مسائل کا حل پیش کر دیا ہے، جو شاید ان کو معلوم نہ تھے اور دینی علم کا جو دروازہ ان پر بند تھا وہ کھول دیا ہے، تاکہ وہ عبادات صحیح طریقہ پر ادا کرسکیں اور اپنی طرز و روش حیات کو درست کرلیں اور ایسی زندگی گزاریں، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو پسند ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان بہن اور بیٹی کو اپنی اطاعت اور ایسے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، جن سے اس کی خوشنودی حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدۡخِلَ الۡجَنَّۃَ فَقَدۡ فَازَ (آل عمران:۱۸۵)

”جو جہنم سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل ہوگیا بس وہ کامیاب ہوگیا۔“

محمد عطیہ خمیس

صدر ”شباب سیدنا محمد ﷺ“

طہارت

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"الطھور شطر الایمان" (مسلم) "طہارت ایمان کا نصف حصہ ہے۔"

دراصل طہارت و پاکیزگی ان ستونوں میں سے ایک بنیادی ستون ہے، جن پر دین اسلام قائم ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ پر پہلی وحی جو نازل ہوئی وہ یہ تھی:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ۝ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ۝

"پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔"

اور اس کے بعد دوسری وحی جو نازل ہوئی وہ تھی:

یٰۤاَیُّھَا الۡمُدَّثِّرُ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ وَ ثِیَابَکَ فَطَھِّرۡ وَالرُّجۡزَ فَاھۡجُرۡ

"اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو، اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو اور اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دور رہو۔"

گویا دوسری وحی کی یہ آیاتِ کریمہ پاکیزگی اور صفائی کی طرف ایک ایسی دعوت ہے، جس میں ظاہری طہارت ثِیَابَکَ فَطَھِّرۡ بھی ہے اور باطنی طہارت کا حکم والرجز فاھجر بھی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ثِیَابَکَ فَطَھِّرۡ ہی طہارت و پاکیزگی کی حقیقی اور مکمل دعوت ہے۔ کیوں کہ کپڑوں کے پاک صاف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر طرح کی ظاہری و باطنی اور مکمل طہارت اختیار کی جائے۔

اسلام کی عظمت و جمال کے کیا کہنے کہ جب اپنے پیرو کاروں کو طہارت کی تعلیم دیتا ہے تو طہارت کا کوئی پہلو نہیں چھوڑتا۔ ظاہری طہارت بھی اور باطنی طہارت بھی۔ بلکہ ہر چیز اور ہر بات میں کامل طہارت اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

قرآن مجید میں طہارت کی تعلیم جس انداز میں دی گئی ہے ذرا اس پر ایک نظر ڈالی لی جائے:

۱ - اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۝ (البقرۃ:۲۲۲)

''بے شک اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے، جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔''

۲ - فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِی الْمَحِیْضِ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَطْهُرْنَ (البقرۃ:۲۲۲)

''حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔''

۳ - فاذا تطهرن فاتوهن من حيث امركم الله (البقرة:۲۲۲)

''پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ، اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے)

٤ - فيه رجال يحبون ان يتطهروا والله يحب المطهرين (التوبة:۱۰۸)

''اس میں ایسے لوگ ہیں، جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔''

٥ - و ان خفتم جنبا فاطهروا (المائدة:٦)

''اور اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔''

٦ - فی کتاب مکنون لا یمسه الا المطهرون (الواقعة:۷۸،۷۹)

''ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا جسے پاک لوگوں کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔''

اللہ تعالیٰ نے جنت کی حوروں کا وصف بھی پاکیزگی بیان کیا ہے۔

۷- ولهم فيها ازواج مطهرة و هم فيها خٰلدون (البقرة:۲۵)

''اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔''

۸- خلدين فيها و ازواج مطهرة و رضوان من الله (آل عمران:۱۵)

''وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔''

اور نبی کریم ﷺ نے بھی بہت سی احادیث مبارکہ میں اسلامی دعوت و تعلیم کے نقطۂ نگاہ سے طہارت و پاکیزگی کی اہمیت پر بے حد زور دیا ہے۔ چناں چہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

۱- الطهور شطر الايمان (مسلم)

''طہارت نصف ایمان ہے۔''

۲- لا تقبل الصلوة بلا طهور (مسلم)

''طہارت (وضو وغیرہ) کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔''

ان ارشادات کی رو سے طہارت ایمان کا نصف بھی ہے اور مسلمان ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط بھی، چناں چہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ سے اسلام کے بارے میں سوال کیا اور پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟

تو نبی کریم ﷺ نے جواب دیا:

الاسلام ان تشهد ان لا اله الا الله و ان محمدا رسول الله و ان تقيم الصلٰوة و توتى الزكٰوة و تحج البيت و تعتمر و تغتسل من الجنابة و ان تتم الوضو و تصوم رمضان. الخ

''اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور یہ کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور بیت اللہ کا حج اور عمرہ کرے اور جنابت کا غسل کرے اور وضو کرے اور رمضان کے روزے رکھے۔''

جبریل علیہ السلام نے کہا: اگر میں یہ سب کروں تو کیا پھر مسلمان ہوں؟

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہاں۔

اس پر جبریل علیہ السلام نے کہا: آپ نے درست فرمایا۔

یہ روایت ابن خزیمہؒ نے اپنی کتاب الصحیح میں بیان کی ہے اور بخاری، مسلم اور ان کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں بھی یہ روایت موجود ہے، جس کا انداز بیان قدرے مختلف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طہارت کو نماز کے لیے شرط قرار دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

ما من مسلم يتطهر فيتم الطهور الذى كتب الله عليه فيصلى هذه الصلوات الخمس الا كانت كفارات لما بينها (مسلم)

''جو مسلمان طہارت حاصل کرتا ہے اور اللہ کے فرض کیے ہوئے طریقہ پر پوری طرح پاک صاف ہو کر پانچوں نمازیں ادا کرتا ہے تو یہ نمازیں اس کے ان گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں، جو اوقات نماز کے درمیان کیے گئے ہوں۔''

اور اگر غسل اور وضو کے لیے پانی دستیاب نہ ہو تو اسلام نے تیمّم کی صورت میں معنوی طہارت کا انتظام فرما دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا (النساء:۴۳، المائدۃ:۶)

''اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو۔''

ان ارشادات کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ اسلام پاکیزگی اور صفائی کا دین ہے تو ایسا کہنا بالکل صحیح ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

الطهور شطر الايمان والحمد لله تملاء الميزان، و سبحان الله والحمد لله تملأ ما بين السموات والارض والصلوٰة نور والصدقة برهان والصبر ضياء والقرآن حجة لك او عليك. كل الناس يغدو فبائع نفسه فمعتقها او موبقها. (مسلم، کتاب الطهارة)

''طہارت نصف ایمان ہے اور الحمد للہ کا ثواب ترازو کو بھردے گا اور سبحان اللہ والحمد للہ کا ثواب آسمانوں اور زمین کے درمیان جو خلاء ہے اس کو بھردے گا اور نماز نور ہے اور صدقہ دلیل ہے اور صبر روشنی ہے اور قرآن تیرے حق میں حجت بنے گا یا تیرے خلاف حجت قائم کرے گا ہر شخص روزانہ صبح اٹھتا ہے اور اپنی جان کا سودا کرتا ہے پھر وہ یا اپنے آپ کو آزاد کرا لیتا ہے (عذابِ الٰہی سے) یا خود کو تباہ کرتا ہے (برے کام کرکے)۔''

نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ہم پورے اہتمام سے وضو کریں اور اس کا ثواب یہ بتایا ہے:

من توضأ فاحسن الوضو خرجت خطاياه من جسدهٖ حتى تخرج من تحت اظفارهٖ (متفق عليه)

''جس شخص نے اچھی طرح وضو کیا اور پورے اہتمام سے کیا اس کے جسم سے اس کے تمام گناہ نکل جاتے ہیں حتی کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں۔''

نیز آپؐ کا ارشاد ہے:

انتم الغرا دمالمحجلون من اسباغ الوضو (متفق عليه)

''تم لوگ بھرپور وضو کی وجہ سے قیامت کے دن روشن چہروں اور تابندہ ہاتھ پاؤں والے ہوگے۔''

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو وہ اعمال نہ بتاؤں جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرما دیتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے، صحابۂ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ

ضرور! آپ نے فرمایا:

اسباغ الوضو علی المکارہ و کثرۃ الخطا الی المساجد و انتظار الصلٰوۃ بعد الصلوۃ فذلکم الرباط فذلکم الرباط (مسلم)

''۱-تکلیف اور ناگواری کے باوجود کامل وضو کرنا

۲-مسجد کی طرف جاتے ہوئے قدموں کا زیادہ اٹھانا

۳-اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا منتظر رہنا۔ پس یہی تمہارا حقیقی رباط[1] ہے۔ یہی تمہارا حقیقی رباط ہے۔''

یہی طہارت ہر مسلمان مرد و عورت سے مطلوب ہے اور طہارت کے سلسلے میں اسلام جو تقاضا مرد سے کرتا ہے وہی عورت سے بھی کرتا ہے۔

حضرت ام سلیمؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

یا رسول اللہ! ان اللہ لا یستحی من الحق فھل علی المرأۃ من غسل اذا احتلمت؟

''اللہ تعالیٰ سچ بات میں کوئی باک محسوس نہیں فرماتا، اگر عورت کو احتلام ہو تو کیا اس پر بھی غسل واجب ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا:

نعم اذا رأت الماء

''ہاں اگر اسے انزال ہو اور منی دیکھے تو اس پر بھی غسل واجب ہے۔''

یہ سن کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

یا رسول اللہ و تحتلم المرأۃ؟

''یا رسول اللہ کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) رباط اسلامی ریاست کی سرحدی چھاؤنی کو کہتے ہیں، جو دشمن کے حملوں سے ہر قلمرو کی حفاظت کرتی ہے۔

تربت يداك. فبم يشبهها ولدها؟

”تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں، اگر عورت کو احتلام نہیں ہوتا تو بچہ عورت سے مشابہ کیوں کر ہوتا ہے؟“ (صحیح مسلم کتاب الطہارۃ)

یہ وہ انداز ہے، جس سے اسلام نے طہارت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چند امور ایسے ہیں، جن کی بنا پر اس نے غسل فرض کیا ہے مثلاً جنابت اور حیض و نفاس۔ اس کے علاوہ نماز کے لیے وضو فرض کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے طہارت اور پاکیزگی کو جو اہمیت دی ہے اس کی مثال ہمیں دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی بلکہ وہ تو پاکیزگی کے بارے میں وہ باتیں جانتے ہی نہیں، جو اسلام نے سکھائی ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ پیرس میں ورسائی کا تاریخی محل جس میں کمروں کی تعداد سینکڑوں تھی مگر اس میں ایک بھی غسل خانہ نہ تھا۔ غیر مسلم لوگ طہارت کے وہ آداب بھی نہیں جانتے جن سے مسلمان واقف ہیں۔ بالخصوص نماز کے لیے وضو کرنا ایک ایسی خوبی ہے، جو صرف مسلمانوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ دوسری قومیں تو جنابت سے پاک ہونا بھی نہیں جانتیں اور کیفیت یہ ہے کہ طہارت کا اہتمام نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے جسموں سے بدبو کے بھبکے اٹھتے ہیں اور وہ لوگ اس بدبو کو دبانے اور چھپانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اس کے لیے طرح طرح کی خوشبوئیں اور مرکبات تیار کیے گئے ہیں، چناں چہ مغربی عورت اپنی بدبو کو چھپانے کے لیے اپنے جسم پر عطریات کا لیپ کرتی ہے لیکن ایک مسلمان عورت اللہ اور رسول کے احکام کی پیروی کر کے اس قسم کے تکلّفات سے بے نیاز ہے بلکہ اسے ایسی باتوں سے منع کیا گیا ہے چناں چہ نسائی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اذا خرجت المرأة الى المسجد فلتغتسل من الطيب كما تغتسل من الجنابة.

”کوئی عورت اگر خوشبو لگا کر مسجد جانے کے لیے گھر سے نکلے تو اسے اسی طرح غسل کرنا چاہیے، جیسے غسل جنابت کیا جاتا ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے مسائل طہارت کو بے حد اہمیت دی ہے اور کتب فقہ میں پہلا باب ہی "کتاب الطهارة" باندھا ہے اور کتاب الطهارة میں بڑا حصہ عورتوں کے مسائل پر مشتمل ہے۔ چناں چہ ہم اپنے اس رسالے میں صرف انہی احکام سے بحث کریں گے، جن کا تعلق عورتوں کے مسائل طہارت سے ہے۔ طہارت کے دوسرے مسائل و احکام جو مردوں اور عورتوں کے لیے مشترک ہیں ان کے لیے کتب فقہ کا مطالعہ کیا جائے۔

☙ ❧

شیر خوار بچے اور بچی کے پیشاب کا بیان

۱- ام قیس بنت محصنؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنا ایک بچہ (جس نے ابھی غذا کھانی شروع نہیں کی تھی) لے کر حاضر ہوئی۔ اس بچے نے نبی کریم ﷺ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا، تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور کپڑے پر چھڑک دیا اور اسے دھویا نہیں۔ یہ روایت صحاح ستہ میں ہے اور مسلم کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: فَدَعَا بِمَاءٍ فَرَشَّہ (آپ نے پانی طلب کیا اور اسے اس کپڑے پر چھڑک دیا)۔

۲- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

بول الغلام الرضیع ینضح و بول الجاریة یغسل (احمد، ترمذی)

''دودھ پیتا بچہ اگر لڑکا ہو اور وہ کپڑے پر پیشاب کر دے تو اس پر پانی چھڑک دیا جائے اور اگر وہ لڑکی ہو تو اس کا پیشاب دھویا جائے۔''

قتادہؓ کہتے ہیں کہ یہ حکم ان بچوں کے پیشاب کا ہے، جنہوں نے ٹھوس غذا کھانی شروع نہ کی ہو لیکن جب وہ غذا کھانا شروع کر دیں تو پھر لڑکا ہو یا لڑکی دونوں کے پیشاب کو دھونا ضروری ہے۔ (احمد ترمذی)

۳- نیز ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بچہ لایا گیا تا کہ آپ اسے گھٹی دیں، اس بچے نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا تو آپؐ نے اس پر پانی چھڑک دیا۔

اس حدیث کو امام بخاری، امام احمد بن حنبل اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ میں اتنا مزید ہے ولم یغلسہ (اور آپ ﷺ نے اسے دھویا نہیں)

۴- اور صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بچوں کو لایا جاتا تھا، آپ ﷺ ان کے لیے برکت کی دعا فرمایا کرتے اور گھٹی دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بچہ لایا گیا اور اس نے آپؐ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور پیشاب پر چھڑک دیا اور دھویا نہیں۔

۵- نبی کریم ﷺ کے خادم حضرت ابو السمح رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:

"(چھوٹی) لڑکی کا پیشاب دھویا جائے اور چھوٹے لڑکے کے لے پیشاب پر پانی چھڑک دیا جائے۔ اس روایت کو ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔"

۶- ام کرز رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بچہ لایا گیا، اس نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا تو آپ نے حکم دیا اور جہاں جہاں اس نے پیشاب کیا تھا اس پر پانی چھڑک دیا گیا۔ پھر ایک بچی لائی گئی، اس نے بھی پیشاب کر دیا، اس دفعہ آپ نے اس کپڑے کو دھونے کا حکم دیا، جس پر اس بچی نے پیشاب کیا تھا۔

یہ روایت امام احمدؒ نے بیان کی ہے۔

۷- ام کرز رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جائے اور لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے۔"

یہ روایت ابن ماجہ میں ہے۔

۸- ام الفضل لبابہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے نبی کریم ﷺ کی گود میں پیشاب کر دیا تو میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ کپڑا مجھے دیجیے تاکہ میں اسے دھو ڈالوں اور آپ دوسرا کپڑا پہن لیجیے، تو آپ نے فرمایا:

انما ینضح من بول الذکر و یغسل بول الانثی

''اگر لڑکا پیشاب کردے تو صرف پانی چھڑکنا کافی ہے اور لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے۔''

یہ حدیث امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔

پیشاب نجس ہے

لغوی اعتبار سے نجاست کا اطلاق ہر گندی اور ناپاک چیز پر ہوتا ہے، چناں چہ آدمی کا فضلہ یعنی پیشاب اور پاخانہ بھی نجس ہے خواہ آدمی بچہ ہو، جو ابھی ٹھوس غذا نہ کھاتا ہو۔ اسی طرح آدمی کی منی وغیرہ یعنی ''مذی''[۱] اور ''ودی''[۲] اور ''ھادی''[۳] سب نجس ہیں۔

نمازی کا جسم، کپڑے اور نماز پڑھنے کی جگہ ہر قسم کی نجاست سے پاک ہونا ضروری ہے، سوائے ایسی نجاستوں کے جو اس بنا پر معاف کردی گئی ہیں کہ یا تو ان کا زائل کرنا بہت مشکل ہے یا اس بنا پر کہ ان سے بچنا مشکل اور باعث دقت ہے۔

یعنی اس نجاست کو دور کرنے یا اس سے بچنے میں ناقابل برداشت تکلیف ہو کیوں کہ دین میں اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں رکھی جو ناقابل برداشت ہو۔

اس سے پہلے ان احادیث کا تذکرہ کیا جاچکا ہے، جن میں نبی کریم ﷺ نے چھوٹے بچے اور چھوٹی بچی کے پیشاب کا حکم بیان فرمایا ہے اب یہاں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

حدیث میں جو لفظ نضح وارد ہوا ہے اس کے معنی میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے:

۱۔ شیخ ابو محمد جوینی، قاضی حسین اور امام بغوی کا خیال ہے کہ نضح سے مراد یہ ہے کہ جس چیز پر پیشاب کیا گیا ہو اس پر زیادہ مقدار میں پانی ڈالا جائے جیسے تمام نجاستوں کی

---

(۱) مذی: ایک لیس دار رطوبت ہے، جو بوقت شہوت مرد کی شرم گاہ سے خارج ہوتی ہے۔

(۲) ودی: یہ سفید رطوبت پیشاب کے بعد کبھی کبھی خارج ہوتی ہے۔

(۳) ھادی: یہ سفید رنگ کا پانی ہے، جو بچے کی ولادت سے پہلے عورت کے جسم خاص سے خارج ہوتا ہے

صورت میں کیا جاتا ہے لیکن یہ پانی اتنا ہو کہ اگر نچوڑا جائے تو نہ نچڑے۔

۲- اور بعض دیگر علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ نچوڑنا ضروری ہے لیکن یہ درست نہیں اس لیے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نچوڑنا شرط نہیں ہے۔

۳- امام الحرمین یعنی امام جوینی اور دیگر محققین کا مسلک یہ ہے کہ نضح سے مراد اس پر صرف پانی بہانا ہے محض اس قدر پانی جو نہ تو کپڑے سے بہے نہ اس کے اوپر گردش کرے اور نہ ٹپکے۔ لیکن لڑکے کے پیشاب کے علاوہ دیگر صورتوں میں پانی زیادہ ڈالنے کا مفہوم اس سے مختلف ہے اور ان میں یہ شرط ہے کہ پانی اس قدر ہو کہ کچھ پانی بہہ جائے اور مقام نجاست سے قطروں کی صورت میں ٹپک جائے اگرچہ اس میں بھی نچوڑنا شرط نہیں۔ اور یہی مسلک درست ہے اور اسی پر عمل ہے اور حضرت ام قیسؓ کا قول "فنضحه ولم يغسله" (کہ اس پر پانی چھڑک دیا اور دھویا نہیں) اسی پر دلالت کرتا ہے اور دوسری روایت میں ان کے الفاظ: فرشّه (یعنی اس پر پانی کے چھینٹے مارے) سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم [1]

گویا نضح کے معنی ہیں: پانی سے تر کرنا اور جہاں جہاں پیشاب کا اثر ہو اس پر پانی چھڑکنا کہ وہ تر ہو جائے لیکن نہ ملا جائے اور نہ نچوڑا جائے۔

بچے کے پیشاب کے سلسلے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

۱- لڑکے کا پیشاب ہو تو اس میں نضح کافی ہے لیکن لڑکی کے پیشاب میں نضح کافی نہیں بلکہ اس کا دھونا ضروری ہے، جیسے تمام نجاستوں کو دھویا جاتا ہے۔ یہی قول مشہور ہے اور سب نے اسی کو اختیار کیا ہے اور حضرت علیؓ اور حضرات عطاء، زہری، احمد بن حنبل، اسحٰق اور ابن وہب وغیرہ کا قول بھی یہی ہے اور امام مالکؒ سے بھی یہی مروی ہے لیکن امام مالکؒ کے اصحاب کہتے ہیں کہ یہ روایت شاذ[2] ہے۔

---

(۱) اقتباس از شرح النوویؒ علی صحیح مسلم

(۲) روایت شاذہ اس روایت کو کہتے ہیں، جس میں کوئی ثقہ راوی اپنی روایت کے ذریعے اپنے سے قوی تر راوی کی مخالفت کرے۔ (مترجم)

اور ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، سفیان ثوریؒ، اوزاعیؒ، ابراہیم نخعیؒ، داؤد ظاہریؒ اور ابن وہب بھی اسی کے قائل ہیں۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں کے پیشاب میں نضح یعنی پانی چھڑکنا کافی ہے۔ یہ امام اوزاعیؒ کا مسلک ہے اور امام مالک اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی بیان کیا گیا ہے۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ اس سلسلے میں لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں اور دونوں کے پیشاب کا دھونا واجب ہے۔ اس قول کے کہنے والوں میں مشہور روایت کے مطابق امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نیز اہل کوفہ شامل ہیں۔

لیکن یہ آخری دونوں آراء شاذ ہیں اور اس سلسلے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ دونوں اقوال رد ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی اس اختلاف میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ اس سلسلے میں جو احادیث بیان ہو چکی ہیں ان سے بہ صراحت یہ ثابت ہوتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے پیشاب کے حکم میں فرق ہے۔

خیال رہے کہ یہ اختلاف محض اس بات میں ہے کہ اس چیز کو جس پر بچہ پیشاب کر دے پاک کیسے کیا جائے ورنہ پیشاب کے نجس ہونے کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

بچہ جب تک غذا نہ کھانے لگے

حضرت ام قیسؓ کی مذکورہ بالا حدیث میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے ایک چھوٹے بچے کو لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس بچے نے ابھی غذا کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ اس سے آخر کیا مراد ہے؟

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

> ”پھر یہ پانی چھڑکنے کی اجازت صرف اس عمر تک کے بچے کے سلسلے میں ہے، جس نے ابھی ٹھوس غذا کھانا شروع نہ کیا ہو۔ لیکن جب بچہ غذا کھانے لگے تو اس کے پیشاب کا دھونا واجب ہے اور اس کی نجاست دھوئے بغیر

زائل نہیں ہوگی اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔''

لیکن ولادت کے فوراً بعد بچے کو جو کھجور وغیرہ کی گھٹی دی جاتی ہے اس کا یہ اثر نہیں پڑتا کہ لڑکے کے پیشاب کو دھویا جائے اور پانی کا چھڑکنا کافی نہ ہو۔ "نکت التنبیه" میں ہے کہ لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنا کافی ہے اگر وہ دودھ اور گھٹی میں جو چیزیں دی جاتی ہیں، ان کے علاوہ اور کچھ نہ کھاتا ہو۔''

شیخ جلال الدین محلّی نے ''منہاج الطالبین'' کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ بچے کی گھٹی یا جو سفوف وغیرہ علاج کی غرض سے دیا جاتا ہے اس سے پیشاب پر پانی چھڑکنے کے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی اس کے باوجود لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنا کافی ہے اور دھونا ضروری نہیں۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ بچے کو جو شہد وغیرہ بطور دوا دیا جاتا ہے اسے کھانا نہیں کہا جاسکتا اور اس کی وجہ سے نضح کے حکم میں رکاوٹ نہیں پڑتی۔

الموفق الحمدیؒ نے ''شرح تنبیہ'' میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس بچے نے ابھی مستقل طور پر اپنے منہ سے غذا کھانا شروع نہ کیا ہو (یعنی دودھ نہ چھوڑا ہو) اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک دودھ چھوڑ کر مستقل طور پر غذا کھانا نہ شروع کردے اور اس کی خوراک کا اکثر حصہ ٹھوس اجزاء پر مشتمل نہ ہو اس وقت تک اس کے پیشاب کا یہی حکم ہے۔

لڑکے کے سلسلے میں رخصت کا سبب

غالباً لڑکے کے پیشاب پر محض پانی ڈالنے کو کافی قرار دینے کی رخصت کا سبب یہ ہے کہ لوگ لڑکے کو گود میں لینے کے زیادہ مشتاق ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے کپڑوں پر پیشاب کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اور ہر دفعہ کپڑا دھونے میں دشواری پیش آتی ہے لہٰذا اس سلسلے میں شریعت نے اپنے حکم میں تخفیف کردی۔

یا- دوسرا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لڑکے کا پیشاب ادھر ادھر بکھر کر پھیلتا ہے جب کہ لڑکی کا پیشاب ایک ہی جگہ گرتا ہے۔

نیز یہ کہ لڑکے کا پیشاب لڑکی کے پیشاب کے مقابلہ میں پتلا اور رقیق ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ لڑکے عکا پیشاب جہاں گرتا ہے لڑکی کے پیشاب کی مانند چپکتا نہیں اور یہ بھی ہے کہ لڑکی کا پیشاب لڑکے کے پیشاب کے مقابلہ میں زیادہ گندہ اور بدبودار ہوتا ہے۔[1]

دودھ پلانے والی عورت کے لیے خاص حکم

فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ (جن میں فقہاء مالکی بھی شامل ہیں) کہ دودھ پلانے والی عورت کے کپڑوں اور بدن پر دودھ پیتے بچے کا جو پیشاب پاخانہ لگ جاتا ہے یہ ایسی نجاست ہے، جو معاف ہے، یہ بچہ اس کا اپنا ہو یا پرایا۔ بشرطے کہ وہ بچے کے پیشاب اور پاخانہ کرتے وقت اس سے بچنے کی پوری کوشش کرتی ہو، اگرچہ ان سب فقہاء کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ ایسی عورت کو چاہیے کہ اگر استطاعت ہو تو کپڑوں کا ایک جوڑا علیحدہ رکھے [2] اور یہی حکم اس خون کا ہے، جو قصاب کے کپڑوں پر لگ جاتا ہے اور ان چھینٹوں کا جو کپڑے پٹخنے یا ڈنڈے سے کوٹتے وقت اڑ کر دھونے والے کے کپڑوں پر پڑتی ہیں اور اس خون کا بھی یہی حکم ہے، جو زخمیوں کا علاج کرتے وقت طبیب کے کپڑوں پر لگ جاتا ہے لیکن ان سب لوگوں کے لیے مستحب یہی ہے کہ نماز کے لیے صاف کپڑوں کا اہتمام رکھیں۔

مذکورہ بالا حکم، شریعت کے اس قاعدہ کلیہ سے ماخوذ ہے کہ جب کسی حکم شرعی پر عمل کرنے میں ناقابل برداشت مشقت ہو تو اس میں آسانی پیدا کردی جائے کیوں کہ شریعت اسلامیہ کی بنیاد جن اصولوں پر ہے ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کسی ایسے حکم کا پابند نہیں بنایا جو ان کی قوت برداشت سے زائد ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یرید اللّٰہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر (البقرۃ:۱۸۵)

”اللہ تمہارے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے اور سختی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔“

---

(۱) اعلام الموقعین لابن قیم ۲/۸۸

(۲) الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص ۲۱، مطبع دار الشعب

نیز ارشاد ہے:

ما جعل علیکم فی الدین من حرج (الحج:۷۸)

''اور اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

بعثت بالحنیفیة السمحة (مسند احمد)

''میں ایک ایسا دین حنیف دے کر بھیجا گیا ہوں، جو نہایت آسان ہے۔''

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

''جب کسی معالے میں تنگی پیدا ہو جائے تو آسانی اور سہولت پیدا کردی جاتی ہے۔''

یہ رخصت دودھ پلانے والی عورت کے لیے ہے خواہ وہ اس بچے کی جسے دودھ پلا رہی ہے ماں ہو یا نہ ہو اور اس کا سبب یہ ہے کہ اسے شیر خوار بچے کو ہر وقت اٹھانا پڑتا ہے اور اس رخصت میں یہ قید بھی نہیں ہے کہ بچہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ دونوں کے سلسلے میں شریعت کی طرف سے یہ سہولت حاصل ہے۔

❀

نجاستِ خون اور اس کے دھونے کا طریقہ

۱۔حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم عورتوں کے کپڑوں پر حیض کا خون لگ جاتا ہے، ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

تحته ثم تقرضه بالماء ثم تنضحه ثم تصلى فيه (متفق عليه)

''پہلے اسے کھرچ دے، پھر پانی ڈال کر ملے پھر دھو ڈالے پھر اسی کپڑے میں نماز پڑھ سکتی ہے۔''

۲۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ خولہؓ بنت یسار نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس صرف ایک ہی لباس ہے اور اس میں اسی کو حیض کی حالت میں پہنتی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

فاذا تطهرت فاغسلى موضع الدم ثم صلى فيه.

''جب حیض آنا بند ہوجائے اور تم پاک ہوجاؤ تو کپڑے پر جہاں خون لگا ہو اس جگہ کو دھولو اور پھر اسی کپڑے میں نماز پڑھ لو۔''

اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! خون کا نشان نہیں جاتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

يكفيك الماء و لا يضر اثره

''پانی سے دھولینا تمہارے لیے کافی ہے اور خون کے نشان کا کوئی حرج نہیں۔''

۳۔ معاذؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے ام المومنینؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

دریافت کیا کہ حائضہ عورت کے کپڑوں پر اگر خون لگ جائے تو وہ کیا کرے؟ آپ نے فرمایا:

تغسله فان لم یذهب اثره فلتغیره بشیء من صفرة

"اسے دھوڈالے، لیکن اگر اس کا نشان نہ جائے تو اس پر کوئی زرد چیز مل کر اس کا رنگ بدل دے۔"

نیز حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

و لقد کنت احیض عند رسول الله ﷺ ثلاث حیض جمیعاً لا اغسل لی ثوباً (احمد و ابوداؤد)

"مجھے نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں حیض آیا کرتا تھا تو مسلسل تین تین حیضوں میں ایک ہی کپڑا استعمال کرتی تھیں اور اسے دھوتی نہ تھی۔"

مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نجاست کو پانی سے دھونا واجب ہے اور خون کے نجس ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے اور نجاست سے پاک کرنے کے سلسلے میں ایسی کوئی شرط نہیں ہے کہ دو مرتبہ دھویا جائے یا تین مرتبہ دھویا جائے بلکہ دھوکر صاف کرلینا کافی ہے خواہ ایک مرتبہ دھونے سے ہو یا زیادہ بار دھونے سے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ نجاست کو دور کرنے میں جو چیز واجب ہے وہ صاف کرنا ہے، اب اگر نجاست حکمی ہے یعنی ایسی نجاست جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی، مثلاً پیشاب وغیرہ تو اسے ایک مرتبہ دھونا واجب ہے اور زیادہ مرتبہ دھونا واجب تو نہیں لیکن مستحب یہ ہے کہ دو یا تین مرتبہ دھولیا جائے۔"

کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

اذا استیقظ احدکم من نومه فلا یغمس یده فی الاناء حتی یغسلها ثلاثاً. (مسلم)

"جب کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو جب تک اپنا ہاتھ دھو نہ لے اس کو پانی بھرے برتن میں نہ ڈالے۔"

لیکن اگر نجاست نظر آنے والی ہو، جیسے خون وغیرہ تو اس نظر آنے والے مواد کو صاف کرنا ضروری ہے اور مواد صاف ہونے کے بعد دو یا تین بار دھونا مستحب ہے۔ لیکن اگر نجاست کا نظر آنے والا مواد دھولیا جائے اور اس کا رنگ باقی رہ جائے تو کوئی حرج نہیں کیوں کہ طہارت مکمل ہوگئی۔ لیکن اگر نجاست کا ذائقہ باقی رہ گیا تو کپڑا بدستور نجس ہے جب تک یہ ذائقہ زائل نہ ہو لہٰذا اس کا دور کرنا ضروری ہے اور اگر بو باقی رہ گئی تو اس میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں، جن میں صحیح تر قول یہ ہے کہ کپڑا پاک ہو جاتا ہے (خواہ بو باقی ہو)۔

خون حیض ایسی نجاست ہے جس کی تھوڑی مقدار بھی معاف نہیں۔ خواہ کتنی ہی کم ہو اور کپڑوں اور لباس کا پاک ہونا نماز کے لیے شرط ہے۔

اور حدیث نمبر۲ میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے یکفیك الماء و لا یضرك اثرہ اس بات کی دلیل ہے کہ نجاست کو دھونے کے لیے پاک پانی کا ہونا ضروری ہے اور سرکہ وغیرہ قسم کے سیال سے نجاست دھو لینا کافی نہیں ہے کیوں کہ جس چیز سے دھونے کا حکم دیا گیا ہے وہ پانی ہے اور اس حدیث میں اس بات کی بھی صراحت موجود ہے کہ نجاست دھونے کے بعد اگر اس کا ایسا نشان باقی رہ جائے، جس کا دور کرنا مشکل ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن ایسی صورت میں اس نشان کے رنگ کو زعفران یا زرد رنگ کی کوئی اور چیز مل کر تبدیل کر دینا چاہیے تاکہ خون کا رنگ باقی نہ رہے کیوں کہ اس سے گھن آتی ہے اور ممکن ہے، جو شخص اس داغ کو دیکھے تو یہ خیال کرے کہ دھونے میں کوتاہی کی گئی ہے، جیسا کہ تیسری حدیث میں بیان ہوا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو یہ فرمایا کہ: لا اغسل ثوبا لی (کہ میں اپنا کوئی کپڑا دھویا نہیں کرتی تھی) تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ آپ احتیاط برتتی ہوں اور آپ کے کپڑوں پر ذرا بھی خون نہ لگتا ہو اور جو چیز اپنی اصل کے اعتبار سے پاک ہو وہ اس وقت تک پاک رہتی ہے جب تک اس پر نجاست نہ لگ جائے اور جب اس پر نجاست لگ جائے تو اس کا دھونا ضروری ہو جاتا ہے۔

☙ ❧

وضو

مرد کا عورت کو چھونا اور مصافحہ کرنا

بحالت وضو مرد کا عورت کو چھونا ایک ایسا مسئلہ ہے، جس میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، علماء احناف کا خیال یہ ہے کہ چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا جب تک یہ صورت نہ ہو کہ مرد و عورت کے برہنہ جسم بحالت شہوت بغیر دخول کے باہم ملیں۔

مالکیوں کے نزدیک وضو ٹوٹنے کے لیے چار شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱- چھونے والا بالغ ہو۔

۲- یہ چھونا حصولِ لذت کی غرض سے ہو یا بغیر ارادے کے لذت حاصل ہو۔

۳- جسم کے جس حصے کو چھوا جائے اس پر کپڑا وغیرہ نہ ہو یا اگر وہ کپڑے سے چھپا ہوا ہو تو یہ کپڑا بہت ہلکا ہو لہٰذا اگر وہ کپڑا جس سے جسم ڈھکا ہوا ہے موٹا اور دبیز ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ البتہ یہ لمس اگر اس انداز کا ہو کہ جسم کے کسی حصے کو پکڑ لیا جائے اور مقصد حصول لذت ہو یا لذت حاصل ہو جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

۴- جسے چھوا جائے وہ ایسی عورت ہو، جس کی طرف بالعموم شہوانی رغبت ہوتی ہے، چناں چہ ایسی چھوٹی بچی کو چھونے سے جس کی طرف شہوانی رغبت نہ ہوتی ہو، وضو نہیں ٹوٹے گا۔ مثلاً پانچ سالہ بچی اور ایسی بڑھیا کو چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹے گا، جس میں مرد کے لیے طبعاً شہوانی رغبت نہ ہو۔

ان شرائط کی موجودگی میں اگر کسی ایسی عورت کو چھوا جائے، جو (پیدائشی) محرم نہ ہو تو وضوٹوٹ جائے گا، خواہ یہ عورت بیوی ہو یا کوئی غیر، بشرطیکہ یہ لمس مذکورہ بالا صورت میں ہو۔

اور منہ کا بوسہ لینا بھی چھونے ہی کی ایک شکل ہے اور اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔ خواہ لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، یا لذت حاصل نہ ہو، یا بوسہ زبردستی لیا گیا ہو۔ لیکن اگر بوسہ پیار وشفقت کی بنا پر لیا گیا ہو یا سفر پر روانگی کے وقت الوداعی بوسہ لیا جائے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا یہ تو چھونے والے کے بارے میں مسئلے کی نوعیت تھی لیکن جس کو چھوا جائے اس کی نوعیت یہ ہے کہ اگر وہ بالغ ہے اور چھونے کی وجہ سے اس نے لذت محسوس کرلی ہے تو اس کا بھی وضوٹوٹ جائے گا اور اگر اس نے بھی حصولِ لذت کا قصد کیا ہے تو اس کا بھی وہی حکم ہے، جو خود چھونے والے کا ہے اور اس پر ان تمام احکام کا اطلاق ہوگا، جو چھونے والے مرد کے بارے میں پہلے بیان ہوچکے ہیں۔ البتہ چھوئے بغیر سوچنے یا دیکھنے سے وضونہیں ٹوٹتا خواہ حصول لذت کا قصد ہو یا لذت حاصل ہو۔ لیکن سوچنے یا دیکھنے سے اگر مذی خارج ہوئی تو وضوٹوٹ جائے گا اور اس کا سبب خروج مذی ہوگا اور اگر منی خارج ہوگئی تو غسل واجب ہوگا۔

شافعیوں کا مسلک

شافعیوں کے نزدیک کسی اجنبی عورت کو چھونے سے وضوٹوٹ جاتا ہے خواہ لذت کے بغیر ہو اور خواہ مرد بوڑھا اور عورت بدشکل بڑھیا ہو بشرطیکہ چھونے والے کے ہاتھ اور جسے چھوا گیا اس کے جسم کے درمیان کوئی چیز مثلاً کپڑا وغیرہ حائل نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی چیز درمیان میں حائل ہے تو پھر یہ چیز کتنی ہی باریک ہو وضونہیں ٹوٹے گا حتی کہ درمیان میں حائل ہونے والی یہ چیز میل کی جمی ہوئی تہہ یا غبار کی گرد ہو تب بھی وضونہیں ٹوٹے گا۔

شافعیوں نے چھونے کے سلسلے میں عورت کے بال، دانت اور ناخن کو مستثنیٰ کردیا

ہے یعنی ان کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا خواہ اس سے لذت بھی حاصل ہو اس لیے کہ یہ وہ اعضاء ہیں، جن کے چھونے سے بالعموم لذت حاصل نہیں کی جاتی۔

مردہ عورت کو چھونے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا لیکن میت اگر محرم ہو یعنی ایسی محرم جس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا، خواہ یہ حرمت نسب کی بنا پر ہو یا رضاعت کی بنا پر یا دامادی کی بنا پر۔ لیکن ایسی عورت جس سے نکاح کرنا ہمیشہ کے لیے حرام نہیں ہے، مثلاً بیوی کی بہن، بیوی کی پھوپھی اور بیوی کی خالہ تو ان میں سے کسی کو بھی مردہ حالت میں چھونے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔

حنبلیوں کا مسلک یہ ہے کہ عورت کو شہوت سے اس طرح چھوا جائے کہ درمیان میں کوئی چیز یعنی کپڑا وغیرہ حائل نہ ہو تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ عورت محرم ہو یا اجنبی، زندہ ہو یا مردہ، جوان ہو یا بوڑھی، بڑی ہو یا چھوٹی، لیکن ایسی ہو، جسے دیکھ کر بالعموم شہوت میں تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔

اور اس معاملہ میں عورت اور مرد کا حکم یکساں ہے یعنی اگر عورت بھی مذکورہ بالا شرائط کی موجودگی میں مرد کو چھوئے گی تو اس کا وضو بھی ٹوٹ جائے گا، نیز چھونے سے وضو صرف اسی صورت میں ٹوٹے گا جب جسم کا وہ حصہ جسے چھوا گیا ہے، بال، ناخن اور دانتوں کے علاوہ ہو لہٰذا اگر دانتوں، بال اور ناخنوں کو چھوا ہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

مالکیوں کے نزدیک جسے چھوا جائے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا خواہ وہ شہوت اور لذت بھی محسوس کرے۔

اوپر جتنی آراء بیان ہوئی ہیں ان میں سے ہر رائے کے لیے کوئی نہ کوئی سند اور دلیل موجود ہے اور ہر ایک مسلک میں صحابہ کرام ہی کی پیروی ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مرد کے لیے اجنبی عورت سے مصافحہ نہ کرنا اور اسے ہاتھ نہ لگانا ہی بہتر اور افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ نیکی کی توفیق عطا کرنے والا اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت دینے والا ہے۔

وضو کی حالت میں اپنی بیوی کو چھونا

اوپر جو کچھ بیان ہوا یہ تو اجنبی عورت کے بارے میں تھا۔ اب رہ گیا بیوی کا معاملہ جو کتاب و سنت کی رو سے مرد کے لیے حلال ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بحالت وضو بیوی کو چھونے کا حکم شرعاً کیا ہے؟ مثلاً اگر مرد اپنی بیوی سے مصافحہ کر لے یا اسے ہاتھ لگائے تو کیا مرد کا وضو ٹوٹ جائے گا؟

امام احمد بن حنبلؒ، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات میں سے بعض کا بوسہ لے لیا کرتے تھے اور پھر وضو کیے بغیر نماز کے لیے تشریف لے جاتے تھے، نیز حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ (رات کو نماز پڑھتے اور میں آپؐ) کے آگے سوئی ہوئی ہوتی تھی اور میرے دونوں پاؤں آپ کے قبلہ کی جانب ہوا کرتے اور جب آپ سجدے میں جاتے تو مجھے ٹھوکا دیتے اور میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی تھی۔ (متفق علیہ)

نیز اسحاق بن راہویہ اور بزازؒ نے اچھی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کا بوسہ لیا جب کہ آپ روزے سے تھے اور فرمایا: ''بوسے سے نہ تو وضو ٹوٹتا ہے اور نہ روزہ۔''

اور مسلم و ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت کیا ہے اور اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کو بستر میں نہ پایا تو میں آپ کی تلاش میں نکلی اور آپ کو مسجد میں پالیا اور میں نے اپنا ہاتھ آپ کے پاؤں کے تلوؤں پر رکھ دیا جب کہ آپ ﷺ سجدے میں پڑے تھے اور آپ کے دونوں پاؤں اٹھے ہوئے تھے اور آپ یہ دعا مانگ رہے تھے:

اللھم انی اعوذ برضاك من سخطك و اعوذ بمعافاتك من عقوبتك و اعوذ بك منك کا احصی ثناء علیك، انت کما

اثنیت علی نفسک.

''اے میرے معبود! میں پناہ طلب کرتا ہوں تیری رضا کی تیرے غصے سے اور پناہ طلب کرتا ہوں تیری بخشش کی تیری سزا سے اور پناہ طلب کرتا ہوں تیری ہی تیرے جلال سے، میں تیری ثناء کا احاطہ نہیں کرسکتا تو ویسا ہی ہے، جیسی تو نے خود اپنی ثناء کی۔''

اس کے بالمقابل مندرجہ ذیل اقوال بھی ہیں:

۱- ابن عمر رضی اللہ عنہما نے صراحتاً یہ بات بیان کی ہے کہ جس نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا یا اسے اپنے ہاتھ سے چھوا تو اس پر وضو لازم ہے۔ یہ روایت امام مالک اور امام شافعیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔

۲- بیہقیؒ نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

''بوسہ بھی لمس ہے اور اس پر وضو واجب ہے اور لمس جماع سے کم ہے۔''

ناخنوں کا لیپ

(نیل پالش)

اگر ناخنوں کو کسی ایسے رنگ سے رنگا جائے، جس کی ٹھوس تہہ نہ جمے (مثلاً مہندی یا وسمہ وغیرہ) تو اس سے وضو یا غسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اگر ایسا رنگ ہاتھ یا ناخنوں پر باقی ہو تب بھی نماز صحیح ہو جاتی ہے۔

لیکن ایسے رنگ، جن کی ٹھوس تہہ جم جاتی ہے مثلاً کیمیاوی ساخت کے نیل پالش جو آج کل بازاروں میں عام ملتے ہیں، جیسے میڈورا یا سوئس مس وغیرہ تو ایسے تمام لیپ اگر وضو یا غسل کرنے کے بعد لگائے جائیں تب تو نماز درست ہو جائے گی لیکن اگر وضو، یا غسل کرنے سے پہلے استعمال کیے گئے ہوں تو وضو یا غسل کرتے وقت طہارت کے لیے ان کا اتارنا ضروری ہے تاکہ پانی جلد اور ناخن تک پہنچ سکے۔

اس بات پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ ناخنوں پر جس لیپ کی موجودگی میں وضو یا غسل درست نہیں ہوتا وہ ایسا لیپ ہے، جو گاڑھا اور ٹھوس ہو اور بعض مصری علماء نے جو یہ فتویٰ دیا ہے کہ ناخنوں پر ٹھوس لیپ (نیل پالش) کی موجودگی میں غسل اور وضو درست ہو جاتا ہے یہ قطعاً غلط ہے، کوئی ایسا شرعی عذر موجود نہیں ہے، جس کو غسل یا وضو صحیح ہو جانے کے لیے وجہ جواز بنایا جا سکے۔ فاضل جلیل شیخ حسنین محمد مخلوف جو مصر میں دار الافتاء کے ناظم ہیں ان کی رائے بھی یہی ہے کہ نیل پالش کی موجودگی میں وضو اور غسل درست نہیں اور ڈاکٹر عبد الحلیم محمود

شیخ الازہر نے اپنے فتویٰ میں جو قاہرہ ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام ''القرآن الکریم'' میں نشر ہوا، اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

میری بہنوں بیٹیوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ فتاویٰ عالمگیری جلدی اول، ص ۳۵ پر جو یہ مسئلہ درج ہے کہ اگر کسی کا ناخن ٹوٹ جائے اور اس نے اس پر کسی دوا کا لیپ لگا رکھا ہو تو اگر وہ دوا یا لیپ اتارنا نقصان دہ ہو تو وہ اس پر مسح کرے اور اگر مسح کرنا بھی باعث ضرر ہو تو مسح بھی نہ کرے۔ اسی طرح اگر پاؤں کی انگلی میں زخم ہو اور اس انگلی پر پٹا باندھ رکھا ہو یا کوئی اور مرہم لگا رکھا ہو اور یہ مرہم زخم کے مقام سے آگے بڑھ کر صحیح حصہ جسم تک پہنچ گیا ہو ایسی صورت میں اگر وضو کرتے وقت اس پر مسح کر لے تو ایسا کرنا جائز ہے اور وضو درست ہو جائے گا بشرطے کہ مسح اس طرح کیا جائے کہ پوری پٹی پر مسح ہو جائے۔ ان تمام صورتوں میں جو مسح کو جائز قرار دیا گیا ہے اس کی وجہ ضرورت اور عذر ہے اور ظاہر ہے نیل پالش کی صورت میں ایسا کوئی عذر یا ضرورت موجود نہیں جو جواز وضو کا تقاضا کرتی ہو لہٰذا اس کو اتار کر وضو کرنا ضروری ہے ورنہ وضو یا غسل درست نہ ہوگا۔[۱]

میں یہاں اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے یہ کہنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ وہ نیل پالش استعمال کرنے کی عادت بد سے اپنے آپ کو بچائیں اور اس بات کو سمجھیں کہ یہ فیشن ہمارے ہاں مغرب کی لچر تہذیب کے نتیجے میں رائج ہوا ہے، جس کا مقصد ایسی بے راہ روی ہے، جو ہر اصول و ضابطہ سے آزاد ہونے کا تقاضا کرتی ہے اور اس کے پیش نظر عورت کی حفاظت و احترام کے وہ ضابطے اور طریقے نہیں ہیں، جو اسلامی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہیں۔

کیا ہماری بہنوں اور بیٹیوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ مغرب کی کافر و فاجر عورتوں کی اندھی تقلید کرنا چھوڑ دیں اور امہات المومنین، نبی کریم ﷺ کی بیٹیوں اور سلفِ صالحین کی مہاجر و انصار خواتین کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ نیل پالش اور لیپ جن سے ناخنوں کو رنگا جاتا ہے اپنے اندر ذرا

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے: مجلّہ الوعی الاسلامی، عدد ۴۸۔ شمارہ ۱۳، ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ

بھی حسن و جاذبیت اور زیب و زینت کا سامان نہیں رکھتے۔ پھر جو عورت یا لڑکی اپنے ناخنوں پر نیل پالش استعمال کرتی ہے اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس کے ناخن زیادہ سے زیادہ لمبے ہوں۔ وہ یہ بھول جاتی ہے کہ ناخنوں کو اس طرح بڑھانا انسان کی اس فطرت سلیمہ کے خلاف ہے جن کی طرف نبی کریم نے رہنمائی فرمائی ہے۔ آپ نے ناخن تراشنے کا حکم دیا ہے کیوں کہ لمبے ناخنوں میں جراثیم پرورش پاتے ہیں اور ان میں میل کچیل جمع ہو جاتا ہے، جس سے انسانی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔

لہٰذا مسلمان عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے رب سے ڈرے اور اپنے دین اور اس کے احکام کا خیال رکھے۔ ظاہر و باطن اور عقیدے و عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو مسلمان بنانے کا شوق پیدا کرے اور مغرب کی بیہودہ تہذیب سے بچنے اور دور رہنے کی کوشش کرے، اس لیے کہ اس تہذیب میں وہ خرابی موجود ہے، جو انسان کو گناہ کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

☆☆

مصنوعی بال

(وِگ)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

لعن الله الواصلة والمستوصلة (متفق عليه)

''اللہ کی لعنت اس عورت پر جو دوسری عورت کے بالوں میں مصنوعی بالوں کا جوڑ لگائے اور اس پر بھی جو ایسا جوڑ لگوائے۔''

ہمارے دور کے ایک عالم نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ: ''مصنوعی بالوں یعنی وِگ پر عورت کے لیے مسح کرنا جائز ہے۔

ہماری شدید خواہش ہے کہ کاش یہ مفتی صاحب جو اس قسم کے عجیب وغریب فتوے صادر کرنے میں مشہور ہیں، اپنی غلط رائے کی پیروی چھوڑ کر وِگ کے استعمال کے بارے میں شریعت حقہ کی طرف رجوع کریں۔

نصوصِ شرعیہ

۱- حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میری ایک بیٹی ہے، جس کے چیچک نکلی تھی اور اس کے بال جھڑ گئے تھے۔ اب وہ دلہن بن رہی ہے، تو کیا میں اس کے بالوں میں مصنوعی بال جوڑ

دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

لعن اللہ والواصلة والمستوصلة (متفق علیه)

''بالوں میں جوڑ لگانے اور لگوانے والیوں پر اللہ کی لعنت۔''

۲- حمید بن عبد الرحمٰن بن عوف بیان کرتے ہیں کہ میں نے جس سال حج کیا اسی سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے سنا: آپ نے بالوں کا ایک گچھہ ہاتھ میں لیا، جو آپ کے ایک محافظ کے پاس تھا اور فرمایا: اے اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس قسم کی چیزوں سے منع فرماتے سنا ہے، آپ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کی عورتوں نے (بناؤ سنوار کے لیے) اس قسم کی چیزیں اختیار کرلیں۔ (متفق علیہ)

۳- حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے موقوفاً یعنی نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کیے بغیر روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی لعنت ان عورتوں پر جو حسن کے لیے گودتی اور گدواتی ہیں، بال نوچتی اور نچواتی ہیں اور جو اپنے دانتوں کے درمیان جھری بنواتی ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدلتی ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اس قول کی اطلاع بنی اسد کی ام یعقوب نامی خاتون کو پہنچی تو وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ نے ایسی ایسی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے، حضرت عبد اللہ نے کہا: میں آخر ان پر کیوں نہ لعنت بھیجوں، جن پر نبی کریم ﷺ نے لعنت بھیجی ہے اور جن کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے۔ وہ عورت کہنے لگی، میں نے پورا قرآن پڑھا ہے مجھے تو ایسی کوئی بات نہیں ملی، آپ نے کہا: اگر تم نے واقعی قرآن پڑھا ہوتا تو تم کو ضرور وہ بات مل جاتی جو میں کہتا ہوں، کیا تم نے یہ آیت قرآن مجید میں نہیں پڑھی:

مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:۷)

''جو کچھ رسول تمہیں دیں وہ لے لو اور جس سے منع کردیں اس سے رک جاؤ۔''

وہ خاتون کہنے لگی: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ پھر وہ کہنے لگی: میں نے ابھی آپ کی بیوی کو دیکھا ہے وہ ایسا کرتی ہیں۔ آپ نے کہا: جاؤ جا کر دیکھو (ایسا نہیں ہے) چناں چہ وہ گئی اور اسے وہاں ایسی کوئی بات نہ ملی تو واپس آ کر کہنے لگی مجھے کچھ نہیں ملا۔ حضرت عبد اللہؓ نے کہا: اگر ایسا ہوتا جیسا کہ کہتی ہو تو میں اس کے ساتھ نہ رہتا۔ (بخاری و مسلم)

۴- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت بھیجی ہے، جو بالوں میں جوڑ لگاتی اور لگواتی ہیں اور ان عورتوں پر بھی لعنت بھیجی ہے، جو گودتی اور گدواتی ہیں۔ (بخاری و مسلم)

۵- ایک روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ نے ایک دن کہا: تم نے برے حلیے بنانے کا نیا طریقہ اختیار کرلیا ہے حالاں کہ نبی کریم ﷺ نے ''زور'' (دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے خاص قسم کا حلیہ بنانے) سے منع فرمایا ہے۔

قتادہؒ کہتے ہیں: حضرت معاویہؓ کی مراد ''زور'' سے وہ طریقہ ہے، جو عورتیں اختیار کرتی ہیں کہ اپنے بال زیادہ دکھانے کی غرض سے ان میں کچھ مصنوعی چیزیں شامل کرلیتی ہیں۔

حضرت قتادہؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص ایک لاٹھی لایا، جس کے سرے پر کچھ دھجیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر حضرت معاویہؓ نے کہا: یہی زور ہے۔'' (بخاری و مسلم)

مندرجہ بالا نصوص کی بنا پر جمہور علماء کا فتویٰ یہی ہے کہ عورت کا اپنے بالوں میں مصنوعی بالوں کا اضافہ کرنا حرام ہے اور یہی حکم وگ وغیرہ کے استعمال کا ہے۔

فقہاء کا مسلک

اس مسئلہ میں کہ عورت کے لیے اپنے بالوں میں مصنوعی بال جوڑنا جائز ہے یا نہیں نیز ممانعت میں سختی اور نرمی کے اعتبار سے فقہاء کے مابین اختلاف ہے جس کا خلاصہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

۱- احناف کی رائے یہ ہے کہ عورت کے لیے اپنے بالوں میں انسانی بال جوڑنا قطعاً حرام ہے، خواہ یہ بال اس کے اپنے ہوں یا اس کے شوہر یا کسی محرم کے یا کسی دوسری عورت کے یا ان کے علاوہ کسی اور طرح کے انسانی بال ہوں۔

لیکن بالوں کے ساتھ غیر انسانی بالوں کا جوڑنا مثلاً اون یا پشم یا بکری کے بال ملانا یا دھجیاں وغیرہ بٹ کر اس کا جوڑ لگانا، سو یہ جائز ہے کیوں کہ اس میں نہ تو دھوکہ ہے اور نہ انسانی اجزاء کا استعمال کیا جا رہا ہے اور یہی دونوں باتیں حنفیوں کے نزدیک اس فعل کے حرام ہونے کا سبب ہیں۔ (رسائل ابن عابدین (شامی)۔ ج۶، ص۳۷۲، ۳۷۳)۔

۲- مالکیوں کے نزدیک بالوں میں کسی قسم کے بال جوڑنا ناجائز ہے، خواہ وہ آدمی کے ہوں یا اون اور پشم یا کسی اور قسم کے بال۔ امام نوویؒ نے جو کہ شوافع کے چوٹی کے اماموں میں سے ہیں اسی رائے کی تائید کی ہے اور اپنی کتاب ''المجموع'' میں لکھا ہے:

> ''جن لوگوں نے مصنوعی بالوں کے استعمال کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے، ان کی رائے سب سے زیادہ قوی ہے اس لیے کہ احادیث صحیحہ سے بظاہر جو بات ثابت ہوتی ہے یہی ہے۔'' (المجموع: ج۳، ص۱۴۷)

۳- شافعیوں کا مسلک یہ ہے کہ انسانی بالوں کا جوڑ لگانا تو مطلقاً حرام ہے یعنی جو حنفیوں کا مسلک ہے البتہ غیر انسانی بالوں سے جوڑا بنانا مثلاً اون یا پشم وغیرہ سے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

الف: اگر وہ چیز جس کا جوڑ لگایا گیا ہے ناپاک ہے تب تو جوڑا بنانا حرام ہے کیوں کہ نجس چیز کا استعمال نماز میں اور نماز کے علاوہ بھی حرام ہے۔

ب: لیکن اگر وہ چیز جس سے ملا کر جوڑا بنایا گیا ہے پاک ہے تو اب دیکھا جائے گا کہ جس نے یہ جوڑا استعمال کیا ہے وہ اگر ایسی عورت ہے، جس کا خاوند نہیں ہے تو اس کے لیے جوڑے کا استعمال حرام ہے اور اگر خاوند والی ہے تو اس میں تین قول ہیں:

۱- ایک قول یہ ہے کہ بالوں میں جوڑ لگانا یا مصنوعی بالوں کا جوڑا استعمال کرنا صرف اس صورت میں جائز ہے جب خاوند اجازت دے۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ بالوں میں جوڑا لگانا یا مصنوعی بالوں کا جوڑا استعمال کرنا مطلقاً جائز ہے اور خاوند کی اجازت ضروری نہیں ہے۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ خواہ خاوند اجازت دے تب بھی جوڑے کا استعمال حرام ہے۔

امام نوویؒ نے المجموع میں لکھا ہے کہ شافعیوں کے نزدیک پہلا قول سب سے زیادہ صحیح ہے۔ (المجموع ج۳، ص۱۴۷)

۴- حنبلیوں کے نزدیک بھی انسانی بالوں کا جوڑ لگانا یا جوڑا استعمال کرنا حرام ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنا ایک قسم کی دھوکہ دہی ہے لیکن ان کے نزدیک غیر انسانی بال مثلاً اون یا پشم وغیرہ کا جوڑ لگانا یا جوڑا استعمال کرنا بھی حرام ہے البتہ بالوں کے علاوہ کوئی اور چیز مثلاً کپڑے کی دھجی وغیرہ جوڑنا، جس سے بال باندھے جاتے ہیں تو اس کے سلسلے میں یہ حکم ہے کہ اگر یہ دھجی فقط اس قدر ہے، جس سے سر پر بال باندھے جاتے ہیں تب تو کوئی حرج نہیں کیوں کہ اس کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن اگر اس مقدار سے زائد ہے تو اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں، جن میں سے ایک روایت کے مطابق مکروہ ہے۔ (المغنی: ج۱، ص۹۹)

خلاصۂ بحث

اوپر جو کچھ بیان ہوا اس سے ایک بات واضح ہوگئی کہ اس بات میں فقہاء کے چاروں مذاہب متفق ہیں کہ عورت کے لیے انسانی بالوں کا جوڑ لگانا یا جوڑا استعمال کرنا حرام ہے خواہ یہ بال جو استعمال کیے گئے ہیں کسی محرم کے ہوں یا خاوند کے یا کسی اجنبی شخص کے ہوں یا کسی دوسری عورت کے یا خود اپنے ہوں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ:

۱- مختلف قسم کے وگ جو انسانی بالوں سے بنائے جاتے ہیں ان کا استعمال بالکل حرام ہے۔

۲- ایسے بالوں کی آمیزش جو قدرتی بالوں سے مشابہ ہوں اور جن کی وجہ سے دیکھنے والا دھوکہ کھا جائے اور پہلی نظر میں ان کو عورت کے اصلی بال ہی خیال کرے، جیسا کہ آج کل مروجہ لوگوں کی کیفیت ہے جو نائیلون وغیرہ سے بنائی جاتی ہیں اور جن کو عورتیں استعمال کرتی ہیں، ان کا استعمال بھی حرام ہے اور یہ حرمت قیاسی ہے یعنی چوں کہ قدرتی بالوں کا جوڑ لگانا اس لیے منع ہے کہ اس میں دھوکہ دہی ہے تو یہی علت ان مصنوعی بالوں میں بھی پائی جاتی ہے اور اس علت کی دلیل موجود ہے، جس کا ذکر حضرت معاویہؓ کی اس حدیث میں ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے، نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں بھی جو پہلے بیان ہو چکی ہے، جس علت کا ذکر ہے یعنی اللہ کی تخلیق کو بدلنا وہ بھی اس میں پائی جاتی ہے اور یہ دونوں علّتیں ایسی ہیں، جن کی بنا پر کسی فعل کے حرام ہونے پر فقہاء کا اتفاق ہے۔

۳- بالوں میں ایسی آمیزش جو قدرتی بالوں سے مشابہ نہ ہو اور دیکھنے والے کو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جائے کہ یہ قدرتی بال نہیں ہیں اور نہ عورت کے اپنے بال ہیں بلکہ اس کے بالوں سے یکسر مختلف ہیں مثلاً اون یا دھاگہ وغیرہ تو ایسی اشیاء کا استعمال مباح ہے کیوں کہ اس صورت میں وہ علت جو پہلے بیان ہو چکی ہے یعنی دھوکہ دہی موجود نہیں لیکن اس سے بھی بچنا بہتر ہے کیوں کہ وہ تمام نصوص شرعیہ یعنی احادیث جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں عام ہیں اور ان کا اطلاق سب صورتوں پر ہوتا ہے نیز اس روایت سے ہی جو ابو الزبیرؒ نے حضرت جابرؓ کے حوالے سے بیان کی ہے، یہی ثابت ہوتا ہے۔ ابو الزبیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ سے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ عورت اپنے سر کے بالوں

میں کسی چیز کا جوڑ لگائے۔ (مسلم)

اب تک جو کچھ بیان ہوا یہ مالکیوں اور حنبلیوں کا نقطۂ نظر تھا لیکن ہم اس کو حرام نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ حرمت کا وہ سبب جو نصوص میں بیان ہوا ہے یعنی دھوکہ دہی وہ یہاں پوری طرح نہیں پایا جاتا اور ان احادیث کو جو پہلے بیان ہوئی ہیں، جن سے مطلق ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ بالخصوص حضرت جابرؓ والی حدیث کو ان احادیث کی بنا پر جن میں حرمت کی اصل علت یعنی دھوکہ دہی کا ذکر ہے، اسی علت کے ساتھ مقید کیا جائے گا کیوں کہ قاعدہ یہی ہے کہ نصوص مطلقہ کو ان نصوص کی روشنی میں جن میں کوئی علت بیان کی گئی ہو، مقید کر دیا جاتا ہے۔

۴۔ عورتوں کا ایسے رنگ دار دھاگوں سے مینڈھیاں گوندھنا جن سے صاف ظاہر ہوتا ہو کہ یہ عورت کے اپنے بال نہیں ہیں، بالکل جائز ہے کیوں کہ یہ تو بالوں میں جوڑ لگانے کی حرمت کے دائرے میں بھی نہیں آتا لیکن اس میں بھی مناسب یہی ہے کہ بقدر ضرورت ہو اور بالوں کو سمیٹنے اور باندھنے کے لیے جس قدر ضروری ہو اسی قدر استعمال کیا جائے۔ یہ حنبلی نقطۂ نگاہ ہے۔

مغالطہ دینا، فطری ساخت بدلنا اور چہرے کو رنگنا

اوپر جو کچھ بیان ہوا یہ تو وِگ اور بالوں کے بارے میں تھا، موقع کی مناسبت سے یہاں یہ تنبیہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ہم نے جو احادیث صحیحہ پیش کی ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے لیے ایسی تمام زیب و زینت حرام یا مکروہ ہے جس سے اس کی اصلی شکل و صورت جس پر اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے بدل جائے اور دیکھنے والا اس دھوکے میں مبتلا ہو جائے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے یہی اس عورت کی قدرتی شکل وصورت ہے، مثلاً چہرے (بھوؤں اور پلکوں) کے زائد بالوں کو نوچنا یا چہرے کو طرح طرح کے رنگوں سے اس طرح رنگنا کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ سرخی اصلی ہے اور اس عورت کا یہی رنگ و روپ قدرتی ہے۔

شافعی علماء نے اس موضوع پر واضح بات کہی ہے، جسے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے "المجموع" میں بیان کیا ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں:

"التھذیب کے مصنف نے لکھا ہے کہ چہرے کو سرخ رنگنا اور بالوں میں سیاہ خضاب لگانا اور انگلیوں کے طرح طرح کے فیشن بنانا خاوند کی اجازت کے بغیر حرام ہے اور خاوند کی اجازت کی صورت میں دو قول ہیں، جن میں صحیح یہی ہے کہ پھر بھی حرام ہے۔ باقی زیب و زینت کی ایسی تمام صورتیں جن میں دھوکہ، فریب نہ ہو عورت کے لیے جائز ہیں اگرچہ وہ خاوند والی نہ ہو بشرطیکہ اجنبی مردوں کو دکھانے کے لیے بناؤ سنگھار نہ کرے لیکن پھر بھی اسی عورت کے لیے افضل یہی ہے کہ زیادہ بناؤ سنگھار نہ کرے۔

اور اگر عورت کا خاوند موجود ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ بیوی بناؤ سنگھار کرے تو عورت کے لیے بناؤ سنگھار کرنا واجب ہے کیوں کہ عورت کو زیب و زینت سے آراستہ دیکھنا خاوند کا حق ہے اور اگر خاوند زیب و زینت سے منع کرے تو عورت کے لیے بناؤ سنگھار کرنا حرام ہے کیوں کہ اس صورت میں خاوند کی نافرمانی ہوگی اور اگر خاوند اس بارے میں خاموش رہے۔ نہ اس سے بناؤ سنگھار کا مطالبہ کرے اور نہ منع کرے تو عورت کے لیے بناؤ سنگھار کرنا اسی طرح مباح ہے، جس طرح اس عورت کے لیے مباح ہے جس کا خاوند نہ ہو۔"

ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ بالوں میں بال جوڑنا یا مصنوعی بالوں کا جوڑا استعمال کرنا زینت اور سنگھار کی وہ قسم ہے، جو حرام اور کبیرہ گناہ ہے اور ایسا فعل ہے، جس کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس کے نقصان کو سمجھنے کے لیے وہ بات کافی ہے جو حضرت معاویہؓ کی حدیث میں بیان ہوئی کہ "بنی اسرائیل محض اس بنا پر ہلاک ہوئے کہ ان کی عورتوں نے اس قسم کی مصنوعی بالوں کا استعمال شروع کر دیا تھا" اور جس طرح حضرت معاویہؓ نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ "میرا خیال ہے کہ ایسا کام ہے جسے یہودیوں کے سوا کوئی نہیں کرتا" لہٰذا اہل بصیرت کو ان باتوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

مصنوعی بالوں (وِگ) پر مسح کا حکم

اور جب مصنوعی بالوں کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا حکم وہی ہے، جو اوپر بیان ہوا۔ یعنی جب مصنوعی بالوں کا استعمال ہی یکسر ناجائز ہے تو پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ مصنوعی بالوں یعنی وِگ پر مسح کرلیا جائے تو سر پر مسح کرنے کی ضرورت نہیں رہتی؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ
(المائدة:٦)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو، سروں پر ہاتھ پھیرلو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو۔''

اس ارشاد ربانی کی رو سے وضو کے فرائض وارکان چار ہیں:

۱- منہ دھونا

۲- دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھونا

۳- سر کا مسح کرنا

۴- اور دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھونا

چناں چہ سر کا مسح فرض اور وضو کا رکن ہے اور اس کے بغیر وضو مکمل نہیں ہوسکتا، اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ سر کا مسح وضو کے فرائض میں سے ہے، اختلاف محض اس بات پر ہے کہ سر کے کتنے حصے کا مسح کرلینا کافی ہے۔

☆ چناں چہ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا فرض ہے لیکن امام مالکؒ کے اصحاب میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ صرف ایک تہائی سر کا مسح کرلینا کافی ہے اور ان میں سے بعض کے نزدیک دو تہائی سر کا مسح کرنا ضروری ہے۔

☆ حنفی مسلک کے قابل اعتماد قول کے مطابق چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک سر کے کچھ حصے کا مسح ضروری ہے خواہ یہ حصہ کتنا ہی کم ہو
☆ حنبلیوں کے نزدیک پورے سر کا مسح فرض ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سر کا مسح وضو کا رکن ہے اور فرض ہے اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ اختلاف اگر ہے تو محض اس بات میں ہے کہ آیا پورے سر کا مسح فرض ہے یا سر کے کچھ حصے کا۔ یا پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ سر کے کس قدر حصے کا مسح کرنا فرض ہے۔ دراصل اس اختلاف کی وجہ حرف ''ف'' ہے جو ارشادِ باری تعالیٰ فَامۡسَحُوۡا بِرُؤُسِکُمۡ میں ہے کیوں کہ عربی لغت کے اعتبار سے یہ ''ب'' جو حرف جار ہے، کبھی تو زائد ہوتا ہے یعنی اس کے کوئی معنی نہیں لیے جاتے اور کبھی اس کے معنی ''بعض'' ہوتے ہیں یعنی کچھ حصہ۔ مثلاً جب کوئی کہتا ہے: اخذت بثوبه یا بعضده تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں نے اس کے کپڑے یا بازو کا کچھ حصہ پکڑا، پورا کپڑا یا پورا بازو مراد نہیں ہوتا۔ اب جن لوگوں نے ''ب'' کو زائدہ قرار دیا ہے انہوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو دلیل بنایا ہے، جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وضو کیا اور اپنی پیشانی اور عمامہ پر مسح کیا یعنی عمامہ کو کسی قدر اونچا اٹھایا اور سر کی پیشانی اور عمامہ پر مسح کیا۔ اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنوعی بالوں پر مسح کر لینے سے وضو صحیح نہیں ہوتا جب تک سر کے کچھ حصہ کا مسح نہ کیا جائے اور اس صورت میں بھی محض ان علماء کے قول پر عمل ہوگا، جنھوں نے سر کے کسی قدر حصہ پر مسح کر لینے کو کافی قرار دیا ہے۔

علاوہ ازیں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود مرحوم کا یہ فتویٰ موجود ہے کہ وِگ اور مصنوعی بالوں پر مسح کر لینے سے وضو صحیح نہیں ہوتا۔ یہ فتویٰ قاہرہ ریڈیو اسٹیشن سے ''نشریات قرآن'' کے پروگرام میں نشر ہو چکا ہے۔

꧁꧂

موزوں پر مسح کا بیان

بعض کارکن خواتین اور طالبات اپنی ڈیوٹی کے دوران یا تعلیم کے اوقات میں وضو کرتے وقت جرابیں اتارنے میں دقت محسوس کرتی ہیں اور انہوں نے دریافت کیا ہے کہ کیا عورت وضو کرتے وقت پاؤں دھونے کے بجائے جرابوں پر مسح کر سکتی ہے؟

ان کے جواب میں ہم اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی سنت مبارکہ سے موزوں پر مسح کرنا ثابت ہے۔ چناں چہ امام بخاریؒ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے موزوں پر مسح کیا۔

اور موزوں یا جرابوں پر مسح کی یہ رخصت مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہے۔ سفر میں بھی اور حضر میں بھی۔ لیکن اس کے لیے کچھ شرائط ہیں، جو درج ذیل ہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ پاؤں کا دھونا افضل ہے اور مسح محض رخصت برائے سہولت ہے۔

موزوں پر مسح کے لیے جو شرائط ضروری ہیں ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ موزہ ایسا ہو، جسے پہن کر مسلسل چلا جا سکے۔ یہ نہ ہو کہ چلتے وقت موزے میں سے پاؤں نکل جائے یا موزہ اتر جائے۔ اس مسئلہ میں فقہی اختلاف کی نوعیت درج ذیل ہے:

۱- مالکیوں کے نزدیک موزے پر مسح اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ موزہ کھال کا بنا ہوا نہ ہو، چناں چہ ان کے نزدیک نمدے وغیرہ سے بنے ہوئے موزے پر مسح کرنا صحیح نہیں۔

پھر کھال کے موزے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ سلا ہوا ہو لہٰذا اگر چمڑے یا کھال کے ٹکڑوں کو سریش وغیرہ سے جوڑ کر موزہ بنا لیا جائے تو ایسے موزے پر مسح صحیح نہیں۔

۲- شافعیوں کے نزدیک صرف ایسے موزے پر مسح صحیح ہے، جو کھال یا مضبوط بانات کا بنا ہوا ہو۔

۳- حنفیوں کے نزدیک ایسے موزے پر مسح جائز ہے، جس میں یہ صلاحیت ہو کہ اسے پہن کر ایک فرسخ مسافت طے کی جا سکے (فرسخ تین میل یا بارہ سو قدم کے برابر ہوتا ہے) اور یہ ایک فرسخ مسافت طے کرنے کی صلاحیت خود موزے میں ہونی چاہیے بغیر اس کے کہ اس پر چمڑے وغیرہ کا خول پہنا جائے اگر اس میں اتنی صلاحیت نہ ہو تو اس پر مسح درست نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر بہت باریک ہو یا لوہے یا شیشے یا اسی قسم کی کسی اور چیز سے بنا ہوا ہو تو اس پر مسح صحیح نہیں ہوگا۔

۴- حنبلیوں کے نزدیک یہ شرط ہے کہ موزہ ایسا ہو، جسے پہن کر اتنا چلا جا سکے، جسے عام طور پر چلنا کہا جاتا ہے اگرچہ یہ موزہ کسی ایسی چیز سے بنا ہو جس سے عام طور پر موزہ نہیں بنایا جاتا مثلاً لوہا یا لکڑی وغیرہ۔

کتاب الفقه علی المذاهب الاربعه میں مذکور ہے کہ:

جرابوں پر مسح کرنا سنت نبوی سے ثابت ہے، چناں چہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جرابوں اور جوتیوں پر مسح کیا۔

(یہ روایت احمد، ابوداؤد اور ترمذیؒ نے بیان کی ہے)

علاوہ ازیں جرابوں پر مسح کا جواز نبی کریم ﷺ کے نو (۹) صحابہ کرامؓ سے منقول ہے، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حضرت علی، حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابن مسعود، حضرت انس، حضرت ابن عمر، حضرت براء بن عازب، حضرت بلال، حضرت ابن ابی اوفیٰ اور حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہم اجمعین۔

جرابوں پر مسح کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ جرابیں موٹی ہوں، چناں چہ ایسی پتلی جرابوں پر جو باندھے بغیر پاؤں پر قائم نہ رہ سکیں مسح درست نہیں ہے اور نہ ایسی پتلی جرابوں پر مسح صحیح ہے، جن سے پانی جلد تک پہنچنے سے نہ رک سکے۔ اسی طرح ایسی شفاف جرابوں پر بھی مسح درست نہیں، جن میں سے ان کے نیچے کی سطح صاف نظر آئے، خواہ پتلی ہوں یا موٹی۔(۱)

---

(۱) جواب: جہاں تک چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے کا تعلق ہے اس کے جواز پر قریب قریب تمام اہل سنت کا اتفاق ہے، مگر سوتی اور اونی جرابوں کے معاملہ میں عموماً ہمارے فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ موٹی ہوں اور شفاف نہ ہوں کہ ان کے نیچے سے پاؤں کی جلد نظر آئے اور وہ کسی قسم کی بندش کے بغیر خود قائم نہ رہ سکیں۔

میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ ان شرائط کا ماخذ کیا ہے، مگر سنت میں ایسی کوئی چیز نہ مل سکی۔ سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔ نسائی کے سوا کتب سنن میں اور مسند احمد میں مغیرہ بن شعبہ کی روایت موجود ہے کہ نبی ﷺ نے وضو کیا اور مسح علی الجوربین والنعلین (اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا) ابوداؤ کا بیان ہے کہ حضرت علی، عبد اللہ بن مسعود، براء بن عازب، انس بن مالک، ابو امامہ، سہل بن سعد اور عمرو بن حریث نے جرابوں پر مسح کیا ہے، نیز حضرت عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ فعل مروی ہے بلکہ بیہقی نے ابن عباس اور انس بن مالک سے اور طحاوی نے اوس بن ابی اوس سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔ اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے اور یہی عمل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور صرف جوتے اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر مسح کرنا بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا۔ ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی کریم ﷺ نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو اور نہ یہی ذکر کسی جگہ ملا ہے کہ جن جرابوں پر حضور ﷺ نے اور مذکورہ بالا صحابہ نے مسح فرمایا وہ کس قسم کی تھیں۔ اس لیے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی ماخذ نہیں ہے اور فقہاء چوں کہ شارع نہیں ہیں، اس لیے ان کی شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گنہگار نہیں ہوسکتا۔

امام شافعی اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ جرابوں پر اس صورت میں آدمی مسح کرسکتا ہے جب کہ آدمی جوتے اوپر سے پہنے رہے۔ لیکن اوپر جن صحابہ کے آثار نقل کیے گئے ہیں ان میں سے کسی نے بھی اس شرط کی پابندی نہیں کی ہے۔

مسح علی الخفین پر غور کر کے میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل یہ تیمّم کی طرح ایک سہولت ہے، جو اہل ایمان کو ایسی حالتوں کے لیے دی گئی ہے جب کہ وہ کسی صورت سے پاؤں ڈھانکے رکھنے (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کے علاوہ موزوں پر مسح کرنے کے لیے جو شرائط ہیں اور یہ کہ کس قدر حصہ پر مسح کرنا ضروری ہے۔ تو اس طرح کے مسائل کے لیے فقہ کی کتابوں سے رجوع کیا جائے۔

❀❀

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) پر مجبور ہوں اور بار بار پاؤں دھونا ان کے لیے موجب نقصان یا وجہ مشقت ہو۔ اس رعایت کی بنا پر اس مفروضے پر نہیں ہے کہ طہارت کے بعد موزے پہن لینے سے پاؤں نجاست سے محفوظ رہیں گے اس لیے ان کو دھونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ بلکہ اس کی بنا اللہ کی رحمت ہے، جو بندوں کو سہولت عطا کرنے کی مقتضی ہوئی، لہٰذا ہر وہ چیز جو سردی سے یا راستے کے گرد وغبار سے بچنے کے لیے یا پاؤں کے کسی زخم کی حفاظت کے لیے آدمی پہنے اور جس کے بار بار اتارنے اور پھر پہننے میں آدمی کو زحمت ہو، اس پر مسح کیا جاسکتا ہے خواہ وہ اونی جراب ہو یا سوتی، چمڑے کا جوتا ہو یا کرچ کا، یا کوئی کپڑا ہی ہو، جو پاؤں پر لپیٹ کر باندھ لیا گیا ہو۔

وضو کے بغیر قرآن مجید کو چھونا

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ (الواقعة:۷۹)

"اسے پاک لوگوں کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔"

یہاں اس وقت جس بات سے ہمیں بحث مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ بغیر وضو کے قرآن مجید کو چھونے کا حکم کیا ہے؟

اس مسئلہ میں علماء کے درمیان اگرچہ اختلاف ہے لیکن جمہور اہل سنت کا مسلک یہی ہے کہ وضو کے بغیر قرآن کو چھونا منع ہے۔

ان کی دلیل یہ روایت ہے جسے امام مالکؒ نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عمر بن حزمؓ کو ایک تحریر لکھ دی، جس میں یہ بھی تھا کہ قرآن صرف وہ شخص چھوئے جو پاک ہو۔

اس تحریر کو امت مسلمہ کے علماء نے پوری طرح قبول کیا اور کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ یہ روایت ابو عبیدؒ نے فضائل القرآن میں بیان کیا ہے اور ان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسے درج کیا ہے اور امام اثرؒ نے بھی یہ روایت بیان کی ہے۔ اور حافظ مغرب امام ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ اس تحریر کے مندرجات حدیث متواتر کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور یعقوبؒ بن سفیان نے لکھا ہے کہ میں نے اس تحریر سے زیادہ صحیح کوئی تحریر نہیں دیکھی کیوں کہ نبی کریم ﷺ کے

صحابہ کرامؓ اور تابعین کبار اس تحریر کے مندرجات کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور اپنی رائے کو چھوڑ دیا کرتے تھے اور حاکم نے لکھا ہے کہ عمر بن عبد العزیزؒ اور امام زہریؒ نے اس تحریر کی صحت کی گواہی دی ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تمس القران الا و انت طاهر

''قرآن مجید کومت چھونا مگر اس حالت میں کہ تم پاک ہو۔''

اور اسی روایت سے امام احمدؒ بن حنبل نے بغیر وضو کے قرآن کو چھونے کی حرمت پر استدلال کیا ہے۔

امام داؤد ظاہریؒ نے اس مسئلہ میں جمہور کے مسلک سے اختلاف کیا ہے، ان کے نزدیک ایسے شخص کو جو پاک نہ ہو قرآن چھونا جائز ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قیصر روم کو ایک خط ارسال فرمایا تھا، جس میں قرآن مجید کی آیت لکھی ہوئی تھی۔(۱)

مختلف فقہی اقوال کی تفصیل

☆ مالکیوں کے نزدیک قرآن مجید یا اس کے کسی جز کو خواہ ایک آیت ہی ہو، بغیر وضو کے چھونا منع ہے خواہ ننگے ہاتھوں چھوا جائے یا کپڑے اور لکڑی وغیرہ کے ذریعے سے۔ اسی طرح بغیر وضو کے قرآن مجید کو اٹھانا بھی منع ہے، خواہ کسی چیز مثلاً تکیے وغیرہ پر رکھ کر اٹھائے بشرطیکہ قرآن مجید کو اٹھانا مقصود ہو لیکن اگر سامان مثلاً صندوق وغیرہ اٹھایا جائے اور اس میں قرآن مجید بھی ہو تو ایسے سامان کو اٹھانا جائز ہے لیکن یہ پابندی اس صورت میں ہے جب قرآن مجید عربی خط میں لکھا ہوا ہو اور خط کوفی بھی عربی خط ہے۔ مالکیوں کے نزدیک تعلیمی ضرورت کے تحت بالغ مرد یا عورت اگر استاد یا طالب علم ہو تو قرآن مجید کو بغیر طہارت کے ہاتھ لگا سکتا ہے بلکہ تعلیمی مقاصد کے لیے عورت اگر حیض کی حالت میں ہو تب بھی قرآن کو

---

(۱) قیصر روم عیسائی تھا اور ظاہر ہے کہ وہ باوضو نہ تھا۔ (مترجم)

چھو سکتی ہے۔

☆ حنبلیوں کا مسلک یہ ہے کہ بالغ مرد یا عورت بغیر وضو کے قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے، خواہ ایک آیت ہی لکھی ہوئی ہو۔ البتہ ان کے نزدیک بے وضو کے لیے کسی دوسری پاک چیز مثلاً کپڑے یا لکڑی کے واسطے سے چھو لینا جائز ہے یا کسی چیز مثلاً جزدان یا سامان وغیرہ میں رکھ کر اٹھانا بھی جائز ہے خواہ مقصود قرآن مجید ہی اٹھانا ہو۔ اسی طرح قرآن مجید کی آیات کو بطور تعویذ لکھ کر اپنے پاس رکھنا بھی بغیر وضو کے جائز ہے بشرطیکہ یہ تحریر کسی پاک چیز کے اندر چھپی ہو۔ لیکن نابالغ بچہ اگر بے وضو ہے تو ولی کے لیے جائز نہیں ہے کہ اسے قرآن مجید یا وہ تختی جس پر قرآنی آیات لکھی ہوں پکڑنے کی اجازت دے، خواہ مقصد قرآن کی تعلیم حاصل کرنا یا حفظ کرنا ہی کیوں نہ ہو۔

☆ شافعیوں کے نزدیک بالغ مرد و عورت کے لیے بغیر وضو کے قرآن مجید یا اس کے کسی جز کو چھونا خواہ ایک آیت ہو حرام ہے خواہ بے وضو شخص کے ہاتھ اور قرآن کے درمیان کوئی چیز حائل ہو، جو اس سے جدا ہو۔ لیکن اگر قرآن کریم کسی ایسے بڑے تھیلے یا صندوق میں رکھا ہو جو قرآن رکھنے کے لیے نہ بنایا گیا ہو تو اس کا چھونا یا اٹھانا حرام نہیں ہے۔ اس صورت میں بھی اس تھیلے یا بکس کے اس حصہ کو ہاتھ لگانا حرام ہے جو قرآن مجید کے بالمقابل ہے نیز قرآن مجید کی جلد کو بھی بے وضو ہاتھ لگانا حرام ہے خواہ یہ جلد قرآن مجید سے علیحدہ کر لی گئی ہو البتہ اگر اسے کسی اور کتاب پر چڑھا دیا گیا ہے اور اب وہ قرآن کی جلد نہیں رہی تو اب اس کا چھونا بغیر وضو کے جائز ہے۔ اسی طرح اس چیز کو بھی بغیر وضو کے چھونا حرام ہے، جس کے ساتھ قرآن مجید لٹک رہا ہو۔

☆ احناف کے نزدیک بغیر وضو کے قرآن مجید کو چھونا اور دیکھنا خواہ ایک آیت ہو منع ہے خواہ یہ مصحف عربی زبان میں لکھا ہوا ہو یا فارسی وغیرہ یعنی کسی دوسری زبان میں البتہ اگر کوئی ضرورت پیش آ جائے مثلاً قرآن مجید کو پانی میں ڈوبنے یا آگ میں جلنے سے بچانا مقصود ہو تو ایسی صورت میں بے وضو چھونا جائز ہے، اسی طرح اگر قرآن مجید ایسے غلاف میں

لپٹا ہوا ہو، جو اس سے علیحدہ ہو مثلاً جزدان وغیرہ تو اس کو بغیر وضو کے بلا ضرورت بھی چھونا جائز ہے لیکن وہ جلد بھی جو قرآن کے ساتھ جڑی ہوئی ہو اور وہ تمام چیزیں جو قرآن کی خرید و فروخت کے وقت اس کے ساتھ ہوتی ہیں اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ یہ چیزیں بھی ساتھ ہوں گی ان چیزوں کے حائل ہونے سے بھی مفتی بہ قول کے مطابق قرآن مجید کو چھونے کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ قلم یا لکڑی یا ایسی ہی کسی اور چیز سے بلا وضو چھونا جائز ہے۔

قرآن کی تلاوت بغیر ہاتھ لگائے بلا وضو جائز ہے لیکن حدث اکبر یعنی جنابت اور حیض و نفاس کی حالت میں تلاوت کرنا منع ہے، جیسا کہ آگے چل کر ہم اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کریں گے۔

عورتوں کے خون سے متعلق مسائل

حیض

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ یَسْأَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ ھُوَ أَذًی فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ وَ لَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰی یَطْھُرْنَ فَاِذَا تَطَھَّرْنَ فَأْتُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ أَمَرَکُمُ اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ○

(البقرۃ:۲۲۲)

"پوچھتے ہیں حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو وہ ایک گندگی کی حالت ہے اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہوجائیں۔ پھر جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس جاؤ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے، اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔"

عورتوں کے اندام نہانی سے جو خون خارج ہوتا ہے وہ تین قسم کا ہے:

۱۔ ایک: بیماری کا خون، جو نو سال کی عمر سے پہلے آئے یا ایسے ایام میں یا ایسی عمر میں آئے جب عورت کو حیض کا خون آنا بند ہو جاتا ہے۔ ایسے خون کو استحاضہ یا خون فاسد کہتے ہیں۔

۲- دوسرا: حیض کا خون

۳- تیسرا: نفاس کا خون

حیض ایک ایسا معاملہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ساتھ خاص کیا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد میں اس کا ذکر ہے۔ دین اسلام میں حیض کے مخصوص احکام و مسائل ہیں، جو بنی اسرائیل کے احکام سے مختلف ہیں، چناں چہ امام مسلمؒ اور امام ترمذیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہودی حیض والی عورت کو گھر سے باہر نکال دیا کرتے تھے اور کھانے پینے میں اسے اپنے ساتھ شریک نہیں کرتے تھے اور وہ گھر میں بھی دوسرے افراد خانہ کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ چناں چہ اہل عرب اور قرب و جوار کے رہنے والوں نے اس سلسلے میں بنی اسرائیل کے یہی طور طریقے اپنا لیے اور وہ بھی حائضہ عورت کے ساتھ کھانے پینے اور رہنے سہنے سے پرہیز کرنے لگے۔ جب نبی کریم ﷺ سے اس سلسلے میں دریافت کیا گیا تو قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَ يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ الخ

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”حائضہ عورت سے جماع کے سوا سب کچھ جائز ہے“ آپؐ کے اس ارشاد کی اطلاع جب یہودیوں کو ہوئی تو وہ کہنے لگے: یہ شخص (رسول اللہؐ) کیا چاہتا ہے؟ اس نے ہمارے طور طریقے میں سے کوئی باقی نہیں چھوڑی، جس کی مخالفت نہ کی ہو۔

عربی زبان میں محیض سے وہ زمانہ بھی مراد لیا جاتا ہے جب عورت کو حیض آتا ہے اور مقام حیض بھی اور خون حیض بھی یعنی اس لفظ کے یہ تینوں معنی ہیں۔

لفظ حیض کے بنیادی معنی بہنے اور پھوٹ نکلنے کے ہیں۔ محاورے میں کہا جاتا ہے کہ (حاض السیل و فاض) سیلاب پھوٹ بہا یا سیلاب آ گیا، اسی طرح کہا جاتا ہے کہ: (حاضت الشجرة) درخت کی رطوبت بہنے لگی۔ اسی سے لفظ حیض یا حوض بنا ہے کیوں کہ پانی اس کی طرف بہہ کر جاتا اور جمع ہوتا ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں حیض سے مراد وہ خون ہے جو عورت کے مقام مخصوص سے بحالت صحت خارج ہوتا ہے اور رحم کے اندر سے آتا ہے اور اس کا سبب نہ تو زچگی ہوتی ہے اور نہ اسقاطِ حمل اور یہ عورت کے بالغ ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ بلوغ کی کم سے کم عمر نو سال ہے اور سن ایاس تک یعنی اس عمر تک جب عورت اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی، جاری رہتا ہے۔اس سلسلے میں مختلف مسالک فقہ کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

عورت کو اگر نو سال کی عمر سے پہلے خون آئے یا سن ایاس میں یعنی ایسی عمر میں جب خون آنا بند ہو جاتا ہے کسی عورت کو خون آئے تو ایسا خون حیض نہیں ہوگا بلکہ خون فاسد یا بیماری کا خون ہوگا۔

حیض ایک ایسا معاملہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمایا جب آپ ﷺ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے اور حضرت عائشہؓ آپ کے ہمراہ تھیں، اس موقع پر حضرت عائشہؓ کو حیض شروع ہو گیا اور یوم عرفہ تک جاری رہا۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت عائشہؓ رونے لگیں۔ اسی وقت آپ کے پاس نبی کریمؐ تشریف لائے اور حضرت عائشہ کو روتے دیکھ کر دریافت کیا: کیا بات ہے کیوں رو رہی ہو؟

حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: میں اس لیے رو رہی ہوں کہ لوگوں نے عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول دیا اور میں ایسا نہ کر سکی۔ لوگوں نے بیت اللہ کا طواف کیا اور میں نہ کر سکی اور اب حج یعنی یوم عرفہ آ گیا ہے اور میں اس حال میں ہوں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ تو ایک ایسا ناگزیر معاملہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بیٹیوں کے نصیب میں لکھ دیا ہے لہٰذا تم غسل کرو اور حج کا احرام باندھ لو۔

حدیث شریف میں جو آدم علیہ السلام کی بیٹیوں کا ذکر آیا ہے اس سے ان کی اکثریت مراد ہے لہٰذا اگر بعض عورتوں کو حیض نہ آئے تو اس سے کوئی اشکال لازم نہیں آتا۔

بعض عورتوں کو حیض نہ آنا ایک امر واقعہ ہے اور اطباء اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا ہے لہٰذا اس پر حیران ہونے یا انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

خون حیض کے دس نام ہیں:

حیض، طمث، ضحک، اکبار، اعصار، دراس، عراک، فراک، طمس اور نفاس۔

ضحک بمعنی حیض کی مثال سورۂ ہود کی آیت نمبر ۷۱ میں ہے۔ حضرت سارہ کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ امۡرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتۡ فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ وَ مِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ.

"ابراہیم کی بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی، وہ یہ سن کر ہنس دی پھر ہم نے اس کو اسحٰق کی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی۔"

اس آیت میں ضحکت کے معنی بعض مفسروں نے حاضت کیے ہیں یعنی انہیں حیض شروع ہوگیا۔

حیض کی تعریف

حیض کی تعریف میں علماء کے درمیان اختلاف ہے:

☆ مالکی مسلک کے مطابق اگر قریب البلوغ لڑکی کو جس کی عمر ۹ سال سے تیرہ سال کے مابین ہو خون آنا شروع ہوجائے تو اس سلسلے میں بڑی عورتوں سے دریافت کرلیا جائے اور اگر وہ قطعیت کے ساتھ کہہ دیں کہ یہ حیض ہے یا انہیں کچھ شک ہو تو بھی حیض ہی سمجھا جائے گا، ورنہ وہ حیض فاسد خون اور کسی بیماری کی علامت ہوگی، کسی تجربہ کار اور دیانت دار طبیب کی رائے بھی وہی حکم رکھتی ہے جو عورتوں کی رائے رکھتی ہے۔

لیکن اگر جس لڑکی کو خون آنا شروع ہوا ہے اس کی عمر تیرہ اور پچاس سال کے درمیان ہے تو یہ یقیناً حیض کا خون ہے او اگر ایسی عورت کو خون آئے، جس کی عمر پچاس سال سے زائد اور ستر سال کے قریب ہو تو اس کے سلسلے میں بھی تجربہ کار عورتوں سے پوچھا جائے گا اور ان کی صوابدید کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، لیکن اگر ایسی عورت کو خون آئے، جس کی عمر

پورے ستر سال ہو چکی ہے تو یہ خون قطعاً حیض نہیں ہے بلکہ استحاضہ ہے اور یہی حکم اس بچی کے خون کا ہے، جس کی عمر ابھی نو سال بھی نہ ہوئی ہو۔

☆ احناف نے جس قول کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر نو سال کے عمر کی لڑکی کو خون آنا شروع ہو تو یہ حیض ہی کا خون ہے اور اس خون کے آتے ہی عورت ان دنوں میں نماز چھوڑ دے گی، خون آنے کا سلسلہ سن ایاس تک جاری رہتا ہے اور حنفی مسلک کے قول مختار کے مطابق سن ایاس پچپن سال کی عمر ہے۔ لہٰذا اگر پچپن سال کی عمر کے بعد خون آئے تو وہ حیض کا خون نہیں ہے لیکن اگر عورت سن ایاس یعنی پچپن سال کی عمر کے بعد گہرے سیاہ یا خوب سرخ رنگ کا خون دیکھے تو ایسی صورت میں اسے حیض ہی شمار کیا جائے گا۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک سن ایاس پچاس سال کی عمر ہے لہٰذا اگر عورت کو اس عمر کے بعد خون آئے تو وہ حیض کا خون نہیں ہے۔

☆ شافعیوں کے خیال میں حیض کا خون اس وقت شروع ہوتا ہے جب عورت کی عمر نو سال ہو جائے اور حیض ختم ہونے کے لیے عمر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ چناں چہ عورت کو حیض ساری زندگی آ سکتا ہے لیکن عام طور پر ۶۲ سال کی عمر میں خون حیض آنا بند ہو جاتا ہے۔ غالباً یہی وہ عمر ہے، جسے سن ایاس کہا جا سکتا ہے۔

خون حیض کے شرائط

خون حیض کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل رنگوں میں سے کسی رنگ کا ہو، یعنی سرخ یا زرد یا گدلے رنگ کا (یعنی سیاہی اور سفیدی کے بین بین) ہو۔ لہٰذا اگر خالص سفید رنگ کی رطوبت نظر آئے تو وہ حیض نہیں ہے۔

احناف نے ان رنگوں میں سیاہ، سبز اور مٹیالے رنگ کا اور اضافہ کیا ہے اور شافعیوں نے اس میں صرف سیاہ اور زعفرانی یعنی سرخی مائل زرد رنگ کا اضافہ کیا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ عورت حاملہ نہ ہو، چناں چہ حاملہ عورت کو اگر خون آئے تو وہ

کسی خرابی کی وجہ سے ہوگا، حیض نہیں ہوگا۔

اور یہ شرط بھی ہے کہ اس خون کے آنے سے پہلے طہر (پاکی کے ایام) کی کم از کم مدت گزر چکی ہو اور یہ بھی شرط ہے کہ خون اتنے دن آئے جو حیض آنے کی کم سے کم کی مدت ہے۔

مالکیوں اور شافعیوں کے نزدیک حاملہ عورت کو اگر خون آئے تو وہ خون حیض ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ان کے ہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ رحم حمل سے خالی ہو البتہ اگر حاملہ عورت کو مسلسل خون آئے تو شافعیوں کے نزدیک اتنے دنوں کا خون حیض شمار ہوگا، جتنے دن اس عورت کو عام حالات میں عادتاً حیض آیا کرتا تھا اور جتنے دن اس مدت سے زائد ہوں گے وہ حیض شمار نہیں ہوگا۔ مالکیوں کا خیال ہے کہ حاملہ عورت کو حمل کے دو ماہ بعد سے چھ ماہ تک کے دوران میں اگر خون آئے تو اس میں بیس دن حیض کے شمار ہوں گے، اگر خون مسلسل جاری رہے اور چھٹے مہینے سے حمل کے آخری دنوں تک خون آئے تو تیس دن حیض کے شمار ہوں گے۔ اور اگر حمل کے پہلے یا دوسرے مہینے میں خون آئے تو عام عادت کے حساب سے حیض کے دن مقرر کیے جائیں گے۔

حیض کی مدت

☆ شافعیوں کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے اور عام طور پر چھ یا سات دن حیض آتا ہے۔

☆ احناف کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت تین دن رات ہے اور زیادہ سے زیادہ مدتِ حیض دس دن رات ہے۔ اب اگر کسی عورت کی عادت مقرر ہو یعنی عام طور پر اسے چند مقررہ دن حیض آتا ہو اور پھر زیادہ دن آجائے تو دس دن کے اندر اندر جتنے دن زائد خون آئے گا وہ حیض شمار ہوگا۔ مثلاً ایک عورت کی عادت تین دن کی تھی پھر چار دن خون آگیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی عادت بدل گئی ہے اور تین دن کی بجائے اب چار دن خون آنے لگا ہے اور چوتھے دن کے خون کو بھی حیض ہی شمار کیا جائے گا کیوں کہ ایک مرتبہ ایک خاص مدت

تک خون آ جائے تو وہ مدت عادت قرار پاتی ہے لہٰذا اگر پہلے چار دن خون آیا کرتا تھا پھر پانچ دن آیا تو عادت چار کی بجائے پانچ دن ہوگئی ہے اور پانچویں دن کا خون بھی حیض ہی شمار ہوگا۔ اسی طرح دس دن تک جتنے دن عادت کے دنوں سے زائد خون آئے گا وہ حیض شمار ہوگا لیکن اگر خون دس دن سے بھی زائد دن آئے تو استحاضہ کا خون سمجھا جائے گا اور اس دن کے اندر بھی جتنے دن عادت سے زائد خون آیا ہے اسے حیض شمار نہیں کیا جائے گا بلکہ عادت کے مطابق جتنے دن حیض آیا کرتا تھا اتنے ہی دنوں کا خون حیض شمار ہوگا اور باقی دنوں کے خون کو استحاضہ شمار کیا جائے گا۔

☆ مالکیوں کے نزدیک عبادت کے نقطۂ نگاہ سے تو حیض کی کم سے کم حد کچھ نہیں ہے، نہ مقدار خون کے لحاظ سے اور نہ مدت کے اعتبار سے۔ اس لیے اگر کسی عورت کو ایک لحظہ کے لیے بھی خون کی کچھ مقدار خارج ہوگئی تو وہ حائضہ سمجھی جائے گی۔ لیکن عدت اور استبرا(۱) کے نقطہ نگاہ سے مالکیوں کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ہے اور زیادہ سے زیادہ کے لیے مقدار کے اعتبار سے کوئی حد مقرر نہیں ہے مثلاً اس کی مقدار کا اس طرح اندازہ نہیں کیا جائے گا کہ ایک پونڈ خارج ہوا یا اس سے کم یا اس سے زیادہ وغیرہ۔ البتہ مدت کے اعتبار سے جس عورت کو پہلی بار حیض آیا ہو اور وہ حاملہ نہ ہو تو اس کے لیے حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن شمار ہوگی۔

طُہر(۲) کم سے کم مدت

حنفیوں کے نزدیک طہر کی مدت کم سے کم پندرہ دن ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ حنبلیوں کے نزدیک طہر کی کم سے کم مدت تیرہ دن ہے۔

---

(۱) استبراء: یہ اطمینان کرنا کہ عورت کا رحم حمل سے خالی ہے۔ (مترجم)

(۲) طُہر کے لفظی معنی پاکی کے ہیں اور اصطلاحاً طہر سے مراد وہ دن ہیں، جن میں حیض یا نفاس کا خون نہ آرہا ہو۔ (مترجم)

ایام حیض کے دوران وقفہ

حیض کے دنوں کے دوران میں اگر کسی دن خون کا داغ نہ لگے تو وہ دن بھی مدت حیض میں شمار ہوگا مثلاً ایک دن خون آیا لیکن دوسرے دن کپڑے پر خون کا دھبہ نہ لگا اور تیسرے دن پھر خون آ گیا۔ الغرض حیض کی پوری مدت کے دوران میں اسی طرح ہوتا رہا تو یہ تمام دن حیض کے شمار ہوں گے لیکن حنبلیوں کے نزدیک حیض کے دنوں کے درمیان جس دن خون نہ آئے اور داغ نہ لگے وہ دن طہر کا شمار ہوگا۔ مثلاً ایک دن خون آیا پھر دوسرے دن خون نہ آیا پھر تیسرے دن آیا تو جس دن خون نہ آیا وہ دن طہر کا ہے اور اس دن وہ تمام ایسے کام کرسکتی ہے، جو ایک پاک عورت کے لیے جائز ہے۔

ഇ ഈ

نفاس

نفاس کی تعریف

نفاس اس خون کو کہتے ہیں، جو ولادت کے وقت عورت کے اندامِ نہانی سے آتا ہے، چناں چہ اگر پیٹ چاک کیا جائے اور بچہ پیدا ہو اور خون نہ آئے تو عورت ''نفساء'' نہ ہوگی اور خون نفاس سے متعلقہ احکام کا اطلاق اس پر نہ ہوگا۔ اگر چہ اس طرح بچے کی پیدائش سے بھی عدت پوری ہو جائے گی۔

اسقاطِ حمل کی صورت میں اگر ساقط ہونے والے حمل میں انسانی شکل وصورت نمایاں ہوگئی تھی اور اس کی انگلیاں، ناخن یا بال وغیرہ پیدا ہو چکے تھے تب تو اسے بچہ قرار دیا جائے گا اور اس کے بعد آنے والا خون ''نفاس'' ہوگا لیکن اگر اس میں انسانی شکل وصورت نمایاں نہ ہوئی ہو، مثلاً خون کا لوتھڑا یا گوشت کا ٹکڑا ہو تو ایسی صورت میں اس کے بعد آنے والے خون کو اگر حیض قرار دیا جا سکے، مثلاً وہ ان ایام میں آیا ہو، جن میں اس عورت کو عادتاً خون آیا کرتا تھا تب وہ حیض ہوگا ورنہ اسے بیماری کا خون یا خون فاسد قرار دیا جائے گا۔

جڑواں بچوں کی پیدائش

اگر عورت توأم بچوں کو جنم دے یعنی اس کے ہاں دو بچے بیک وقت پیدا ہوں تو اس

---

(۱) نفساء وہ عورت ہے جسے زچگی کے بعد خون نفاس آئے۔

کے نفاس کی مدت پہلے بچے کی پیدائش کے وقت سے شمار کی جائے گی یعنی اگر پہلے بچے اور دوسرے بچے کی پیدائش کے درمیان کچھ وقفہ ہو تو نفاس کی مدت کا شمار پہلے بچے کی ولادت سے کیا جائے گا خواہ یہ وقفہ نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت کے برابر ہو، چناں چہ اگر دوسرا بچہ پہلے بچے کی ولادت کے چالیس دن بعد پیدا ہوا تو دوسرے بچے کی ولادت کے بعد آنے والے خون کو نفاس شمار نہیں کیا جائے گا بلکہ بیماری کا خون یا خون فاسد سمجھا جائے گا۔ یہی احناف کا مسلک ہے۔

نفاس کی مدت

نفاس کی کم سے کم مدت کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے، چناں چہ یہ مدت ایک لحظہ بھی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی عورت نے بچے کو جنم دیا اور ولادت کے فوراً بعد خون کا آنا بند ہوگیا یا بچہ پیدا ہوا اور خون آیا ہی نہیں تو نفاس کی مدت گزر گئی اور اس پر وہ تمام امور واجب ہوں گے، جو ایک پاک عورت پر واجب ہوتے ہیں۔

نفاس کی کم سے کم مدت بعض کے نزدیک ایک لحظہ ہے۔ البتہ نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہیں۔

ایامِ نفاس کے دوران وقفہ

مدتِ نفاس کے دوران میں جن دنوں خون نہ آئے مثلاً ایک دن خون آئے اور دوسرے دن نہ آئے تو اس کے بارے میں جو فقہی اختلاف ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ حنفیوں کے نزدیک نفاس کا خون آنے کے دوران میں جن دنوں خون نہ آئے وہ بھی نفاس کے دن شمار ہوں گے۔

۲۔ حنبلیوں کے نزدیک خون نفاس آنے کے دوران میں جس دن خون نہ آئے وہ دن طہر یعنی پاکی کا دن شمار ہوگا۔

۳۔ شافعیوں کے نزدیک خون نہ آنے کا وقفہ اگر پندرہ دن یا پندرہ دن سے زیادہ ہو تو

وہ طہر (پاک دن) شمار ہوں گے یعنی ان پندرہ دنوں سے پہلے جتنے دن خون آتا رہا وہ نفاس کے دن ہوں گے اور پندرہ یا پندرہ دن سے زیادہ دن خون نہ آنے کے بعد بھی پھر جن دنوں میں خون آئے گا وہ دن بھی طہر کے شمار ہوں گے لیکن یہ خون نہ آنے کا وقفہ اگر پندرہ دن سے کم ہو تو پھر یہ دن بھی جن میں خون نہیں آیا صحیح تر قول کے مطابق نفاس کے دن سمجھے جائیں گے۔

۴۔ مالکیوں کے مطابق خون نہ آنے کا وقفہ اگر نصف ماہ کے برابر ہے تو وہ طہر یعنی پاک دن شمار ہوں گے اور ان کے بعد جو خون آئے گا وہ خون حیض ہے اور اگر یہ وقفہ نصف ماہ سے کم ہے تو اس کے بعد آنے والے خون کو بھی نفاس ہی سمجھا جائے گا اور نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت کا حساب اس طرح کیا جائے گا کہ خون آنے کے دنوں کو باہم جمع کر لیا جائے گا اور جن دنوں میں خون نہیں آیا وہ خارج کر دیے جائیں گے حتی کہ خون آنے کے دنوں کی تعداد ساٹھ ہو جائے۔ ساٹھ دن پورے ہونے کے بعد سمجھ لیا جائے گا کہ نفاس کی مدت ختم ہوگئی ہے اور جن دنوں میں خون بند رہا تھا ان میں یہ عورت وہ سب کچھ کرے گی، جو ایک پاک عورت کر سکتی ہے مثلاً: نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا وغیرہ۔

۞

استحاضہ

حیض اور نفاس کے سوا جو خون عورت کے رحم سے آئے اسے استحاضہ کہا جاتا ہے، چناں چہ وہ خون جو حیض اور نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت پوری ہوجانے کے بعد آئے، یا حیض و نفاس کی کم سے کم مدت سے بھی کم وقت آئے یا حیض شروع ہونے کی عمر (نو سال کی عمر) سے بھی پہلے آئے وہ استحاضہ ہے۔ الغرض خون ستحاضہ وہ خون ہے، جو بیماری کی وجہ سے آئے اور خون حیض کے علاوہ ہو، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انما ذلك عرق و ليس بحيضه

''یہ خون کسی رگ سے آرہا ہے اور حیض نہیں ہے۔''

اگر خونِ استحاضہ ہمیشہ آتا ہو

جس طرح فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر حائضہ عورت کو طویل مدت تک خون آتا رہے تو کب اس کے خون کو حیض سمجھا جائے گا اور کب اس کا خون استحاضہ ہوگا۔ اسی طرح ان کے مابین اس میں بھی اختلاف ہے کہ جب کسی عورت کو استحاضہ کا خون ہمیشہ آتا ہو تو کب اس پر حائضہ کے احکام جاری ہوں گے۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ ایسی عورت ہر ماہ اپنی حیض کی عادت کے لحاظ سے حائضہ شمار ہوگی اور اگر کسی عورت کو پہلی مرتبہ خون حیض آیا ہے اور اس کی عادت مقرر نہیں ہے تو اسے ہر ماہ حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت

کے برابر (جو کہ ان کے نزدیک دس دن ہے) حائضہ سمجھا جائے گا اور باقی دنوں میں مستحاضہ ہوگی۔

امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ اگر وہ عورت صاحب تمیز ہے یعنی اگر اس کو خون اس طرح آتا ہے کہ اس کے خون حیض اور استحاضہ میں امتیاز کیا جاسکتا ہے تب تو اس فرق کے مطابق عمل کرے گی اور اگر اس کی عادت مقرر ہے تو پھر عادت کے مطابق فیصلہ کیا جائے (یعنی اس کی عادت جتنے دن حیض آنے کی ہو اتنے دن حیض کے شمار کیے جائیں باقی دنوں کے خون کو استحاضہ سمجھا جائے) اور اگر وہ ایسی عورت ہے کہ اس کی عادت بھی مقرر ہو اور اس کے خون حیض اور خون استحاضہ میں فرق کیا جاسکتا ہو تو ایسی صورت میں امام شافعیؒ سے دو قول مروی ہیں ایک قول یہ ہے کہ خون میں تمیز کر کے اس کے مطابق عمل کرے اور دوسرا قول یہ ہے کہ عادت کے مطابق فیصلہ کرے۔

یعنی وہ عورت جسے خون استحاضہ آرہا ہے اگر وہ ایسی عورت ہے کہ اسے پہلی بار حیض آیا ہے لیکن وہ دونوں قسم کے خونوں میں فرق و امتیاز کرسکتی ہے یعنی قوی اور ضعیف خون کی پہچان ہے تو قوی خون حیض سمجھا جائے گا بشرطیکہ یہ حیض کی کم سے کم مدت سے کم اور حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت سے زیادہ نہ ہو اور ضعیف خون کو استحاضہ شمار کیا جائے گا اور وہ عورت ان دنوں پاک ہوگی بشرطیکہ یہ وقفہ طہر کے کم سے کم وقفہ سے کم نہ ہو اور خون مسلسل آئے۔

لیکن اگر معاملہ عادت اور خون کی پہچان دونوں کے اعتبار سے غیر واضح ہو تو پھر ایسی عورت کو ہر ماہ ایک دن اور ایک رات حائضہ شمار کیا جائے گا اور مہینہ کے باقی دنوں میں وہ پاک شمار ہوگی۔ مثلاً کسی عورت کو پہلی مرتبہ خون حیض آیا ہو اور اس سلسلے میں اس کی کوئی عادت مقرر نہ ہو اور ساتھ ہی وہ حیض اور استحاضہ کے خون میں فرق و امتیاز بھی نہ کرسکتی ہو تو اس کے لیے مندرجہ بالا حکم ہے۔

لیکن اگر ایسی عورت ہے کہ اس کی عادت مقرر ہے اور وہ دونوں قسم کے خون میں فرق بھی کرسکتی ہے تو پھر قوی خون کو حیض کا خون سمجھا جائے گا اور اس کی عادت کو ملحوظ نہیں رکھا

جائے گا بلکہ دونوں قسم کے خون میں فرق و امتیاز پر عمل کیا جائے گا۔

لیکن اگر عورت صاحب عادت ہو اور دونوں قسم کے خونوں میں فرق نہ کرسکتی ہو مگر مقررہ عادت کی بنا پر اسے معلوم ہو کہ اس سے پہلے اسے کتنے دن خون آیا کرتا تھا تو پھر اس کے حیض و استحاضہ کا فیصلہ اس کی عادت کے مطابق ہوگا۔

مالکیوں کا کہنا یہ ہے کہ جس عورت کو مسلسل خون آئے وہ پاک سمجھی جائے گی تا آنکہ اس کے خون میں خون حیض کے اوصاف پائے جائیں اور خون کی کیفیت بدل جائے وہ ایام حیض کے ہوں گے بشرطے کہ اس سے پہلے اس قدر وقفہ ہو، جو طہر کی کم سے کم مدت ہے یعنی پندرہ دن کا وقفہ ہو لیکن اگر خون میں فرق نہ کیا جاسکے یا طہر کا جو کم سے کم وقفہ مقرر ہے اس سے پہلے ہی خون کی کیفیت میں فرق پڑ جائے تو یہ دن بھی استحاضہ کے شمار ہوں گے یعنی وہ ان دنوں میں اس طرح رہے گی گویا کہ وہ پاک ہے خواہ پوری زندگی اس کی یہی کیفیت رہے۔ اور ایسی عورت احادیث کی رو سے عدت اس طرح گزارے جیسے "مرتابہ" یعنی وہ عورت عدت گزارتی ہے، جس کے خون کا معاملہ مشکوک ہو۔ لیکن جو عورت خون میں فرق و امتیاز کرسکتی ہے وہ محض احتیاط کی خاطر تین دن بھی اپنی سابقہ عادت پر زیادہ نہ کرے بلکہ جب تک ایسا خون آتا رہے، جو خون حیض سے مختلف ہو اپنی سابقہ عادت پر قائم رہے۔ لیکن اگر ہمیشہ یہی صورتِ حال رہے تو پھر احتیاط کرے۔

حنبلیوں کا مسلک یہ ہے کہ جس عورت کو مسلسل خون آتا ہو وہ یا تو ایسی عورت ہوگی، جس کی حیض کی عادت مقرر ہوگی اور یا اسے پہلی مرتبہ حیض آیا ہوگا اور عادت مقرر نہ ہوگی۔

چناں چہ جس عورت کی عادت مقرر ہے وہ اپنی عادت کے مطابق عمل کرے گی یعنی جتنے دن عادتاً اسے حیض آیا کرتا تھا اتنے دن وہ حیض کے شمار کرے گی اور عادت والی کے سلسلے میں خون کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے گا اور وہ عورت جسے پہلی بار خون آیا ہو اور اس کی عادت مقرر نہ ہو وہ یا تو ایسی ہوگی کہ وہ اپنے دونوں قسم کے خون (یعنی خون حیض اور خون استحاضہ) میں فرق کرسکتی ہوگی یا اسے مسلسل ایک ہی طرح کا خون آتا ہوگا اور حیض و استحاضہ کے خون

میں فرق نہ کرسکتی ہوگی چناں چہ اگر وہ فرق کرسکتی ہے تو اپنے فرق و امتیاز کے مطابق عمل کرے بشرطیکہ قوی خون حیض کا خون شمار ہو سکے یعنی وہ ایک دن اور ایک رات سے کم اور پندرہ دن سے زیادہ مدت نہ آیا ہو۔ اور اگر وہ تمیز نہ کرسکتی ہو تو اس کے حیض کی مدت ایک دن ایک رات شمار کی جائے گی۔ اس کے بعد وہ غسل کرے اور ایسے سب کام کرے، جو ایک پاک عورت کرتی ہے لیکن یہ حکم صرف پہلے دوسرے اور تیسرے مہینہ کے لیے ہے۔ چوتھے مہینہ اس کے حیض کی مدت اتنے دن شمار ہوگی، جتنے دن عام طور پر عورتوں کو حیض آتا ہے یعنی چھ یا سات دن اور اس سلسلے میں وہ خود اچھی طرح سوچ کر کوئی فیصلہ کرے۔

فقہاء کے اختلاف کا سبب

اس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف کا سبب دو مختلف حدیثیں ہیں

۱- پہلی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیشؓ استحاضہ کی مریض تھیں۔ انہوں نے جب نبی کریم ﷺ سے اس کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ فاطمہ اتنے دن نماز چھوڑ دیں جتنے دن انہیں اس بیماری کے لاحق ہونے سے پہلے حیض کا خون آیا کرتا تھا اس کے بعد غسل کریں اور نماز پڑھیں۔

۲- دوسری حدیث وہ ہے، جسے ابوداؤد نے فاطمہ بنت ابی حبیشؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ فاطمہ کو استحاضہ کا خون آیا کرتا تھا تو انھیں نبی کریم ﷺ نے ہدایت کی کہ حیض کا خون سیاہ رنگ کا ہوتا ہے، جو پہچانا جاسکتا ہے لہٰذا جن دنوں ایسا خون آئے نماز چھوڑ دو اور جب اس سے مختلف رنگ کا خون آرہا ہو تو وضو کرو اور نماز پڑھو کیوں کہ یہ کسی رگ کا خون ہے اس حدیث کو ابو محمد ابن حزم نے صحیح قرار دیا ہے۔

مستحاضہ کی طہارت

اس مسئلہ میں چار اقوال ہیں:

۱- ایک قول کے مطابق ایسی عورت پر صرف ایک بار طہارت کرنا واجب ہے۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر ہر نماز کے لیے طہارت ضروری ہے۔

۳- تیسرے قول کے مطابق اس پر دن رات میں تین بار طہارت ضروری ہے۔

۴- چوتھا قول یہ ہے کہ اس پر دن رات میں ایک بار طہارت ضروری ہے۔

پہلے قول کے مطابق اس پر صرف ایک بار پاک ہونا ضروری ہے اور یہ وہ موقع ہے جب اسے معلوم ہوجائے کہ حیض کی مدت ختم ہوچکی ہے اور اسے حیض کے ختم ہوجانے کا علم اس وقت ہوگا جب وہ خون حیض ختم ہونے کی کوئی علامت دیکھ لے گی، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

پھر وہ فقہاء جو صرف ایک بار طہارت ضروری خیال کرتے ہیں ان میں پھر دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ کے خیال میں ایسی عورت پر ہر نماز کے لیے نیا وضو کرنا واجب ہے۔ جب کہ دوسرے گروہ کے نزدیک ہر نماز کے لیے نیا وضو واجب نہیں بلکہ مستحب ہے یعنی اگر چاہے تو ہر نماز کے لیے نیا وضو کرے اور اگر چاہے تو ایک ہی وضو سے سب نمازیں ادا کرے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھی صرف ایک بار طہارت واجب خیال کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف علاقوں کے اکثر فقہاء کی رائے بھی یہی ہے۔ اور ان میں سے اکثر کے نزدیک اس پر واجب ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے نیا وضو کرے لیکن بعض کے نزدیک ہر نماز کے لیے نیا وضو واجب نہیں بلکہ مستحب ہے اور یہ امام مالک کا مسلک ہے۔

دوسرا قول وہی ہے کہ جس عورت کو خون استحاضہ آتا ہو وہ ہر نماز کے لیے غسل کرے۔

تیسرا قول جس کے مطابق دن رات میں تین بار غسل واجب ہے ان کے نزدیک ایسی عورت ظہر کی نماز کو عصر کے وقت تک مؤخر کرے۔ پھر غسل کر کے دونوں نمازیں یعنی ظہر اور عصر کو جمع کر کے پڑھے۔ اسی طرح مغرب کی نماز کو اتنا مؤخر کرے کہ مغرب کی نماز کا آخری وقت ہوجائے اور عشاء کی نماز کا اول وقت شروع ہوجائے اور دوبارہ غسل کر کے یہ دونوں نمازیں جمع کر کے پڑھے۔ اور تیسرا غسل فجر کی نماز کے لیے کرے۔ اس طرح ان

لوگوں نے دن رات میں تین بار طہارت یعنی غسل کرنا واجب قرار دیا ہے۔

چوتھے قول کے مطابق دن رات میں ایک بار غسل کرنا واجب ہے۔ لیکن جن کا یہ قول ہے ان میں سے کچھ علماء نے اس غسل کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا۔ یہی قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ پھر ان میں سے بعض فقہاء کے نزدیک ایسی عورت کے لیے ضروری ہے کہ ایک ظہر کی نماز کے لیے غسل کرے پھر دوسرے دن بھی ظہر کی نماز کے وقت غسل کرے۔

فقہاء کے اختلاف کا سبب

اس مسئلہ میں علماء کے درمیان جو اختلاف ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو احادیث وار ہوئی ہیں ان میں بظاہر اختلاف ہے اور وہ کل چار حدیثیں ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث کی صحت پر سب کا اتفاق ہے اور تین کی صحت مختلف فیہ ہے۔

۱- پہلی حدیث جس کی صحت متفق علیہ ہے وہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیشؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ مجھے استحاضہ کا خون آتا ہے اور کبھی پاک نہیں ہوتی۔ یعنی خون رکتا ہی نہیں تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> لا... انما ذلك عرق و ليست بالحيضة فاذا اقبلت الحيضة فدعى الصلوة و اذا ادبرت فاغسلى عنك الدم و صلى. (بخاری و مسلم)
>
> ”نہیں نماز نہ چھوڑو کیوں کہ یہ کوئی رگ ہے، جس سے خون آرہا ہے۔ حیض کا خون نہیں ہے لہٰذا جن دنوں میں حیض کا خون آئے نماز چھوڑ دو اور جب حیض ختم ہوجائے، ان دنوں اپنے جسم سے خون دھوکر نماز پڑھ لیا کرو۔“

اور بعض روایات میں اتنا مزید ہے کہ (و توضئی لکل صلوۃ) اور ہر نماز کے لیے وضو کرلیا کرو۔ لیکن یہ اضافہ بخاری و مسلم کی روایتوں میں نہیں ہے۔ البتہ ابوداؤد کی روایت میں ہے اور بعض علماء حدیث نے اس اضافے کو صحیح قرار دیا ہے۔

۲- دوسری حدیث بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ام حبیبہؓ بنت جحش جو کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی بیوی تھیں انہیں استحاضہ کا خون آنے لگا تو انہیں نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ہر نماز کے لیے غسل کیا کریں۔

۳- تیسری حدیث امام ابوداؤد نے روایت کی ہے اور اس حدیث کو ابو محمد بن حزم نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں ہے: حضرت اسماءؓ بنت عمیس بیان کرتی ہیں کہ فاطمہؓ بنت ابی حبیش کو استحاضہ کا خون آنے لگا تو نبی کریم ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ وہ ظہر اور عصر کی نمازوں کے لیے غسل کیا کریں اور فجر کی نماز کے لیے بھی غسل کیا کریں اور ان کے درمیان (اگر کوئی نماز پڑھنا چاہیں تو) وضو کرلیا کریں۔

۴- چوتھی حدیث حضرت حمنہؓ بنت جحش کی ہے جس میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں اختیار دیا تھا کہ جب وہ محسوس کریں کہ اب حیض کا خون ختم ہوگیا ہے تو اگر چاہیں تو دن میں صرف ایک بار غسل کرلیا کریں۔ جیسا کہ حضرت اسماء بنت عمیس کی حدیث میں مذکور ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حدیث اسماء میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دن رات میں تین بار غسل کرنا واجب ہے جب کہ اس حدیث میں اختیار دیا گیا ہے کہ چاہیں تو تین بار غسل کرلیا کریں۔ یعنی پانچ نمازوں کے لیے دن رات میں ایک بار غسل کرنا تو واجب ہے اور تین بار غسل کرنا ان کی اپنی مرضی پر منحصر ہے یعنی چاہیں تو زیادہ بار غسل کرلیا کریں۔

جس عورت کو استحاضہ کا عارضہ ہو وہ کیا طریقہ اختیار کرے

امام نوویؒ نے المنہاج میں لکھا ہے کہ استحاضہ ایک ایسا عارضہ ہے جس میں عورت مسلسل ناپاک رہتی ہے جیسا کہ سلسل البول (مسلسل قطرہ قطرہ پیشاب آنا) میں مریض مسلسل ناپاکی کی حالت میں مبتلا رہتا ہے لہٰذا اس عارضہ کی وجہ سے نماز اور روزہ منع نہیں ہوتا بلکہ جسے استحاضہ کی بیماری ہو وہ یہ کرے کہ وضو سے پہلے اپنی شرم گاہ کو دھولے اور مضبوطی سے کس کر

لنگوٹ باندھ لے اور ہر نماز کا وقت شروع ہونے پر وضو کرے اور جلدی نماز پڑھے۔ گویا ہر فرض نماز کے لیے نیا وضو کرنا فرض ہے اور صحیح قول کے مطابق ہر نماز کے لیے نئی لنگوٹ باندھنا بھی فرض ہے۔

استحاضہ میں وہ امور منع نہیں جو حیض میں منع ہیں

وہ امور جو حیض و نفاس کی حالت میں منع ہیں استحاضہ کی صورت میں منع نہیں ہیں۔ مثلاً نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور چھونا، مسجد میں داخل ہونا، اعتکاف بیٹھنا، بیت اللہ کا طواف کرنا اور جماع کرنا وغیرہ، جن کی تفصیل ''حدث اکبر'' کے باب میں بیان ہوگی، الغرض مذکورہ بالا امور کے لیے مستحاضہ کو غسل کرنا ضروری نہیں ہے، اگرچہ بعض امور وضو کے بغیر نہیں کیے جاسکتے۔ اس مسئلہ کی صحیح نوعیت یہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان دو مسئلوں کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ نماز کے لیے طہارت کی کیا صورت ہے؟ اور دوسرا یہ کہ ایسی حالت میں جماع کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ فقہاء اور اہل علم کا مسلک یہ ہے کہ اگرچہ خون زیادہ مقدار میں آرہا ہو مذکورہ بالا تمام امور اس کے لیے جائز ہیں۔ یہ قول امام مالکؒ سے ابن وہبؒ نے روایت کیا ہے۔

گویا وہ عورت جسے استحاضہ کا عارضہ ہو معذور ہے اور اس شخص کی مانند ہے جسے مسلسل دست آرہے ہوں یا قطرہ قطرہ پیشاب جاری ہو یا مسلسل نکسیر آنے کا عارضہ ہو یا ایسا زخم ہو جس میں سے ہر وقت خون رِستا رہتا ہو۔

مستحاضہ سے جماع کا جواز و عدم جواز

استحاضہ والی عورت سے جماع کے بارے میں تین مختلف اقوال ہیں:

☆ علماء کی ایک جماعت نے ایسی عورت سے جماع کو جائز کہا ہے اور مختلف علاقوں کے علماء کا مسلک بھی یہی ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ، سعید بن المسیبؒ اور متعدد تابعین سے بھی مروی ہے۔

☆ لیکن کچھ علماء کا خیال ہے کہ ایسی حالت میں جماع ناجائز ہے۔ یہی قول حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اور امام نخعیؒ اور حکمؒ کا بھی یہی قول ہے۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ ہر خون گندگی ہے لہٰذا اس کو جسم اور کپڑے پر سے دھونا واجب ہے لہٰذا خون حیض کا آ رہا ہو یا استحاضہ کا، دونوں صورتوں میں مباشرت کرنا یکساں ہے۔ کیوں کہ دونوں خون نجس ہیں۔ باقی رہا استحاضہ کی حالت میں نماز کا جواز تو یہ رخصت ہے جو سنت سے ثابت ہے۔ جیسے سلسل البول کا مریض نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن یہ قول مسلک جمہور کے خلاف ہے۔

☆ علماء کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ خاوند کے لیے ایسی حالت میں جماع کی اجازت صرف اس صورت میں ہے، جب بیماری بہت لمبی ہو جائے۔ یہ قول امام احمد بن حنبل کا ہے۔(۱)

اختلاف کا سبب

اس مسئلہ میں علماء کے درمیان اختلاف کا سبب یہ ہے کہ مستحاضہ کے لیے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا نماز کا جواز محض رخصت کا حکم رکھتا ہے کیوں کہ نماز ایک ایسا فرض ہے جو کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتا یا نماز پڑھنا اس لیے جائز کر دیا گیا ہے کہ استحاضہ والی عورت حکماً پاک ہوتی ہے؟

چناں چہ جن علماء نے اسے رخصت قرار دیا ہے ان کے نزدیک ایسی عورت سے جسے خون استحاضہ آ رہا ہو اس کے خاوند کے لیے جماع کرنا جائز نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس

---

(۱) بداية المجتهد و نهاية المقتصد لابن رشد، جلد اول

حالت میں عورت کو حکماً پاک قرار دیا ہے انہوں نے جماع کو جائز رکھا ہے۔

بہرحال یہ ایک مسئلہ ہے جس کے بارے میں شریعت کا کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے۔

☙ ❧

غسل

غسل کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَقْرَبُوْا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُباً اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا وَ اِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُم مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْداً طَیِّباً فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوّاً غَفُوْراً○ (النساء:۴۳)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک غسل نہ کرلو۔ الا یہ کہ راستے سے گزرتے ہو اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو، یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔ بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔‘‘

مندرجہ ذیل پانچ امور سے غسل واجب ہو جاتا ہے

۱- حیض یا نفاس کا خون آنے سے۔

۲- ولادت سے خواہ بغیر خون کے ہو۔

۳- موت سے، بشرطے کہ مرنے والا مسلمان ہو۔

۴- کافر کے اسلام قبول کرنے سے اگر وہ حالت جنابت میں ہو۔

۵- جنابت سے۔

ولادت

بچہ کی ولادت سے، خواہ بغیر خون کے ہو، غسل واجب ہو جاتا ہے۔ جمہور فقہاء کا مسلک یہی ہے صرف حنبلیوں کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک اگر ولادت خون کے بغیر ہو تو غسل فرض نہیں ہوتا۔

جنابت

جنابت دو صورتوں میں ہوتی ہے:

۱- جماع: خواہ بغیر انزال کے ہو۔

۲- منی کا شہوت سے خارج ہونا خواہ احتلام سے خارج ہو یا بوس و کنار سے، یا دیکھنے سے یا تصور کرنے سے یا اسی قسم کے کسی اور سبب سے خارج ہو، جنابت اور اس سے وجوب غسل کے معاملہ میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔

اس سے پہلے یہ حدیث بیان ہو چکی ہے کہ حضرت ام سلیمؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ حق بات میں شرم اور باک محسوس نہیں کرتا۔ کیا اگر عورت کو احتلام ہو تو اس پر بھی غسل واجب ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (نعم اذا رأت الماء) ”ہاں اگر منی خارج ہو۔“ یہ گفتگو سن کر حضرت ام سلمہؓ نے کہا کہ کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تربت یداك، فبم یشبھا ولدھا“ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں، اگر نہیں ہوتا تو پھر بچہ اس سے مشابہ کیوں کر ہوتا ہے؟

نبی کریمؐ کی غسل کی کیفیت

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب

غسل فرماتے تو سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوتے پھر اپنے دائیں ہاتھ میں پانی لے کر بائیں ہاتھ پر ڈالتے۔ پھر اپنی شرم گاہ دھوتے پھر وضو کرتے جیسے نماز کے لیے کیا جاتا ہے پھر چلو میں پانی لے کر پانی سے تر انگلیوں کو بالوں کی جڑوں تک پہنچاتے اور جب محسوس کرتے کہ بال تر ہوگئے ہیں تو تین چلو پانی سر پر ڈالتے اس کے بعد پورے جسم پر پانی بہا لیتے۔

بخاری و مسلم ی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ..... پھر اپنے ہاتھوں سے بالوں میں خلال کرتے حتی کہ جب آپ محسوس کرتے کہ جلد تر ہوگئی ہے تو اپنے اوپر تین مرتبہ پانی ڈال لیتے۔

اور بخاری و مسلم کی ایک اور روایت میں ..... جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس طرح بیان ہوا ہے کہ نبی کریمؐ جب غسل جنابت کرنا چاہتے تو پانی کا برتن طلب فرماتے اور اس میں سے اپنے چلو میں پانی لے کر پہلے سر کا دایاں حصہ دھوتے پھر بایاں حصہ دھوتے اس کے بعد اپنے دونوں چلووں سے سر مبارک پر پانی ڈال لیتے۔

نیز حدیث کی مشہور چھ کتابوں کے مرتبین نے روایت کیا ہے کہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے غسل کے لیے پانی کا اہتمام کیا تو آپ نے اپنے دائیں ہاتھ سے پانی ڈال کر بائیں ہاتھ سے اپنی شرم گاہ کو دھویا، پھر اپنے ہاتھ کو زمین سے رگڑا، کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا اس کے بعد چہرے اور ہاتھوں کو دھویا پھر تین بار اپنے سر کو دھویا اور سارے جسم پر پانی بہا لیا۔ پھر اس جگہ سے دور ہٹ کر آپ نے اپنے دونوں پاؤں دھولیے، حضرت میمونہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے آپ کو رومال پیش کیا لیکن آپ نے اسے قبول نہ فرمایا اور اپنے دست مبارک سے پانی پوچھتے رہے۔

عورت کے لیے غسل کا طریقہ

عورت اور مرد کے غسل میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ عورت کے سلسلے میں یہ ہے کہ اس پر اپنی مینڈھیوں کو کھولنا واجب نہیں ہے بشرطے کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ

جائے۔لیکن بعض فقہاء عورت کے غسل جنابت اور غسل حیض و نفاس میں فرق کرتے ہیں۔ان کے نزدیک غسل جنابت میں عورت کے لیے مینڈھیاں کھولنا واجب نہیں ہے جب کہ حیض و نفاس سے پاک ہوکر غسل کرتے وقت مینڈھیاں کھولنا واجب ہے۔

امام مسلمؒ، امام احمدؒ اور امام ترمذیؒ نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے دریافت کیا یا رسول اللہ! میں اپنے سر کے بالوں کو مینڈھیاں گوندھتی ہوں تو کیا غسل جنابت کے وقت میرے لیے ان کا کھولنا ضروری ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

انما یکفیك ان تحثی علیه ثلاث حثیات من الماء تفضی علیٰ سائر جسدك فاذا انت قد طهرت.

”تمہارے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنے سر پر تین چلو پانی ڈال لو جو تمہارے پورے جسم پر پھیل جائے۔بس اس کے بعد تم پاک ہو۔“

اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے حیض کے بعد کا غسل کرنے کے سلسلے میں حکم دیا کہ: انقضی شعرك و اغتسلی ”اپنے بال کھولو اور غسل کرو۔“ (یہ حدیث ابن ماجہؒ نے صحیح سند سے روایت کی ہے)۔

عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کو اطلاع ملی کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عورتوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ غسل کرتے وقت اپنے سر کی چوٹیاں کھولیں تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا: تعجب ہے کہ ابن عمرؓ عورتوں کے لیے غسل کرتے وقت سر کے بالوں کا کھولنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ حکم کیوں نہیں دیتے کہ عورتیں غسل کرتے وقت اپنا سر منڈوالیا کریں۔ حالاں کہ میں اور نبی کریم ﷺ ایک ہی برتن میں سے پانی لے کر غسل کیا کرتے تھے اور میں صرف اتنا کرتی تھی کہ اپنے سر پر تین چلو پانی ڈال لیتی تھی (یہ حدیث امام مسلمؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے روایت کی ہے)۔

عورت کے لیے مستحب ہے کہ جب وہ حیض یا نفاس کا غسل کرے تو روئی یا اسی قسم کی کسی اور چیز کا ایک ٹکڑا لے اور اس میں مشک یا کوئی اور خوشبو لگا کر اسے ان سب مقامات پر

پھیر لے جہاں جہاں خون لگتا ہے تاکہ خون کی بدبو دور ہو جائے اور جسم خوشبو دار ہو جائے۔

ترمذی کے سوا باقی پانچوں محدثین نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت یزیدؓ نے نبی کریم ﷺ سے غسل حیض کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

تاخذ احداکن ماء ھا و سدرتھا فتطھر فتحسن الطھر ثم تصب علی راسھا فتدلکه دلکا شدیدا حتی یبلغ شئون رأسھا ثم تصب علیھا الماء ثم تاخذ قرصة ممسکة فتطھر بھا

''عورت کو چاہیے کہ پانی اور بیری وغیرہ کے پتوں سے پہلے خود کو خوب اچھی طرح پاک صاف کرے۔ پھر سر پر پانی ڈال کر خوب ملے حتی کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد اپنے اوپر پانی ڈال لے پھر روئی یا کپڑے کا ایک ٹکڑا لے جس میں خوشبو لگی ہو اور اس سے خود کو پاک کر لے۔''

حضرت اسماء نے پوچھا: اس سے کس طرح پاک کرے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (سبحان الله! تطھری بھا) سبحان اللہ! (اتنی بات بھی نہیں سمجھتیں) بس اس سے پاک کرلو، یہ کیفیت دیکھ کر حضرت عائشہؓ نے چپکے سے کہا: اسے اس مقام پر پھیرلو جہاں خون کا نشان ہو۔'' پھر حضرت اسماءؓ نے آپ سے غسل جنابت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

تاخذی ماء ك فتطھرین فتحسنین الطھور او ابلغی الطھور ثم تصب علی رأسھا فتدلکه حتی یبلغ شئون رأسھا ثم تفیضی علیھا الماء.

''پانی لے کر پہلے اس سے طہارت کرو اور اچھی طرح دھوؤ۔ پھر سر پر پانی ڈال کر ملو کہ پانی بالوں کی جڑ تک پہنچ جائے پھر اپنے سارے بدن پر پانی ڈال لو۔''

حضرت عائشہؓ نے کہا: انصار کی عورتیں کتنی اچھی ہیں کہ انہیں دین کے مسائل سمجھنے میں شرم مانع نہیں ہوتی۔ اور نبی کریم ﷺ نے جو ارشاد فرمایا کہ اپنے آپ کو خوب اچھی طرح پاک صاف کرو اس سے مراد وضو ہے یعنی خوب اچھی طرح وضو کرے۔

غسل کے ارکان

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شرعی غسل دو باتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ۱- نیت ۲- پورے جسم اور بالوں پر پاک پانی ڈالنا۔

۱- نیت

نیت کے بارے میں یہ ہے کہ احناف کے سوا جمہور فقہاء نے نیت کو غسل کا رکن شمار کیا ہے کیوں کہ نیت ہی سے عادت اور عبادت میں امتیاز ہوتا ہے اور نیت محض دل کا عمل ہے، چناں چہ دل میں نیت کر لینا کافی ہے لیکن اگر زبان سے بھی کہہ دیا جائے کہ میں غسل جنابت کی نیت کرتی ہوں یا حدث اکبر سے پاک ہونے کی نیت کرتی ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

نیت کے سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ جسم کا پہلا عضو دھوتے وقت نیت کرے لیکن اگر کچھ دیر پہلے ہی نیت کر لے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

حنفیوں کے نزدیک نیت سنت ہے غسل کا رکن نہیں ہے۔

۲- پورے جسم اور بالوں پر پاک پانی ڈالنا

غسل کے صحیح ہونے کے لیے واجب ہے کہ پورے جسم پر ایک بار پاک پانی ڈالا جائے اور جہاں تک بغیر وقت کے پہنچانا ممکن ہو پانی پہنچایا جائے۔

اس رکن پر مفصل گفتگو کے لیے درج ذیل امور بیان کرنا ضروری ہیں:

الف: غسل کے وضو کی کیفیت

غسل صحیح ہونے کے لیے شرط ہے کہ غسل کرنے والا وضو کے تمام فرائض و ارکان ادا کرے۔ مثلاً نیت کرنا، پورے چہرے کو دھونا، دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھونا، سر کا مسح کرنا،

دونوں پیروں کو ٹخنوں تک دھونا اور دھوتے وقت مذکورہ بالا ترتیب کو ملحوظ رکھنا یعنی پہلے چہرہ پھر دونوں ہاتھ کہنیوں تک، پھر سر کا مسح اور پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک، اسی ترتیب سے دھونا اور تسلسل کے ساتھ دھونا، یعنی یہ درست نہیں کہ ایک عضو کو دھو کر چھوڑ دیا جائے اور پھر کچھ دیر کے بعد دوسرے عضو کو دھویا جائے۔

احناف میں اکثر علماء کا خیال ہے کہ غسل کرنے والا جب وضو کرے تو باقی اعضاء کو دھولے مگر پاؤں اس وقت نہ دھوئے بلکہ پہلے پورے بدن پر پانی ڈال لے اس کے بعد پاؤں دھوئے جیسا کہ ام المومنین حضرت میمونہ کی حدیث میں نبی کریم ﷺ کے غسل کی کیفیت بیان ہوئی ہے۔

لیکن بعض علماء احناف کا خیال ہے کہ پاؤں بھی پہلے ہی دھولیے جائیں تاکہ وضو مکمل ہو جائے، انھوں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں نبی کریم ﷺ کے غسل کی کیفیت بیان ہوئی ہے۔ چناں چہ ہدایہ میں ہے کہ ”پھر نماز کا وضو کرے البتہ اپنے پاؤں اس وقت نہ دھوئے بلکہ بعد میں دھوئے لیکن اگر کسی تختے پر بیٹھ کر وضو کیا ہے تو پھر مؤخر نہ کرے بلکہ اسی وقت دھولے۔“

اور ”البحر الرائق“ میں ہے کہ ”پیروں کو پہلے یا بعد میں دھونے کے جواز یا عدم جواز میں اختلاف نہیں ہے بلکہ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ پہلے دھونا افضل ہے یا بعد میں دھونا؟ شافعیوں کے نزدیک بھی دونوں امر (یعنی پہلے دھونا اور بعد میں دھونا) جائز ہیں اور اختلاف محض اس بات میں ہے کہ دونوں میں سے اولیٰ اور بہتر کیا ہے؟ البتہ دونوں طریقوں سے سنت ادا ہو جاتی ہے۔

ب- بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا

غسل جنابت میں سارے بدن کو پانی سے تر کرنا واجب ہے۔ اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، اس لیے کہ اس کے بارے میں حضرت علیؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ حضرت علیؓ

بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ:

من ترك موضع شعرة من جنابة لم يصبها الماء فعلى الله به كذا و كذا من النار.

''جس نے غسل جنابت کرتے وقت بال برابر جگہ بھی ایسی چھوڑ دی کہ اس تک پانی نہ پہنچا تو اللہ تعالیٰ اسے اس طرح اور اس طرح آگ کا عذاب دے گا۔'' (یہ حدیث امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کی ہے)۔

اور حیض و نفاس کا غسل بھی غسل جنابت کی طرح ہے:

بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانے کے بارے میں فقہی مسالک کا نقطۂ نگاہ

حنفیوں کے نزدیک اگر عورت کے بالوں کی مینڈھیاں گندھی ہوئی ہوں اور غسل کرتے وقت پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے تو اس پر مینڈھیوں کا کھولنا واجب نہیں ہے، البتہ مینڈھیوں کو پانی سے تر کرنا واجب ہے لیکن اگر بال گندھے ہوئے نہ ہوں تو پانی بالوں کی جڑوں میں اور ان کے اوپر سب جگہ اندر اور باہر پہنچانا واجب ہے۔ اگر عورت کے سر پر خوشبو وغیرہ کا کوئی ایسا لیپ لگا ہوا ہو جو بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچنے میں مانع ہو تو اس لیپ کا اتارنا واجب ہے۔

حنبلیوں کے نزدیک حیض اور نفاس کے غسل میں گندھے ہوئے بالوں کا کھولنا واجب ہے لیکن غسل جنابت میں بالوں کو کھولنا واجب نہیں اس لیے کہ بار بار بالوں کو کھولنا باعث تکلیف ہے جب کہ حیض و نفاس کے غسل میں جو طویل وقفہ کے بعد ہوتا ہے، یہ علت موجود نہیں۔

شافعیوں کے نزدیک غسل میں بالوں کو اوپر اور نیچے سے اچھی طرح دھونا واجب ہے، بال گھنے ہوں یا ہلکے۔ اور اگر گندھے ہوئے بالوں کو کھولے بغیر ان کے اندر کی طرف پانی پہنچانا ممکن نہ ہو تو انہیں کھولنا واجب ہے اور اس مسئلے میں ان کے نزدیک مرد اور عورت کے

بارے میں یکساں حکم ہے، البتہ جو بال گوندھے بغیر قدرتی طور پر گھونگھریالے ہوں اور ان میں پانی پہنچنا مشکل ہو تو ایسے بال اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور ان کی جڑوں تک پانی پہنچانا واجب نہیں ہے۔

مالکیوں کے نزدیک بالوں کے نیچے کھال تک پانی پہنچانا واجب ہے، خواہ بال گھنے ہوں یا چھدرے اور خواہ گندھے ہوئے ہوں یا کھلے ہوئے اور اگر گندھی ہوئی مینڈھیاں بہت کسی ہوئی ہوں خواہ و دھاگے کے ساتھ گوندھی گئی ہوں یا بغیر دھاگے کے تو ان کا کھولنا واجب ہے لیکن اگر زیادہ کسی ہوئی نہ ہوں تو کھولنا واجب نہیں صرف ان کو اکٹھا کر کے دھونا اور ہلانا کافی ہے تاکہ پانی نیچے تک پہنچ جائے۔ لیکن اگر چوٹی تین یا زیادہ ڈوروں سے گوندھی گئی ہو تو اس کا کھولنا واجب ہے۔ مالکیوں کے متاخرین نے سابقہ حکم سے ایسی دلہن کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جس کے بالوں کو خوشبو اور روغن وغیرہ سے آراستہ کیا گیا ہو وہ کہتے ہیں کہ ایسی دلہن کے لیے سر دھونا فرض نہیں ہے بلکہ وہ اگر صرف سر کا مسح کر لے تو کافی ہے کیوں کہ دھونے کی صورت میں مال کا نقصان ہے بلکہ اگر اس کے پورے جسم پر خوشبو کا لیپ ہو تو وہ تیمّم کر لے۔[1]

اور یہ حکم چوں کہ دلہن کے بارے میں ہے لہٰذا یہ استثنائی رخصت صرف عورت کے لیے ہے اور وہ بھی غسل جنابت کے معاملے میں ہے کہ وہ سر نہ دھوئے بلکہ صرف مسح کر لے اور محض اس مدت کے لیے ہے جب تک اس پر بالعموم دلہن کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہو اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عادتاً اور طبعاً عورت بناؤ سنگھار بالخصوص بالوں کو تزئین کی زیادہ خواہش مند ہوتی ہے لہٰذا دفع حرج اور اس کے مال کو ضیاع سے بچانے کی خاطر اسے غسل میں سر نہ دھونے کی اجازت دی گئی ہے تاکہ اس کی مشکل آسان ہو جائے۔ جیسا کہ شریعت نے عبادات کے معاملہ میں معذور لوگوں کو سہولت دی ہے یا موزے پہننے والوں یا ایسے لوگوں کے لیے جنھوں نے ہڈی جوڑنے کی چپنی باندھ رکھی ہو، آسانی پیدا کرنے کی غرض سے مسح جائز کر دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، ۱: ۶۰، مطبوعہ دار الشعب

و ما جعل علیکم فی الدین من حرج (الحج:۷۸)

''اور اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا۔''

لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہ استثناء کی رخصت صرف ضرورت کی بنا پر ہے اور ضرورت کو ضرورت کی حد تک ہی محدود رہنا چاہیے۔(۱)

لیکن مالکیوں کے علماءِ متاخرین نے دلہن کے لیے غسل میں سر پر مسح کر لینے اور تیمّم کر لینے کی رخصت کا جو فتویٰ دیا ہے اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کیوں کہ ایک تو جس دلیل کا انہوں نے سہارا لیا ہے وہ کمزور ہے، دوسرے یہ رائے صرف چند علماء کی ہے اور مسلک جمہور کے خلاف ہے۔

ج- پانی ہر اس مقام تک پہنچانا جہاں تک اس کا پہنچنا ممکن ہو

پورے بدن میں جہاں تک پانی کا پہنچنا بہ آسانی ممکن ہو وہاں تک ایک بار پہنچانا واجب ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بدن میں ذرا سا حصہ بھی ایسا رہ گیا جہاں پانی نہ پہنچ سکا تو غسل صحیح نہ ہوگا خواہ یہ حصہ کتنا ہی تھوڑا ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ بدن کے ان حصوں تک بھی پانی پہنچے جو گہرائی میں واقع ہیں مثلاً ناف کا گڑھا یا جسم میں کسی زخم کا مقام جو ٹھیک ہو چکا ہو لیکن اس کا گہرا نشان باقی ہو۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ ایسی جگہوں تک ٹیوب وغیرہ کے ذریعے سے پانی پہنچایا جائے۔

یہ بھی واجب ہے کہ ہر ایسی چیز کو جسم پر سے ہٹایا جائے جو جسم تک پانی کے پہنچنے میں حائل ہو مثلاً گندھا ہوا آٹا یا موم یا آنکھ کا چیپڑ وغیرہ اور اگر کوئی ایسی تنگ انگوٹھی پہن رکھی ہو جو جلد تک پانی پہنچنے میں مانع ہو تو اس کا اتارنا بھی واجب ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات

---

(۱) فتاویٰ شرعیہ و بحوث اسلامیہ للمفتی العلامۃ الشیخ محمد مخلوف ج۱/ص۲۲-۲۴ والفقہ علی المذاہب الاربعہ

واضح ہوگئی کہ ناخن پالش (نیل پالش) کی موجودگی میں غسل صحیح نہیں ہوگا لیکن مالکیوں کے نزدیک غسل کرنے والے پر یہ واجب نہیں کہ اگر اس نے کوئی ایسی تنگ انگوٹھی پہن رکھی ہے جس کا پہننا جائز ہے تو وہ بھی اتار دے اسی طرح غسل کے لیے عورت پر زیور اتارنا بھی واجب نہیں ہے۔

د- کان کی تنگ بالیوں کا حکم

عورت پر واجب ہے کہ غسل کرتے وقت کان میں پہنی ہوئی تنگ بالیوں کو حرکت دے تاکہ پانی اس سوراخ میں پہنچ جائے، جس میں بالی پہن رکھی ہے اور اگر کان کی لو میں بالی کا سوراخ ہو اور بالی نہ پہن رکھی ہو تو اس سوراخ کے اندر بھی پانی کا پہنچانا واجب ہے بشرطے کہ از خود پہنچ جائے۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے سوراخ کے اندر کوئی سلائی وغیرہ پھیری جائے۔ یہ حنفی نقطہ نگاہ ہے۔

شافعیوں کے نزدیک بالی وغیرہ کے سوراخ کے اندر پانی پہنچانا واجب نہیں ہے کیوں کہ ان کے نزدیک محض جسم کے ظاہری حصہ کو دھونا واجب ہے۔

مالکیوں کے نزدیک کان یا ناک کے سوراخ میں اگر ایسا زیور پہن رکھا ہے، جس کا پہننا جائز ہے، مثلاً عورت نے سونے یا چاندی کی بالی پہن رکھی ہے تو سوراخ کے اندر پانی کا پہنچانا ضروری نہیں لیکن اگر یہ زیور جو سوراخ میں پہنا ہے لوہے، تانبے یا پیتل کا ہے اور تنگ ہے تو اس کو حرکت دینا کہ پانی سوراخ کے اندر پہنچ جائے واجب ہے اور اگر کان یا ناک کے سوراخ میں زیور پہنا ہوا نہیں ہے اور خالی سوراخ موجود ہے تو اس کے اندر پانی پہنچانا واجب ہے۔

غسل کی سنتیں اور مستحبات

غسل کی سنتیں اور مستحبات بہت ہیں اور مختلف مسالک فقہ کے مابین ان کے

بارے میں اختلاف بھی ہے اور یہاں یہ گنجائش نہیں ہے کہ تفصیل سے سب کچھ بیان کیا جائے لہٰذا تفصیل کے لیے فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے جن میں یہ تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

غسل کی جن سنن و مستحبات کا بیان کرنا یہاں ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ نیت کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا یعنی غسل کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرے۔

۲۔ مسنون دعائیں: وضو کے سلسلے میں تو بعض دعائیں احادیث میں مذکور ہیں جن کا پڑھنا وضو کرتے وقت مستحب ہے لیکن غسل کے وقت کسی دعا کا پڑھنا مستحب نہیں۔ کیوں کہ غسل کرنے والا ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں نجس پانی بہتا ہے اور ذکر اللہ اور اسماء باری تعالیٰ کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو نجس مقامات مثلاً بیت الخلاء وغیرہ میں نہ پڑھا جائے۔

۳۔ جسم کے قابل ستر حصوں کو ڈھانپنا:

شافعیوں کے نزدیک غسل کرتے وقت جسم کے قابل ستر حصوں کو ڈھانپنا خواہ خلوت میں ہو مستحب ہے لیکن شرم گاہ کو لوگوں کی نظر سے چھپانا واجب اور کھولنا حرام ہے۔ اس سلسلے میں نص بھی وارد ہوئی ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔ چناں چہ ایک حدیث شریف میں بیان ہوا ہے کہ جو شخص اپنے جسم کے قابل ستر حصوں کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں کرتا اس پر مسلسل اللہ تعالی، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوتی رہتی ہے۔ (یہ حدیث مسند ابو حنیفہ میں ہے)۔

یہ حکم دین حنیف کے ان معاشرتی آداب میں شامل ہے، جو اس نے انسان کے اندر حیاء کا ملکہ پیدا کرنے کے لیے سکھائے ہیں۔ حیاء سراسر خیر ہے، نیز اس حکم کا مقصد فتنہ و فساد کے ذرائع کو روکنا ہے تاکہ انسانی عزت و آبرو ہر قسم کے فتور اور تذلیل سے محفوظ رہے اور اسلامی معاشرہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا حامل ہو۔

اسلام میں شرم گاہوں کی حفاظت کا اس قدر اہتمام کیا گیا ہے کہ نہ صرف مردوں اور

عورتوں کے لیے ایک دوسرے کے سامنے قابل ستر حصوں کا کھولنا اور دیکھنا ممنوع ہے بلکہ بلا ضرورت مرد کے لیے مرد کے سامنے اور عورت کے لیے عورت کے سامنے اپنی شرم گاہ کو کھولنا یا کسی دوسرے کی شرم گاہ پر نظر ڈالنا حرام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پہلے تو حمام میں جانے سے مطلقاً منع فرما دیا تھا۔ بعد ازاں صرف مردوں کو ایسا زیر جامہ پہن کر حمام میں جانے کی اجازت دی جو جسم کے باعث شرم حصوں کو بخوبی چھپا سکے اور عورتوں کو تو حمام میں جانے کی قطعاً اجازت نہیں دی سوائے اس کے کہ کسی عورت کو بیماری یا زچگی کی وجہ سے جانا پڑے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ حمام میں جانے والی عورت کے جسم کے باعث شرم حصے پوری طرح مستور ہوں حتی کہ عورت بھی عورت کے جسم کا وہ حصہ نہ دیکھ سکے جس پر نظر ڈالنا حرام ہے۔

۴۔ یہ بھی مستحب ہے کہ غسل کرتے وقت عورت روئی یا کپڑے کا ایک ٹکڑا لے اور اس میں مشک یا کوئی اور خوشبو لگا کر خون لگنے کے مقامات پر پھیر لے اور اگر روئی یا کپڑے کا ٹکڑا نہ ملے تو پانی سے صاف کرلے، لیکن یہ حکم ایسی عورت کے لیے ہے جس نے نہ تو حج یا عمرہ کا احرام باندھ رکھا، نہ وہ روزہ دار ہو اور نہ ہی شوہر کی موت کا سوگ منا رہی ہو۔

ہم گزشتہ صفحات میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث بیان کر چکے ہیں جو حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کے بارے میں ہے۔ اس حدیث میں اس مسئلہ کا ذکر موجود ہے۔

غسل کے متعلق مزید دو مسئلے

۱۔ حیض اور جنابت کے لیے ایک ہی غسل کافی ہے بشرطے کہ غسل کرتے وقت دونوں کا غسل کرنے کی نیت کرے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرئ ما نوی (متفق علیه)

''اعمال کا دار و مدار صرف نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے حاصل کرنے کی وہ نیت کرتا ہے۔''

۲- جنبی اور حائضہ عورت کے لیے غسل کیے بغیر بال منڈوانا، ناخن ترشوانا، بازار جانا اور اسی قسم کے دیگر امور بغیر کسی کراہت کے جائز ہیں، عطاءؒ کہتے ہیں کہ جنابت کی حالت میں انسان پچھنے لگوا سکتا ہے، ناخن ترشوا سکتا ہے اور سر منڈا سکتا ہے خواہ اس نے وضو بھی نہ کیا ہو۔[1] (بخاری)

حدث اکبر کی حالت میں جو امور منع ہیں

حدث اکبر سے مراد جنابت، حیض اور نفاس کی حالت ہے اور ولادت اگر بغیر خون کے ہو تب بھی وہ حدث اکبر کا باعث ہے۔

حدث اکبر کی حالت میں وہ سب باتیں منع ہیں جو حدث اصغر (بے وضو ہونے کی حالت) میں منع ہیں، اس کے علاوہ حدث اکبر کی حالت میں تلاوتِ قرآن کریم اور مسجد میں داخل ہونا بھی منع ہے۔ چناں چہ چاروں فقہی مسالک میں جنبی اور حیض و نفاس والی عورت کے لیے قرآن مجید کی تلاوت اور مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔

حدیث اکبر کے بارے میں فقہی احکام کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- تلاوتِ قرآن

☆ مالکیوں کے نزدیک جنابت کی حالت میں تلاوتِ قرآن جائز نہیں، الّا یہ کہ جزء کے طور پر استدلال کی خاطر تھوڑا سا تلاوت کرلیا جائے تو جائز ہے لیکن حیض اور نفاس والی عورت کے لیے خون آنے کی حالت میں تلاوت قرآن جائز ہے خواہ یہ عورت حیض یا نفاس کا خون آنے سے پہلے جنابت کی حالت میں ہو۔ لیکن جب خون آنا بند ہوجائے تو صحیح تر قول

کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت غسل کرنے سے پہلے جائز نہیں خواہ جنبی ہو یا نہ ہو، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خون بند ہوجانے کے بعد وہ غسل کر کے پاک ہونے پر قادر ہے لہٰذا اب غسل کیے بغیر اس کے لیے تلاوت قرآن جائز نہیں۔ باقی رہا قرآن مجید کو ہاتھ لگانا یا قرآن مجید کی کتابت تو یہ اگر سیکھنے اور سکھانے کی غرض سے ہوتو جائز ہے ورنہ نہیں۔

حنفیوں کے نزدیک جنابت کی حالت میں قرآن کی تلاوت حرام ہے لیکن استاد کے لیے جائز ہے کہ شاگرد کو ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے پڑھائے، اسی طرح بحالت جنابت کسی اہم کام کو شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھ سکتا ہے اور دعا کی غرض سے یا حمد وثنا کے طور پر کوئی چھوٹی آیت پڑھ سکتا ہے اور اس معاملہ میں حیض و نفاس والی عورت کے لیے بھی وہی احکام ہیں جو جنبی کے لیے ہیں۔

☆ شافعیوں کے نزدیک جنابت کی حالت میں قرآن مجید کی تلاوت خواہ ایک لفظ ہی کیوں نہ ہو حرام ہے بشرطے کہ تلاوت کا قصد ہو لیکن اگر ذکر کی غرض سے ہو یا بغیر ارادہ کے از خود زبان سے نکل جائے تو حرام نہیں۔ ذکر کی غرض سے پڑھنے کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھانا کھاتے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے یا سواری پر بیٹھتے وقت سُبحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ پڑھے جس طرح اس شخص کے لیے جسے پاکی حاصل کرنے کی کوئی چیز نہیں یعنی پانی اور مٹی دونوں دستیاب نہ ہوں تو اس کے لیے صرف اس نماز میں جس کا پڑھنا اس کے لیے بہ سبب ضرورت مباح ہے یعنی فرض نماز میں تلاوت قرآن جائز ہے۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک حدث اکبر کی حالت میں بغیر کسی عذر کے ایک چھوٹی آیت سے کم یا اتنی ہی مقدار میں کسی بڑی آیت کا حصہ تلاوت کرنا جائز ہے اور اس سے زیادہ کی تلاوت اس پر حرام ہے لیکن اسے ایسی دعا یا کوئی ایسا ذکر پڑھنے کی اجازت ہے جس کے الفاظ قرآن کے مطابق ہوں۔ مثلاً کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھ لے یا سوار ہوتے وقت سُبحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وغیرہ۔

۲- نماز اور مسجد میں داخل ہونا

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاۃَ وَأَنتُمْ سُکَارَی حَتَّیَ تَعْلَمُوا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُباً إِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتَّیَ تَغْتَسِلُوا (النساء:۴۳)

''جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ، نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک غسل نہ کرلو۔ الا یہ کہ راستہ سے گزرتے ہو۔''

اس آیت کی تفسیر حضرت ابن ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ کی ہے کہ نماز اور نماز کے مقامات یعنی مساجد کے قریب نہ جاؤ۔

نماز کے قریب نہ جاؤ تو واضح ہے لیکن مسجد کے قریب جانا یا اس میں داخل ہونا سو اس کے سلسلے میں فقہی اختلاف کی تفصیل درج ذیل ہے۔

☆ مالکیوں کے نزدیک جنبی کے لیے مسجد میں داخل ہونا، اس میں ٹھہرنا اور اس میں سے گزرنا یعنی ایک دروازے سے داخل ہوکر دوسرے دروازے سے نکلنا سب ناجائز ہے خواہ یہ اس کے گھر کی مسجد ہو البتہ اگر چور، درندے یا کسی ظالم کا ڈر ہو تو جنابت کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا اور ٹھہرنا جائز ہے لیکن اس صورت میں بھی تیمّم کر کے داخل ہو۔ اسی طرح اگر غسل کے لیے پانی حاصل کرنا ہو اور راستہ مسجد میں سے گزرتا ہو۔ مثلاً پانی یا پانی نکالنے کا سامان یعنی ڈول یا رسی وغیرہ مسجد میں سے گزرے بغیر حاصل ہونا ممکن نہ ہو یا گھر مسجد کے اندر کی جانب اور غسل کرنے کی غرض سے مسجد میں سے گزرنا پڑتا ہو تو ان سب صورتوں میں اسے چاہیے کہ تیمّم کر کے گزرے۔

اور ان تمام امور میں حیض و نفاس والی عورت کے لیے اور اس عورت کے لیے بھی جس کے ہاں بغیر خون کے ولادت ہوئی ہو وہی حکم ہے جو جنبی کے لیے بیان ہوا۔

☆ احناف کے نزدیک جنبی اور حیض و نفاس والی عورت کے لیے ضرورت کے بغیر مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں البتہ اگر کوئی عذر یا مجبوری ہو مثلاً غسل کے لیے پانی مسجد سے باہر نہ مل سکتا ہو یا گھر کا دروازہ مسجد میں ہو اور اسے بدلا نہ جا سکتا ہو اور کسی دوسرے گھر میں رہنا بھی اس کے لیے ممکن نہ ہو تو ایسی تمام صورتوں میں ضرورتاً مسجد میں سے گزرنا جائز ہے۔

مسجد کی چھت کا حکم ان تمام امور میں وہی ہے جو مسجد کا۔ البتہ جنبی کے لیے مسجد کے احاطہ میں داخل ہونا جائز ہے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک جنبی، حائضہ اور نفاس والی عورت کا مسجد میں سے گزرنا جائز ہے لیکن مسجد میں ٹھہرنا اور بار بار آنا جانا جائز نہیں اور یہ جواز بھی اس صورت میں ہے جب مسجد کے غلاظت سے آلودہ ہونے کا خطرہ نہ ہو۔ چناں چہ اگر کوئی شخص حدث اکبر کی حالت میں مسجد کے ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے تو جائز ہے لیکن ایک ہی دروازے سے اندر جانا اور پھر باہر آنا حرام ہے۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک جنبی اور حیض و نفاس والی عورت کا مسجد میں سے گزرنا اور ٹھہرے بغیر بار بار آنا جانا جائز ہے بلکہ اگر خون آ رہا ہو تب بھی گزرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ مسجد آلودہ نہ ہو۔ لیکن حائضہ اور نفاس والی عورت کا مسجد میں ٹھہرنا صرف اس صورت میں جائز ہے جب خون آنا بند ہو چکا ہو۔

۳- حیض و نفاس کی حالت میں روزہ

حیض و نفاس والی عورت کا روزے کی نیت کرنا اور روزہ رکھنا حرام ہے اگر وہ روزہ رکھے گی تو اس کا روزہ نہ ہوگا۔

حیض و نفاس کی وجہ سے رمضان کے جو روزے چھوٹ گئے ہوں ان کی قضا تو واجب ہے لیکن جو نماز نہ پڑھی جا سکی اس کی قضا واجب نہیں ہے کیوں کہ نماز دن میں پانچ بار پڑھی جاتی ہے، جس کو قضا کرنے میں مشقت ہے اور اسلام انسانوں کو مشقت میں ڈالنا نہیں

چاہتا جب کہ روزہ دن میں صرف ایک ہے اور اس کی قضا مشکل نہیں ہے۔

حضرت معاذہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ حائضہ پر روزوں کی قضا واجب ہے اور نماز کی قضا واجب نہیں؟ یہ سن کر حضرت عائشہؓ نے کہا: تو ''حروریہ'' (خارجی) تو نہیں؟ میں نے کہا: نہیں، میں صرف وجہ پوچھنا چاہتی ہوں، حضرت عائشہؓ نے کہا: وجہ کچھ بھی نہیں، بس جب حیض آتا تھا تو ہمیں روزوں کی قضا کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضا کا حکم نہیں تھا۔ (مسلم)

بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کی نماز کے لیے عید گاہ تشریف لے گئے اور عورتوں کے قریب سے گزرے تو آپ نے فرمایا:

یا معشر النساء تصدقن فانی اریتکن اکثر اھل النار

''اے گروہ خواتین! صدقہ دیا کرو کیوں کہ مجھے (شب معراج) دکھایا گیا کہ دوزخیوں میں تمہاری تعداد زیادہ ہے۔''

عورتوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایسا کیوں ہے؟

آپ نے فرمایا:

تکثرن اللعن و تکفرن العشیر ما رأیت من ناقصات عقل و دین اذھب للب الرجال الحازم من احداکن.

''تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو اور میں نے کسی ناقص عقل و دین کو تم سے بڑھ کر ایک باشعور اور محتاط شخص کی عقل و خرد کا دیوالیہ نکالنے والا نہیں پایا۔''

عورتوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم میں عقل اور دین کی کمی کیا ہے؟

آپ نے فرمایا:

الیس شھادة المرأة مثل نصف شھادة الرجل؟

’’کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف نہیں ہے؟‘‘

عورتوں نے کہا: ہاں ایسا ہی ہے۔

آپ نے فرمایا:

فذلك نقصان عقلها. اليس اذا حاضت لم تصل ولم تصم؟

’’سو یہ عورت کے کم عقل ہونے کی دلیل ہے اور کیا ایسا نہیں ہوتا کہ عورت کو جب حیض آتا ہے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے؟‘‘

عورتوں نے عرض کیا: یہ بھی درست ہے یا رسول اللہ!

آپ ﷺ نے فرمایا:

فذالك نقصان دينها

’’تو یہ عورت میں دین کی کمی ہے۔‘‘

۴۔ حیض کی حالت میں طلاق

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يآيها النبى اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن. (الطلاق:٦٥)

’’اے نبیؐ! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لیے طلاق دیا کرو۔‘‘

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ عورت کو اس وقت طلاق دی جائے جب وہ حالت طہر میں ہو اور اس سے جماع نہ کیا گیا ہو۔

فقہا نے اسی آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ طلاق کے شرعی یعنی مطابق سنت ہونے کے لیے یہ شرائط ضروری ہیں:

۱- یہ کہ ایک وقت میں ایک طلاق دی جائے۔

۲- طلاق اس طہر میں دی جائے جس میں جماع نہ کیا گیا ہو۔

۳- کوئی ضرورت طلاق کی متقاضی ہو۔

بنا بریں اگر خاوند نے ان شرائط کے خلاف عمل کیا اور بیوی کو ایک بار میں ایک سے زائد طلاقیں دے دیں یا حیض کی حالت میں طلاق دی یا طہر میں طلاق دی جس میں جماع کر چکا ہو یا بغیر ضرورت کے طلاق دی تو اس نے سنت کے خلاف کام کیا اور ایسی طلاق کو طلاق بدعی یا طلاق بدعت کہا جائے گا۔

گویا وہ طلاق جو شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف ہو، طلاق بدعت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ طلاق جو اس بنا پر طلاق بدع ہو کہ حیض یا نفاس کے دوران دی گئی ہو یا ایسے طہر میں دی گئی ہو، جس میں یا جس سے پہلے حیض میں خاوند نے اپنی اس بیوی سے جماع کیا ہو۔ ایسی طلاق از روئے شرع واقع ہو جاتی ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ ایسی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

شیعہ امامیہ، امام ابن حزم ظاہریؒ، امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیم کا مسلک یہ ہے کہ ایسی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ویسے یہ تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ایسی طلاق دینے والا شخص گناہ گار ہو گا لیکن یہ آخرت کا معاملہ ہے اور دنیوی احکام پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

پہلا گروہ جو اس بات کا قائل ہے کہ ایسی طلاق جس میں طلاق دینے والا خلاف سنت فعل کا ارتکاب کر رہا ہے واقع ہو جاتی ہے۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تھی۔ اس کا ذکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریمؐ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: (مره فليراجعها) ”اسے حکم دے دو کہ اس طلاق سے رجوع کر لے۔“

اور ظاہر ہے کہ مراجعت وقوع طلاق کے بعد ہی قابل عمل ہے یعنی اگر طلاق واقع نہ ہوچکی ہوتی تو آپ رجوع کرنے کا حکم نہ دیتے۔

اور یہ روایت بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عمرؓ سے اس طلاق کے بارے میں فرمایا کہ (ھی واحدۃ) یہ ایک طلاق ہوگی۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تھا کیا آپ اسے ایک طلاق شمار کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''ہاں۔''

چناں چہ ان تمام نصوص سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسی طلاق واقع ہوجاتی ہے کیوں کہ اسے ایک طلاق شمار کیا گیا تھا۔[۱]

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مرد کے لیے ایسی عورت کو جو اپنی عدت حیضوں کے حساب سے پوری کرے گی حیض یا نفاس کی حالت میں طلاق دینا اس لیے حرام کیا گیا ہے کہ اس طرح کی عدت کی مدت طویل ہوجائے گی اور اس وجہ سے اس طریقہ پر دی گئی طلاق عورت کے لیے تکلیف دہ ہوگی لیکن حرام ہونے کے باوجود اس طرح طلاق دینے سے چوں کہ طلاق واقع ہوجاتی ہے لہٰذا مرد کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اس طلاق سے رجوع کرے کیوں کہ یہ طریقہ خلاف سنت ہونے کی بنا پر حرام ہے۔

۵- حیض و نفاس کی حالت کے بعض دیگر مسائل

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: حیض کی حالت میں مجھے اپنی بیوی سے کیا کچھ جائز ہے؟ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:

لتشد علیھا ازارھا، ثم شانك باعلاھا

''اسے چاہیے کہ اپنا زیر جامہ کس کر باندھ لے، پھر تم اس سے اوپر اوپر جو چاہو کرسکتے ہو۔''

اور حضرت مسروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے

---

(۱) دیکھا جائے: الاحوال الشخصیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ، دوسرا ایڈیشن، ص ۲۹۵، ۲۹۶ از ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حیض کی حالت میں میرے لیے اپنی بیوی سے کیا کچھ جائز ہے؟ ام المومنین نے جواب دیا: جماع کے سوا سب کچھ جائز ہے۔

☆ شافعیوں اور حنفیوں کے نزدیک (حیض و نفاس کی حالت میں) ناف اور گھٹنوں کے مابین جو حصہ جسم ہے وہ اگر ننگا ہو تو اس سے لطف اندوزی حرام ہے البتہ اگر درمیان میں کپڑا حائل ہو تو جائز ہے۔ لیکن جماع کسی صورت میں جائز نہیں خواہ کوئی چیز درمیان میں ہی حائل کیوں نہ ہو یعنی کوئی خول وغیرہ چڑھا کر بھی جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ایسی حرکت کا ارتکاب کرے گا تو گناہگار ہوگا اور اسے چاہیے کہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ دے۔

☆ مالکیوں کے نزدیک ناف اور گھٹنے کے درمیان حصہ جسم سے لطف اندوزی بصورتِ جماع تو قطعاً جائز نہیں ہے لیکن جماع کے علاوہ جو کچھ ہے اس کے بارے میں مالکیوں کے دو قول مروی ہیں۔ قول مشہور یہ ہے کہ یہ بھی جائز نہیں خواہ درمیان میں کوئی چیز مثلاً کپڑا وغیرہ بھی کیوں نہ حائل ہو اور مالکیوں کے بعض علماء کے نزدیک قابل ترجیح قول یہ ہے کہ جماع کے علاوہ باقی سب امور جائز ہیں اور اس صورت میں بھی جائز ہیں کہ درمیان میں کوئی چیز یعنی کپڑا وغیرہ حائل نہ ہو۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک حیض و نفاس کی حالت میں ناف اور گھٹنے کے درمیانی حصہ جسم سے لطف اندوزی بغیر کپڑے وغیرہ کے بھی جائز ہے اور جو چیز مطلقاً منع ہے وہ حیض کی حالت میں جماع کرنا ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ایسی حرکت کر بیٹھے تو اس پر توبہ واجب ہے اور اسے چاہیے کہ اپنے اس گناہ کا کفارہ دے یعنی اگر قدرت ہو تو ایک دینار یا نصف دینار بطور صدقہ دے لیکن اگر استطاعت نہ ہو تو پھر یہ کفارہ ساقط ہو جائے گا۔

۶- حیض و نفاس کی حالت میں اعتکاف

حیض اور نفاس کی موجودگی میں اعتکاف جائز نہیں۔ عورت کے اعتکاف کے مسئلہ پر انشاء اللہ ہم باب الصوم میں گفتگو کریں گے۔

۷۔ حیض و نفاس کی حالت میں عورت سے قربت یعنی جماع

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الۡمَحِیۡضِ وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰی یَطۡهُرۡنَ فَاِذَا تَطَهَّرۡنَ فَاۡتُوۡهُنَّ مِنۡ حَیۡثُ اَمَرَکُمُ اللّٰهُ. (البقرة:۲۲۲)

''حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہوان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہوجائیں۔ پھر جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس جاؤ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق پاک ہونے سے پہلے مرد کے لیے عورت سے قربت یعنی جماع کرنا حرام ہے اور یہ طہارت یا تو غسل سے حاصل ہوگی اور اگر غسل ممکن نہ ہو تو تیمّم سے۔

الغرض حیض و نفاس کی حالت میں عورت سے جماع کرنا قرآن مجید اور سنت رسولؐ کے مطابق حرام ہے اور اجماعِ امت کی رو سے بھی حرام ہے۔ قرآن مجید کا حکم تو ہم اوپر پیش کر چکے ہیں، جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے پوری طرح واضح اور صریح ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے: اصنعوا کل شیء الا النکاح ''مباشرت کے سوا سب کچھ کر سکتے ہو۔'' اور دوسری حدیث میں نکاح کے بجائے جماع کا لفظ ہے۔ معنی کے لحاظ سے دونوں کا مفہوم ایک ہے (اس حدیث کو امام بخاریؒ کے سوا باقی پانچ اصحاب حدیث نے بیان کیا ہے۔

امام نوویؒ نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان یہ عقیدہ رکھے کہ حائضہ عورت سے مجامعت کرنا جائز ہے تو وہ کافر اور مرتد ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر حلال سمجھے بغیر بھول کر جماع کر بیٹھا یا اسے معلوم ہی نہ تھا کہ حیض کی حالت میں جماع حرام ہے یا اسے بیوی کے حائضہ ہونے کا پتہ نہ تھا اور جماع کرلیتا تو ایسی صورت میں نہ گناہگار ہوگا اور نہ کفارہ دینا لازم

آئے گا اور اگر جان بوجھ کر جماع کیا ہے جب کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ حیض آرہا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ ایسی حالت میں جماع حرام ہے اور یہ فعل کیا بھی اپنے اختیار سے یعنی کوئی جبر و اکراہ بھی نہ تھا تو ایسا شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس پر اپنے گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے۔

کیوں کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "فاعتزلوا" صیغہ امر ہے جو وجوب کا تقاضا کرتا ہے یعنی حکم دیا جا رہا ہے کہ حیض کی حالت میں حیض کے مقام خاص سے دور رہو اور اگر اس حالت میں جماع کیا جائے گا تو فعل حرام کا ارتکاب ہوگا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم کو پوری طرح واضح کرنے اور حکم کی تاکید کی غرض سے بعد ازاں فرمایا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ. (البقرۃ:۲۲۲)

"اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ۔"

اور اس کے ساتھ قرآن مجید نے اس حکم کی علت بھی بیان کر دی ہے اور فرمایا ہے "ھو اذی" یعنی یہ گندگی کی حالت ہے، جس سے سلیم الطبع انسان نفرت کرتے ہیں۔

نیز ایک روایت میں وارد ہوا ہے کہ حیض کی حالت میں جماع کرتے رہنے یعنی اگر کوئی مسلسل ایسا کرتا رہے تو اس کی اولاد کو جذام کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ نہ تو حیض کی حالت میں جماع کرنا چاہیے اور نہ حیض منقطع ہو جانے کے بعد غسل سے پہلے جماع کرنا چاہیے کیوں کہ حرمت نص صریح سے ثابت ہے اور بعض لوگوں کا قول ہے کہ ایسا کرنے سے جذام ہو جاتا ہے۔

اطباء کہتے ہیں کہ حیض کے دنوں میں رحم کی گردن کھل جاتی ہے تا کہ خون خارج ہو سکے اور بچہ دانی کی تیزابیت میں کمی آجاتی ہے، جس کے نتیجے میں جراثیم کے خلاف نظام

---

(۲) یہ تمہیدی بحث بیشتر استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے۔

تناسلی کی قوت مدافعت کمزور ہو جاتی ہے لہٰذا ان ایام میں رحم کے اندرونی معائنہ سے اور اندام نہانی میں انگلی داخل کرنے، جماع کرنے اور اسی قسم کے دیگر امور سے پرہیز لازم ہے۔ کیوں کہ اس طرح رحم کے اندر جراثیم داخل ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں سوزش رحم وغیرہ قسم کے امراض ہو سکتے ہیں، جن کے نتائج خطرناک ہوتے ہیں۔

اطباء یہ بھی کہتے ہیں کہ جب رحم میں پرانی سوزش ہو تو حیض کے خون میں ایسے خورد بینی جراثیم موجود ہوتے ہیں جو رحم کے غدود کی رطوبت کے ساتھ خارج ہوتے ہیں۔ یہ جراثیم اگرچہ پورا مہینہ ایک حالت میں موجود رہتے ہیں لیکن حیض کے ایام میں ان کی نشو ونما خوب ہوتی ہے اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور خون حیض میں شامل ہو جاتے ہیں اور اگر ایسی حالت میں جماع کیا جائے تو اس کے نتیجے میں مرد آتشک، سوزاک اور ایڈز جیسی مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔(۱)

قرآن مجید میں ارشاد ہے: "ھو اذی" اس کے ایک معنی تو نجاست اور گندگی ہیں اور دوسرے معنی ایذا اور بیماری کے ہیں چناں چہ مرد کا ایام حیض میں عورت سے جماع کرنا مرد عورت اور بچے سب کے لیے ایذا کا باعث ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا ارشاد کس قدر سچا ہے!

حیض کی حالت میں جماع پر نبی کریم ﷺ کی وعید

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حیض کی حالت میں عورت سے جماع کرنے پر سخت وعید سنائی ہے امام احمد، امام ترمذی اور امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

من اتی حائضا فقد کفر بما انزل علی محمد

"جس نے حائضہ عورت سے جماع کیا اس نے ان احکام کو ماننے سے انکار کیا جو (حضرت) محمد پر نازل کیے گئے ہیں۔"

---

(۱) فتاویٰ شرعیہ و بحوث اسلامیہ، ج۱، ص۲۰۔ مصنفہ شیخ حسنین مخلوف

اس حدیث میں کفر کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ جس نے حلال سمجھ کر اس فعل کا ارتکاب کیا وہ کافر ہوگیا یا پھر اس کی تعبیر یہ کی گئی ہے کہ آپ نے سخت ڈرانے یا دھمکانے کے لیے یہ فرمایا ہے کہ "وہ کافر ہوگیا۔"

اس شخص کے بارے میں جو بحالت حیض اپنی بیوی سے جماع کرتا ہے، شریعت کا حکم کیا ہے؟ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ وہ اللہ سے توبہ و استغفار کرے۔ اس کے علاوہ اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے ساتھی امام محمد بن حسن سے یہ قول مروی ہے کہ ایسا شخص نصف دینار صدقہ دے۔

امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں وہ حدیث بہت اچھی ہے جو عبد الحمید نے مقسمؒ کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"ایسا شخص ایک دینار یا نصف دینار صدقہ دے۔"

(یہ حدیث امام ابو داؤدؒ نے اپنی سنن میں درج کی ہے اور امام طبریؒ نے اسے پسند کیا ہے)۔

لیکن امام شافعیؒ کا قول جو آپ نے بغداد میں کہا تھا، یہ ہے کہ اگر یہ شخص ایسا نہ کرے یعنی صدقہ نہ دے تو کوئی گناہ نہیں۔

علمائے حدیث میں سے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ اگر ایسی حالت میں جماع کیا جب خون حیض آ رہا ہو تو ایک دینار صدقہ دے اور خون منقطع ہونے کے بعد جماع کیا تو نصف دینار صدقہ دے۔

امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے ایسی حالت میں جماع کیا کہ وہ حائضہ تھی تو وہ پانچ دینار صدقہ دے۔

ان تمام روایات واقوال کی سندیں اور تفصیل ابوداؤد اور دارقطنی وغیرہ میں مذکور ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: اگر کسی شخص نے اپنی حائضہ بیوی سے ایسی حالت میں جماع کیا جب سرخ خون آ رہا تھا تو وہ ایک دینار صدقہ دے اور اگر زرد خون آ رہا تھا تو نصف دینار صدقہ دے۔

ارشاد باری تعالیٰ "ولا تقربوھن حتی یطھرن" (اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہوجائیں) میں حتی یطھرن کا حقیقی مقصود کیا ہے؟

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد پانی سے غسل کرنا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف اندام نہانی کو دھونا ہے اور صرف دھولینے سے خاوند کے لیے جماع حلال ہوجائے گا خواہ حیض سے غسل نہ بھی کیا ہو۔

۸- حدثِ اصغر یا حدثِ اکبر کا ازالہ

حیض یا نفاس والی عورت خواہ وضو کرے یا جنابت یا حیض و نفاس کا غسل کرے جب تک خون بند نہیں ہوجاتا وہ پاک نہیں ہوسکتی۔

فطری مسنون طریقے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خمس من الفطرة: الختان والاستحداد و قص الشارب و تقليم الاظفار و نفت الابط (بخاری و مسلم و مسند احمد)

''پانچ چیزیں فطری سنتیں ہیں: (۱) ختنہ کرنا (۲) استرے کا استعمال یعنی پیڑو کے بال صاف کرنا (۳) مونچھیں کترنا (۴) ناخن تراشنا (۵) اور بغل کے بال نوچنا۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

عشر من الفطرة: قص الشارب و اعفاء اللحية و السواك و استنشاق الماء و قص الاظفار و غسل البراجم و نتف الابط و حلق العانة و انتفاض الماء (مسلم)

''دس باتیں فطری سنتیں ہیں: (۱) مونچھیں کترنا (۲) داڑھی بڑھانا (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی چڑھانا (۵) ناخن تراشنا (۶) جوڑوں (کانوں کا اندرونی حصہ ناک کے نتھنے اور کنج ران) کا دھونا (۷) بغل کے بال نوچنا (۸) پیڑو کے بال مونڈنا (۹) استنجا کرنا

راوی حدیث مصعبؒ کہتے ہیں کہ دسویں بات میں بھول گیا، البتہ میرا غالب گمان ہے کہ وہ کلی کرنا ہے۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو طہارت کو مقدس کام قرار دیتا ہے، صفائی کو محبوب رکھتا ہے اور حسن و جمال کا طالب ہے اور اسے یہ بات پسند ہے کہ اس کے ماننے والے کی ظاہری اور باطنی حالت پاکیزہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے فطری سنتوں کو اختیار کرنا مستحسن قرار دیا ہے۔

ان دو حدیثوں میں جن دو امور کا ذکر ہے اگر انسان ان کو اختیار کر لے تو وہ اس فطرت کے عین مطابق عمل کرنے والا ہو جاتا ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے اور جس کو اختیار کرنے کی خود اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ترغیب دی ہے اور ان کو فطری طور طریقوں کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے پسند فرمایا ہے تا کہ وہ ان پر عمل پیرا ہو کر اعلیٰ صفات کے حامل اور بہترین شکل وصورت کے مالک بن جائیں۔

فطرت سے مراد وہ قدیم طریقے ہیں، جن کو انبیائے کرام نے اختیار کیا اور تمام شریعتوں کا ان پر اتفاق ہے۔ گویا یہ ایسے فطری امور ہیں، جن پر تمام سلیم الفطرت انسان کاربند ہوتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ فطرت سے مراد دین الٰہی ہے۔

مذکورہ بالا حدیثوں کی روشنی میں بعض علماء نے فطری خصلتیں پانچ شمار کی ہیں اور بعض نے دس لیکن جن علماء نے ان دو حدیثوں میں بیان کردہ تمام امور کو جمع کر لیا ہے۔ انھوں نے فطری خصلتوں کی تعداد گیارہ بتائی ہے۔ ہم اس مقام پر ان میں سے چند امور کا ذکر کریں گے، جن کو جاننا خواتین کے لیے ضروری ہے۔

پیڑو کے بال صاف کرنا

حدیث میں لفظ ''استحداد'' وارد ہوا ہے، جس کے لفظی معنی لوہا استعمال کرنے کے ہیں۔ لوہا استعمال کرنے سے مراد استرے سے کام لینا ہے یعنی بال مونڈنے کے لیے استرا استعمال کرنا۔ دوسری حدیث میں لفظ ''عانۃ'' آیا ہے۔ عانہ اس حصۂ جسم کو کہتے ہیں جو ناف کے نیچے واقع ہے اور جس پر وہ بال اگتے ہیں، جو مرد اور عورت کے اعضا تناسل کے اطراف میں ہوتے ہیں۔

الغرض "استحداد" یا "حلق العانة" سے مراد یہ ہے کہ ان بالوں کو صاف کیا جائے جس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ استرے سے مونڈا جائے لیکن قینچی سے کترنا اور نوچنا یا کوئی بال صفا پوڈر یا کریم استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

شیخ ابن دقیق العید نے لکھا ہے کہ بعض علماء کا رجحان یہ ہے کہ عورت کے حق میں استرے سے مونڈنا زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ بال نوچنے کے نتیجے میں کھال ڈھیلی ہوجاتی ہے۔

اس بات کی تائید امام نوویؒ اور کچھ دیگر علماء کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ مرد اورعورت دونوں کے لیے مسنون طریقہ یہی ہے کہ پیڑو کے بال استرے سے مونڈے جائیں۔ نیز صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی حدیث سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سفر سے واپسی پر رات کو اچانک گھر میں داخل ہونے اورعورتوں کے پاس جانے سے منع فرمایا ہے اور مشورہ دیا ہے کہ اپنے آنے کی اطلاع پہلے دے دیا کرو تاکہ پراگندہ بالوں والی عورت کنگھی چوٹی کرلے اور خاوند کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے جس عورت نے زائد بالوں کی صفائی نہ کی ہو وہ استرا کرلے۔

بلاشبہ پیڑو کے بالوں کو مونڈنا اور ان اعضاء کی صفائی ایک بہت اچھا کام ہے۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ بالوں میں جوئیں نہ پڑیں گی اور میل کچیل جمع نہ ہوگا، جس کے نتیجہ میں انسان سوزش جلد اور اسی قسم کے دیگر عوارض سے محفوظ رہے گا پھر پیڑو پر بالوں کی موجودگی بدبو کا باعث بھی بنتی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مونچھیں کتروانے، ناخن تراشنے، بغل اور پیڑو کے بال صاف کرنے کے لیے وقت مقرر کردیا گیا تھا اور حکم تھا کہ ان کاموں میں چالیس دن سے زیادہ تاخیر نہ کی جائے۔ (مسلم، ابن ماجہ، مسند احمد، ترمذی، نسائی اور ابوداؤد)

ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمارے لیے وقت مقرر کردیا تھا۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کاموں کو اس طرح نہ چھوڑ دیا جائے کہ ان پر چالیس دن سے زیادہ گزر جائیں۔ یہ مراد نہیں ہے کہ چھوڑنے کے لیے چالیس دن کی مدت

مقرر کردی گئی تھی یعنی یہ کہ چالیس دن سے پہلے صفائی نہ کی جائے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ بال صاف کرنے کے لیے کوئی خاص وقت یا محدود مدت مقرر نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب پیڑو کے بال بڑھ جائیں تو ان کو مونڈنا سنت ہے اور مناسب یہ ہے کہ چالیس دن سے زیادہ نہ چھوڑا جائے اور یہ حکم عورت اور مرد دونوں کے لیے یکساں ہے۔

یاد رہے کہ مرد کے لیے اپنے زیر ناف بال دوسروں کے سامنے صاف کرنا حرام ہے، اسی طرح عورت کے لیے بھی حرام ہے کہ دوسری عورت کے سامنے اپنے پیڑو کے بال مونڈے یا کسی دوسری عورت سے منڈوائے جیسا کہ بعض ناواقف عورتیں کرتی ہیں کیوں کہ جسم کے جن حصوں کو چھپانے کا حکم ہے ان کو میاں بیوی کے علاوہ دوسروں کے سامنے کھولنا شرعاً ناجائز ہے۔ یعنی فقط شوہر کو بیوی کے سامنے اور بیوی کو شوہر کے سامنے اپنا ستر کھولنے کی اجازت ہے غیروں کے سامنے کھولنا منع ہے۔

چناں چہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! جسم کے قابل ستر حصوں میں سے کس حصے کو دیکھنا جائز ہے اور کس کو دیکھنا ناجائز؟ آپ نے فرمایا:

احفظ عورتك الامن زوجتك او ما ملکت یمینك

''اپنے جسم کے قابل ستر حصوں کو چھپا کر رکھو اور اپنی بیوی یا اپنی لونڈی کے سوا کسی کے سامنے مت کھولو۔''

میں نے عرض کیا اگر صرف مرد ہی مرد ہوں یا صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں تو اس صورت میں بھی ایک دوسرے سے ستر کا چھپانا ضروری ہے؟ آپ نے فرمایا:

ان استطعت ان لا یراھا احد فلا یرینھا

''اگر ممکن ہو کہ کوئی دوسرا تمہارا ستر نہ دیکھے تو ایسا ضرور کرو۔''

میں نے عرض کیا: اگر میں اکیلا ہوں اور کوئی دوسرا موجود نہ ہو تو؟ آپ نے فرمایا:

فا الله احق ان يستحيا منه
''تو اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے شرمایا جائے۔'' (مسند احمد و ابوداؤد)

آپ نے یہ جو ارشاد فرمایا: تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے الخ۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے ستر کو پوشیدہ رکھے۔

نیز ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:

لا ينظر الرجل الى عورة الرجل ولا المرأة الى عورة المرأة ولا يفضى الريجل الى الرجل فى الثوب الواحد ولا تفضى المرأة الى المرأة فى الثوب الواحد. (مسلم و احمد)

''نہ کوئی مرد کسی دوسرے مرد کے جسم کے قابل ستر حصوں کو دیکھے اور نہ کوئی عورت کسی دوسری عورت کے جسم کے قابل ستر حصوں کو دیکھے اور نہ کوئی مرد کسی مرد کے ساتھ ایک چادر یا لحاف میں لیٹے اور نہ کوئی عورت کسی عورت کے ساتھ ایک چادر یا لحاف میں لیٹے۔''

افضاء سے مراد اس حدیث میں یہ ہے کہ ایک شخص کے ساتھ ایک چادر وغیرہ میں اس طرح نہ لیٹے کہ ان کے جسموں کے درمیان کوئی کپڑا وغیرہ حائل نہ ہو، جو ایک جسم کو دوسرے جسم کے ساتھ ملنے میں مانع ہو سکے۔

استرا استعمال کرنے کے سلسلے میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کیا عورت کو چہرے وغیرہ سے زائد بال صاف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے کہ بکرہ بنت عقبہؓ حضرت عائشہؓ صدیقہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے حنا یعنی مہندی کے بارے میں پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا: شجرة طيبة و ماء طهور ''مہندی کا درخت بھی پاکیزہ ہے اور جس پانی میں وہ گھولی جاتی ہے وہ بھی پاک ہے'' لہٰذا اس کے استعمال میں کیا چیز مانع ہے؟ پھر انھوں نے آپ سے چہرے وغیرہ سے زائد بال صاف کرنے کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے

جواب میں فرمایا: اگر تم خاوند والی ہو اور تمہارے لیے یہ ممکن ہو کہ اپنی آنکھوں کے ڈھیلوں کو نکال کر اس سے بہتر جگہ یا انداز میں رکھ سکو تو ایسا ضرور کرو۔"

لہٰذا عورت کے لیے اپنے چہرے یا جسم پر سے زائد بالوں کو صاف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ سر کے بالوں کا احترام ضروری ہے اور ان کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا چاہیے۔ حضرت عائشہؓ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ عورتوں کو بالوں میں کنگھی کرنے کی تاکید فرمایا کرتی تھیں۔

ختنہ

ام عطیہ انصاریؓ بیان کرتی ہیں کہ مدینہ میں ایک ایسی عورت تھی جو عورتوں کے ختنے کیا کرتی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے ارشاد فرمایا:

لا تنهكي فان ذالك احظى للمرأة و احب الى البعل (سنن ابی داؤد)

"زیادہ گہرائی سے نہ کاٹو کیوں کہ عورت کے لیے یہ صورت زیادہ لطف اندوزی اور مرد کے لیے زیادہ رغبت کا باعث ہوتی ہے۔"

ختنہ فطری مسنون طریقوں میں سے ہے جیسا کہ حدیث ابو ہریرہؓ میں اس کا ذکر ہے۔

خَتَّنَ کے معنی ہیں "قَطَعَ" یعنی کاٹا اور خَتُن (خ پر زبر اور ت ساکن) کے معنی ہیں کسی عضوِ مخصوص کا کوئی حصہ کاٹنا۔

مرد کے ختنہ میں کھال کا وہ بڑھا ہوا حصہ کاٹا جاتا ہے جو حشفہ (سرِ ذکر) کو چھپا لیتا ہے۔ ختنہ کرتے وقت مستحب یہ ہے کہ اس کھال کو حشفہ کے سرے سے لے کر جڑ تک پورا کاٹ ڈالا جائے۔ امام الحرمینؒ نے لکھا ہے کہ مردوں کے ختنہ میں جس حصے کو کاٹنا چاہیے وہ قلفہ ہے یعنی وہ کھال جو حشفہ کو ڈھانپے رکھتی ہے۔

حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور بیہقیؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما

کے ختنے ان دونوں کی پیدائش کے ساتویں دن کرائے تھے۔

عورت کے ختنہ سے مراد اس چھوٹی سی کھال کو کاٹنا ہے جو اندام نہانی کے اوپر والے اس حصے میں ہوتی ہے، جس کی شکل کھجور کی گٹھلی جیسی یا مرغ کی کلغی کی مانند ہوتی ہے اور ضروری بات یہ ہے کہ صرف اوپری کھال کاٹی جائے، پورے عضو کو جڑ سے نہ کاٹ دیا جائے۔

حدیث شریف میں جو لفظ "لا تنهكي" وارد ہوا ہے اس کے معنی یہی ہیں کہ کاٹنے میں مبالغہ نہ کیا جائے۔ اور ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: "اشمي ولا تنهكي" (یہ روایت حاکم، طبری، بیہقی اور ابو نعیم نے ضحاک بن قیس کے حوالے سے نقل کی ہے) اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہلکے سے کاٹنے کو خوشبو سنگھانے سے تشبیہ دی گئی ہے اور "نهك" سے مراد مبالغہ کرنا ہے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہوا کہ اس ابھری ہوئی کھال کا کچھ حصہ کاٹو۔ جڑ سے ختم نہ کرو۔

امام ابن قیمؒ نے تحفۃ الودود میں لکھا ہے کہ حدیث کا انداز ایسا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے الفاظ ہیں: اشمي و لا تنهكي ''جس کے معنی یہ ہوئے کہ ابھرے ہوئے مقام کو باقی رہنے دو اور اوپر والی جلد کاٹ دو۔

ختنے کے حکم کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ چناں چہ شافعیوں کے نزدیک (جیسا کہ امام نوویؒ نے "المجموع" میں لکھا ہے) ختنے مرد اور عورت کے لیے واجب ہیں اور ان کے ہاں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حنبلیوں کے نزدیک (جیسا کہ ابن قدامہؒ نے ''المغنی'' میں لکھا ہے) ختنہ مرد کے لیے واجب ہے اور عورت کے لیے واجب نہیں ہے بلکہ ایک احسن طریقہ ہے اور یہی بات اکثر اہل علم نے کہی ہے۔

حنفیوں اور مالکیوں کے نزدیک ختنہ مرد اور عورت دونوں کے لیے سنت ہے اور یہ اسلام کے شعائر میں سے ہے یعنی مسلمان ہونے کی علامت ہے جو فقہاء ختنہ کو مرد کے لیے سنت قرار دیتے ہیں، ان کی دلیل یہ حدیث ہے، جسے امام احمدؒ اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے:

الختان سنة فی الرجال و مکرمة فی النساء

''ختنہ مردوں کے لیے سنت ہے اور عورتوں کے لیے ایک اعزاز واکرام ہے''

چناں چہ عورت کے لیے ختنہ نہ واجب ہے اور نہ سنت بلکہ ایک اعزاز اور مستحب کام ہے یعنی بطور خاص اس کا حکم نہیں دیا گیا اور حدیث میں کاٹنے میں مبالغہ کرنے سے منع کیا گیا ہے اور تھوڑا سا کاٹنا جسے خوشبو سنگھائی جاتی ہے مستحسن قرار دیا گیا ہے لیکن اگر نہ کاٹا جائے یعنی ختنے نہ کیے جائیں تو کوئی گناہ نہیں ہے البتہ خلاف اولیٰ ہے۔

اور بہت سے عرب ملکوں میں بالخصوص سوڈان میں جو ''خفاض فرعونی'' (فرعونی ختنہ) مروّج ہے، جس میں پوری کھال اور ابھرا ہوا حصہ جڑ سے کاٹ دیا جاتا ہے یہ قطعاً حرام اور خلاف سنت ہے بلکہ زمانۂ جاہلیت کا طریقہ ہے، صحت کے لیے اس کے نتائج بہت خطرناک ہیں۔ مرد اور عورت دونوں ہی اس جنسی لذت سے محروم ہوجاتے ہیں جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کا انسان پر ایک انعام ہے اور عورت کے چہرے کی رونق تروتازگی اور آب و تاب ختم ہوجاتی ہے۔

بغل کے بال اکھاڑنا

اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ بغلوں کے بال اکھاڑنا یا نوچنا سنت ہے اور اس حکم میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔

یونس بن عبد الاعلیٰ بیان کرتے ہیں کہ میں امام شافعیؒ کے پاس گیا اور اس وقت حجام ان کی بغلوں کے بال مونڈھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر امام شافعیؒ نے کہا: مجھے معلوم ہے کہ سنت بالوں کا اکھاڑنا ہے لیکن مجھ سے اس کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔

مستحب طریقہ یہ ہے کہ دائیں بغل سے شروع کرے یعنی پہلے دائیں بغل کے بال صاف کرے کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ہر کام دائیں طرف سے شروع کرنا پسند تھا حتی کہ آپ جوتی پہنتے وقت، کنگھی کرتے وقت اور وضو کرتے

وقت۔ الغرض ہر کام دائیں جانب سے شروع کیا کرتے تھے۔ (مسلم)

چناں چہ ہر خاتون پر خواہ لڑکی ہو یا عورت، شادی شدہ ہو یا کنواری، لازم ہے کہ وہ اس فطری سنت پر عمل کرنے کی رغبت پیدا کرے اور جب بھی بغل کے بال بڑھ جائیں، ان کو صاف کرے اور خیال رکھے کہ بغل کے بالوں کی صفائی پر چالیس دن سے زیادہ نہ گزرنے پائیں کیوں کہ یہ چیز ان فطری سنتوں میں سے ہے جن کی وجہ سے مسلمان عورت غیر مسلم عورتوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ غیر مسلم عورتیں نہ اس طریقہ سے واقف ہیں اور نہ وہ ان کاموں کی طرف توجہ دیتی ہیں، جس کے نتیجہ میں ان کے جسم سے سخت بدبو آتی ہے۔

ناخن تراشنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن نماز کے لیے جانے سے پہلے اپنی مونچھیں کترتے اور ناخن تراشا کرتے تھے۔ (طبرانی و بزار)

لہٰذا ناخن تراشنا بھی فطری مسنون طریقوں میں سے ہے اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ناخن تراشنا سنت ہے لیکن اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ البتہ مستحب یہ ہے کہ جمعہ کے دن ناخن تراشے جائیں۔

یہ بات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ "التہذیب" کے مصنف نے لکھا ہے کہ عورت کے لیے چہرے پر سرخی لگانا، بالوں کو سیاہ رنگنا اور انگلیوں کو سجانا بنانا خاوند کی اجازت کے بغیر حرام ہے اور اگر خاوند اجازت دے دے تو پھر اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں، جن میں صحیح تر پہلو یہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے باوجود بھی ایسا کرنا حرام ہے۔ لہٰذا مسلمان عورت کو چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کی کوشش کرے اور ان تمام بدعتوں سے اپنے آپ کو بچائے جو مغربی تہذیب سے ہمارے معاشرے میں در آئی ہیں مثلاً ناخنوں کو بڑھانا یا رنگنا وغیرہ۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ناخن تراشنے میں مستحب یہ ہے کہ پہلے ہاتھوں کے ناخن تراشے بعد ازاں پاؤں کے۔ اور دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے ناخن کاٹنا

شروع کرے یعنی پہلے انگشت شہادت کا ناخن کاٹے پھر درمیانی انگلی کا پھر اس کے برابر والی کا پھر چھنگلی کا پھر انگوٹھے کا۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ کے ناخن کاٹنا شروع کرے اور چھنگلیاں سے شروع کرے پھر اس کے برابر والی انگلی کا ناخن کاٹے اور دائیں پاؤں کی چھنگلی سے کاٹنا شروع کر کے بائیں پاؤں کی چھنگلی پر ختم کرے۔ کٹے ہوئے ناخنوں کو زمین پر یا کوڑے دان میں پھینکنا مکروہ ہے کیوں کہ انسانی جسم کے تمام اجزاء مثلاً بال، ناخن، دانت وغیرہ سب قابل احترام ہیں۔

امام احمد نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم نے ناخنوں اور بالوں کو زمین میں دفن کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح ناخنوں کو زیادہ بڑھانا بھی نہیں چاہیے ورنہ ناخن غلاظت اور جراثیم کی پرورش گاہ بن جاتے ہیں۔

☆☆

عریانی اور لباس

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یَا بَنِیٓ آدَمَ خُذُوا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

"اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقعے پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔"

اگر چہ اس آیت کریمہ کا اولین مقصد ان عرب مشرکین کو ہدایت کرنا ہے جو زمانہ جاہلیت میں برہنہ ہوکر بیت اللہ کا طواف کیا کرتے تھے لیکن آیت میں خطاب عام ہے اور پوری دنیا کے انسانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اپنی زینت ولباس سے بالخصوص عبادت کے وقت ضرور آراستہ رہا کرو، کیوں کہ اصول یہ ہے کہ الفاظ کے عموم کو ملحوظ رکھا جاتا ہے نہ کہ مخصوص سبب نزول کو۔

صحیح مسلمؒ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مشرک عورتیں زمانۂ جاہلیت میں بیت اللہ کا طواف برہنہ ہوکر کیا کرتی تھیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: خذوا زینتکم عند کل مسجد الخ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں جن عورتوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک کا نام ضباء بنت عامر تھا۔ چناں چہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ اس سال کے بعد کسی مشرک کو نہ تو حج بیت اللہ کی اجازت ہے اور نہ برہنہ ہوکر بیت اللہ کا طواف کرنے کی۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں جسم کے قابل ستر حصوں کو چھپانا ضروری ہے۔ لہٰذا اگر لباس پر قدرت ہو تو جسم کے قابل ستر حصوں کو چھپائے بغیر نماز نہیں ہوگی گویا ستر عورت یعنی جسم کے باعث شرم حصوں کو چھپانا فرض ہے۔

لفظ عورت کے معنی لغت کے اعتبار سے ''گھٹیا اور بری چیز'' کے ہیں۔ محاورے میں کہا جاتا ہے کلمة عوراء یعنی بری بات۔

ستر عورت کے معنی شرعاً متعین ہیں۔ اس سے مراد ہے: جسم کے قابل ستر حصوں کو غیروں کی نظیروں سے چھپانا اور یہ چھپانا کپڑے سے ہوسکتا ہے

لہٰذا ستر کے لیے ایسے کپڑے ضروری ہیں جو واقعی چھپانے والے ہوں جو نہ تو شفاف ہوں اور نہ چست کہ اس میں سے جسم کے ابھار اور خطوط جن کا چھپانا ضروری ہے نمایاں طور پر نظر آئیں۔

سترِ عورت یعنی جسم کے قابل ستر حصوں کو چھپانا امت مسلمہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ چناں چہ بنی اسرائیل باہم مل کر ننگے نہایا کرتے تھے اس لیے کہ ان کے معاشرے میں یہ جائز تھا لیکن ہماری شریعت میں ناجائز ہے۔

اسی بنا پر کسی فرد کے لیے خواہ مرد ہو یا عورت غیر مرد یا غیر عورت کے جسم کا کوئی قابل ستر حصہ دیکھنا جائز نہیں۔ جیسا کہ ہم اس کی وضاحت باب طہارت میں کر چکے ہیں، جہاں ہم نے حمام میں جانے اور نہانے کا حکم بیان کیا ہے۔

امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے صحابۂ کرام کپڑے کی تنگی کی وجہ سے اپنے تہبند کو بچوں کی مانند اپنی گردن میں گرہ لگا کر باندھ لیا کرتے تھے اور ایک کہنے والا کہا کرتا تھا: ''اے عورتو! جب تک مرد اٹھ کر کھڑے نہ ہو جائیں تم اپنے سر نہ اٹھانا۔''

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت سہل بن سعد کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ اس وقت کپڑے کی اس قدر قلت تھی اور تہبند اتنے تنگ ہوتے تھے کہ لوگ انہیں اپنی گردن میں باندھ

لیا کرتے تھے تا کہ جسم کا کوئی قابل ستر حصہ کھل نہ جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم کے قابلِ ستر حصوں کو چھپانے کے لیے کس قدر احتیاط ملحوظ رکھی جاتی تھی اور وہ لوگ ستر کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے اور یہ جو عورتوں سے کہا جاتا تھا کہ تم اس وقت تک سر نہ اٹھانا جب تک کہ مرد اٹھ کر کھڑے نہ ہوں تو اس کا مقصد یہ تھا کہ کہیں کسی عورت کی نظر کسی مرد کے ایسے قابل ستر حصوں پر نہ پڑے جو کھلے ہوں یا جن کے کھلنے کا امکان ہو۔

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اس وقت تک اپنا سر سجدے سے نہ اٹھائیں جب تک کہ مرد اور بچے جوان سے اگلی صف میں ہوں اٹھ کر پوری طرح بیٹھ نہ جائیں۔

عورتوں کے لیے نماز میں جسم کے کون سے حصے چھپانا ضروری ہیں؟

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (النور: ۳۱)

''اور اپنی زینت نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے۔''

آیت کریمہ میں ''زینت'' سے مراد اعضاء زینت ہیں یعنی عورت کو چاہیے کہ چہرے اور ہاتھوں کے سوا اپنے جسم کے حسن و زیبائش والے حصوں کو ظاہر نہ ہونے دے۔ عنقریب ہم اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

۱- حدیث شریف میں ہے:

لا يقبل الله صلوة حائض الا بخمار

''اللہ تعالیٰ کسی بالغ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کرتا۔''

اس حدیث کو امام نسائی علیہ الرحمہ کے علاوہ باقی پانچوں محدثین نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہؒ اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔

حدیث میں ''حائض'' سے مراد بالغ عورت ہے اور ''خمار'' سے مراد وہ کپڑا ہے، جو عورتیں سر پر اوڑھتی ہیں۔

۲- ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے آپ بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا: یا رسول اللہ! کیا عورت زیر جامے کے بغیر کرتے اور اوڑھنی میں نماز پڑھ سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اِذَا كَانَ الدرع سابغا يغطى ظهور قدميها

''ہاں پڑھ سکتی ہے بشرطے کہ کرتا اتنا لمبا ہو، جو عورت کے پیروں کی پشت کو بھی چھپالے۔''

اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ائمہ حدیث نے موقوف روایت کی حیثیت(۱) سے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

حدیث میں لفظ ''درع'' آیا ہے۔ اس سے مراد ایسی قمیص ہے، جو گردن میں ڈال کر پہنی جاتی ہے اور ''ازار'' تہبند کو کہتے ہیں، جو جسم کے زیریں حصے کو ڈھانپتا ہے۔

۳- ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

لا بد للمرأة من ثلاثة اثواب تصلى فيها: درع و جلباب و خمار

''نماز پڑھتے وقت عورت کو تین کپڑوں میں ہونا چاہیے۔ [۱] درع (لمبی چوڑی قمیص) [۲] بڑی چادر جو پورا جسم ڈھانپ لے اور [۳] اوڑھنی۔

خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نماز پڑھتے وقت اپنا تہبند کھول کر اسے بطور جلباب (بڑی چادر) اوڑھ لیا کرتی تھیں۔ یہ روایت ابن سعدؒ نے ایسی سند سے نقل کی ہے، جو امام مسلم کے شرائط صحت کے مطابق صحیح ہے۔

۴- اسی سے ملتی جلتی بات حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے کہی ہے۔ ان کا قول ہے:

اذا صلت المرأة فلتصل فى ثيابها كلها: الدرع والخمار و الملحفة.

---

(۱) موقوف اصطلاح حدیث میں اس روایت کو کہتے ہیں، جس میں صحابی راوی نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کیے بغیر کوئی مسئلہ بیان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے ضرور آپ ﷺ ہی سے سنا ہوگا۔

''جب عورت نماز پڑھے تو اسے چاہیے کہ پورے لباس میں ہو یعنی قمیص بھی ہو، اوڑھنی بھی ہو اور شلوار یا تہبند بھی پہنے ہوئے ہو۔''

اس روایت کو ابن ابی شیبہؒ نے ''المصنف'' میں صحیح سند سے نقل کیا ہے۔

۵- ایک اور روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: عورت کو کتنے کپڑے پہن کر نماز پڑھنی چاہیے؟ تو آپ نے پوچھنے والے سے کہا: جاؤ علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) سے پوچھو اور پھر مجھے آ کر بتاؤ، اس شخص نے جا کر حضرت علیؓ سے پوچھا تو حضرت علیؓ نے کہا: ''اوڑھنی اور لمبی چوڑی قمیص جو پورا جسم ڈھانپ لے۔ بعد ازاں یہ شخص حضرت عائشہؓ کی خدمت میں واپس حاضر ہوا اور انہیں بتایا کہ حضرت علیؓ نے یہ جواب دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: درست کہا ہے۔

اس طرح ان تمام روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نماز پڑھتے وقت عورت کو چاہیے کہ اوڑھنی اور بڑی قمیص ضرور پہنے۔ اوڑھنی ایسی ہو جو سر ڈھانپ لے۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ چہرہ بھی چھپا ہوا ہو۔ چناں چہ حدیث شریف: ''لا یقبل الله صلوة حائض الا بخمار'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عورت نماز میں چہرہ بھی ڈھانپ لے بلکہ اس سے مراد محض سر کا ڈھانپنا ہے۔

اوڑھنی کے استعمال کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے:

وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ (النور: ۳۱)

''اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔''

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ اس زمانے میں عورتیں اپنے سروں کو اگر دو پٹے سے ڈھانپتی بھی تھیں تو انہیں پشت پر لٹکا لیا کرتی تھیں اور سینہ گردن اور کان کھلے رہتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اوڑھنی یا دو پٹہ سینے پر لپیٹا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ عورت اپنے دو پٹہ کا بکّل گریبان پر اس طرح مارے کہ سینہ پوری طرح ڈھک جائے۔

چوں کہ قمیص اور درع (بڑے کرتے) دونوں میں گریبان کے مقام پر ہی چاک ہوتا

ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اوڑھنی کو گردن اور سینے پر لپیٹنے کا حکم دیا ہے۔

امام ابن حزمؒ نے المحلی میں لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا ہے کہ اوڑھنیوں کو گریبانوں پر لپیٹا جائے اور یہ ستر کا واضح حکم ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سینہ اور گردن بھی قابل ستر ہے۔ نیز اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ چہرے کا کھولنا جائز ہے۔ اس آیت سے اس کے علاوہ کوئی اور مفہوم سمجھا نہیں جاسکتا۔"

نماز میں عورت کے لیے ستر کے کیا حدود ہیں؟ اس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

☆ حنبلیوں کے نزدیک نماز میں عورت کے لیے پورا جسم ڈھانپنا ضروری ہے حتی کہ وہ بال بھی جو کانوں سے نیچے لٹکے ہوتے ہیں وہ بھی ڈھکے ہونے چاہئیں اور ان کے نزدیک چہرے کے علاوہ اس حکم سے جسم کا کوئی حصہ مستثنیٰ نہیں ہے۔

چناں چہ حنبلی مسلک کے مطابق اگر عورت کے جسم کا کوئی حصہ بغیر ارادے کے کھل جائے اور یہ تھوڑا سا ہو تب تو نماز باطل نہیں ہوتی خواہ کتنی دیر کھلا رہے لیکن اگر کھلنے والا حصہ جسم زیادہ ہو۔ مثلاً ہوا سے چادر اتر گئی اور پوری اتر گئی تو اگر اس نے فوراً ہی "عمل کثیر" (۱) کے بغیر اپنے جسم کو ڈھانپ لیا تب تو نماز باطل نہیں ہوتی اور اگر دیر تک جسم کا کثیر حصہ کھلا رہا تو نماز باطل ہوجائے گی اور مدت کی کمی اور زیادتی کو متعین کرنے میں عرف کو ملحوظ رکھا جائے گا یعنی زیادہ دیر کے معنی یہ ہیں کہ جسے بالعموم زیادہ دیر سمجھا جاتا ہے اور اگر عورت نے اپنے جسم کا کوئی حصہ جان بوجھ کر کھولا ہے تو نماز باطل ہوجائے گی۔

☆ حنفیوں کے نزدیک بھی نماز میں اس عورت کا پورا جسم چھپا ہونا چاہیے حتی کہ وہ بال بھی جو کانوں سے نیچے لٹکے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: (المرأة عورة) عورت پوری کی پوری قابل ستر ہے۔

---

(۱) عمل کثیر فقہی اصطلاح میں ایسی حرکت یا کام کو کہا جاتا ہے جسے کرتے ہوئے دیکھ کر کرنے والے کے بارے میں یہ خیال ہو کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھ رہا ہے۔ (شبیر احمد)

احناف اس میں سے ہاتھ کی ہتھیلیوں کو مستثنیٰ کرتے ہیں لیکن ہاتھوں کا اوپر والا حصہ چھپا ہونا چاہیے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک بھی نماز میں عورت کا پورا جسم چھپا ہونا چاہیے سوائے چہرے اور ہاتھوں کے یعنی ان کے نزدیک پورے ہاتھ، ان کے اوپر کا حصہ اور ہتھیلیاں بھی اگر کھلی ہوں تو کوئی حرج نہیں البتہ اس کے علاوہ جسم کا ہر حصہ حتی کہ کانوں کے نیچے لٹکے ہوئے بال بھی اور پیروں کے اوپر اور نیچے کا حصہ یعنی تلوے بھی قابل ستر ہیں۔

اور اگر نماز میں جسم کا کوئی قابل ستر حصہ ڈھانپنے کی قدرت کے باوجود کھل گیا تو نماز باطل ہوگئی البتہ اگر ہوا سے کھلا اور فوراً ہی "عمل کثیر" کے بغیر ڈھانپ لیا تب تو نماز ہوگئی لیکن اگر ہوا کے علاوہ کسی اور سبب سے کھل گیا مثلاً کسی جانور کی وجہ سے یا کسی نامعلوم سبب سے کھل گیا تو نماز باطل ہوگئی۔

☆ مالکیوں کے مسلک میں قدرے وسعت ہے۔ وہ عورت کے جسم کے قابل ستر حصوں کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک عورۃ مغلظۃ [1] اور دوسرا عورۃ مخففۃ۔

عورۃ مغلظۃ: آزاد عورت کا پورا جسم "عورۃ مغلظۃ" ہے سوائے ہاتھوں، پیروں اور سینے اور سینے کی پچھلی طرف پیٹھ کا حصہ۔

عورۃ مخففۃ: آزاد عورت کا سینہ، سینے کے پچھلی طرف پیٹھ کا حصہ، دونوں بازو، گردن اور سر، علاوہ ازیں گھٹنوں سے پاؤں کے تلوے تک، یہ سب حصے عورۃ مخففۃ ہیں۔

مالکیوں کے نزدیک چہرہ اور پورے دونوں ہاتھ یعنی ہتھیلیاں بھی اور اوپر والا حصہ بھی عورۃ نہیں ہے یعنی ان کو نماز میں ڈھانپنا ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی عورت نے اس حالت میں نماز پڑھی کہ اس کے جسم کے وہ حصے جو "عورۃ مغلظۃ" ہیں پورے یا جزوی طور پر کھلے تھے خواہ یہ جز تھوڑا سا ہی کیوں نہ ہو تو اس کی نماز نہیں ہوئی بشرطیکہ اس عورت کو ان حصوں کے

---

(۱) "عورۃ مغلظۃ" سے مراد جسم کے وہ حصے ہیں، جن کا کھولنا خاوند کے سوا کسی کے سامنے جائز نہیں حتی کہ محرم سے بھی چھپانا ضروری ہیں۔ اور "عورۃ مخففۃ" یعنی جسم کے وہ حصے، جن کا محرم کے سامنے کھولنا جائز ہے، غیر محرم کے سامنے کھولنا منع ہے۔

ڈھانپنے کی قدرت ہو خواہ یہ قدرت اس طرح ہو کہ وہ ڈھانپنے کی چیز خرید سکتی ہو یا کسی سے مانگ سکتی ہو یا اگر کوئی عاریتاً دے تو قبول کر سکتی ہو وغیرہ۔ اب اگر کسی عورت نے نماز شروع تو اس حالت میں کی کہ اس کے جسم کے وہ حصے جو ''عورۃ مغلظۃ'' ہیں پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے لیکن نماز کے دوران میں کھل گئے تو مالکیوں کے قول مشہور کے مطابق اس کی نماز باطل ہوگئی اور وہ بہر حال اس نماز کو دوبارہ پڑھے۔

البتہ اگر جسم کے وہ حصے جو ''عورۃ مخففۃ'' ہیں پورے یا ان کا کوئی جز کھلا رہ جائے تو نماز باطل نہیں ہوتی اگرچہ نماز میں ان کا کھلا رکھنا حرام یا مکروہ ہے اور ان کو دیکھنا حرام ہے لیکن اگر کسی نے اس طرح نماز پڑھی کہ اس کے وہ حصے جو ''عورۃ مخففۃ'' ہیں کھلے تھے تو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ اسی وقت پورے ستر کے ساتھ دوبارہ نماز پڑھے۔ چناں چہ اگر کسی آزاد عورت نے سر، گردن، کندھے، بازو، پستان، سینہ، یا پیٹھ کا وہ حصہ جو سینے کے پچھلی طرف ہے، یا گھٹنا یا پنڈلی سے لے کر پاؤں کے اوپر کے حصہ تک تلوؤں کے سوا کھلے رکھ کر نماز پڑھی ہے تو وہ اسی وقت نماز دہرائے۔

جو کچھ ہم نے اب تک بیان کیا اس کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ نماز پڑھتے وقت عورت کو کم از کم جس لباس میں ہونا چاہیے وہ یہ ہے:

(۱) موٹے کپڑے کا ایسا لمبا کرتا جو پاؤں کی پشت تک کو ڈھانپ لے

(۲) قمیص (۳) اور موٹے کپڑے کی اوڑھنی۔

نیز پاؤں کے تلوؤں کا ڈھانپنا بھی ضروری ہے لیکن اگر تلوے کھلے رہ جائیں تو نماز کا اعادہ واجب نہیں۔

باریک اور شفاف کپڑوں میں نماز جائز نہیں ہے چناں چہ اگر کپڑا اتنا باریک ہے کہ اس میں قابل ستر حصے بغور دیکھے بغیر صاف نظر آتے ہوں تو نماز کا اعادہ بہر حال واجب ہے اور اگر ایسا چست ہے کہ اس میں سے جسم کے قابل ستر حصوں کے حدود وخطوط نمایاں ہوتے ہوں تو ایسے کپڑے میں نماز مکروہ ہے اور اگر وقت کے اندر اندر ایسی نماز کا اعادہ کر سکے تو ضرور کر لے۔

محرم کون ہیں؟

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ○ (النور:۳۱)

’’اور اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے لونڈی غلام، وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔‘‘

اس آیت کریمہ میں ان تمام محرموں کو پوری طرح بیان کر دیا گیا ہے، جن کے سامنے عورت کو اپنی زینت و آرائش ظاہر کرنے کی اجازت ہے لیکن یہ اظہار بھی قصد و ارادے اور بے باکانہ انداز سے نہیں ہونا چاہیے۔

عورت کے حقیقی محرم تو یہ ہیں: خاوند، باپ، خسر، بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی،

بھتیجے اور بھانجے، لیکن اس آیت میں ان محرموں کے ساتھ مندرجہ ذیل کو بھی شامل کر دیا گیا ہے: اپنے میل جول والی مسلمان عورتیں، غلام، لونڈی، ایسے زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔

آیت کریمہ میں لفظ 'بعولة' آیا ہے۔ اس کے معنی عربی زبان میں ''خاوند'' اور ''آقا'' کے ہیں۔ چناں چہ خاوند اور آقا یا مالک کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنی بیوی یا لونڈی کی زینت دیکھے بلکہ اس کا حق تو زینت کے علاوہ بھی ہے۔ اور اس کے لیے عورت کے پورے بدن کو دیکھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا حلال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں سب سے پہلے بعل کا ذکر کیا گیا ہے کیوں کہ اسے عورت کو ہر پہلو سے دیکھنے کا سب سے زیادہ حق ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ○ اِلَّا عَلَی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ○
>
> ''اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کے ملک یمین میں ہوں کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں۔''

خاوند کے لیے عورت کی شرم گاہ کو دیکھنے کے جواز میں علماء میں اختلاف ہے اور اس سلسلے میں دو قول ہیں: ایک قول کے مطابق دیکھنا جائز ہے کیوں کہ اسے اپنی بیوی سے ہر طرح لذت اندوزی کی اجازت ہے اور دیکھنا بدرجہ اولیٰ حصولِ لذت کا ذریعہ ہے۔

''ابن خویز منداد'' نے لکھا ہے کہ خاوند اور آقا کے لیے جائز ہے کہ اپنی بیوی اور باندی کے پورے جسم کو اور شرم گاہ کے ظاہری حصے کو دیکھے البتہ اندرونی حصہ کو دیکھنا منع ہے۔ اسی طرح عورت بھی اپنے خاوند کی اور لونڈی اپنے مالک کی شرم گاہ کو دیکھ سکتی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ شرم گاہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنے اور نبی کریم ﷺ کے جسمانی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ: ما رأیت

ذلك منه ولا اریٰ ذلك منی (مسند احمد) نہ میں نے کبھی آپ ﷺ کے جسم کے مخصوص حصے دیکھے اور نہ آپ نے کبھی میرے جسم کے مخصوص حصے دیکھے۔

قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں خاوند کے ذکر کے بعد باقی محرموں کا ذکر کیا گیا ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اظہار زینت کے سلسلے میں شوہر اور باقی محرم سب برابر ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ سب کا حکم یکساں نہیں ہے بلکہ نفس انسانی کی باطنی کیفیات کی بنا پر ان کی حیثیتیں مختلف ہیں۔

بلاشبہ ایک عورت کے لیے اپنے باپ اور بھائی کے مقابلے میں اپنے سوتیلے بیٹے کے سامنے اظہار زینت میں کہیں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

لہٰذا اظہار زینت کے لحاظ سے ان محرموں کے درجے مختلف ہیں۔

قاضی اسمٰعیلؒ نے ذکر کیا ہے کہ امام حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو کہ نبی کریمؐ کے نواسے تھے امہات المومنین کو نہیں دیکھا کرتے تھے باوجودیکہ ان کے لیے ان کو دیکھنا جائز تھا جیسا کہ اس مسئلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مسلک ہے۔

قاضی اسمٰعیلؒ کہتے ہیں کہ:

میرا خیال ہے کہ امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما ایسا اس لیے کرتے ہوں گے کہ وہ آیت، جس میں نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ:

> ا جُنَاحَ عَلَيهِنَّ فِیٓ آبَائِهِنَّ وَلَا أَبنَائِهِنَّ وَلَا إِخوَانِهِنَّ وَلَا أَبنَاءِ إِخوَانِهِنَّ وَلَا أَبنَاءِ أَخَوَاتِهِنَّ وَلَا نِسَائِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَت أَيمَانُهُنَّ
>
> (الاحزاب:۵۵)
>
> ''ازواج نبی کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے، ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں آئیں۔''

اس آیت میں خاوند کے بیٹوں کا ذکر نہیں ہے اس سے ان دونوں اماموںؓ نے یہ

سمجھا ہوگا کہ ہمارا امہات المومنین کو دیکھنا جائز نہیں جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورہ نور کی اس آیت سے جس میں یہ صراحت ہے کہ خاوند کے بیٹوں سے پردہ نہیں، یہ استدلال کیا ہے کہ امام حسن اور امام حسین کے لیے امہات المومنین کا دیکھنا جائز تھا۔

سورۂ نور کی آیت میں جو لفظ ''آباء'' وارد ہوا ہے اس سے باپ، دادا، نانا، سب مراد ہیں چناں چہ مسلمان عورت کے لیے جائز ہے کہ اپنے دادا، پردادا اور نانا، پرنانا وغیرہ کے سامنے اسی طرح بے حجاب آئے جس طرح خاوند اور باپ کے سامنے آتی ہے۔

خاوند کے آباء

اسی طرح ''آباء بعولتھن'' میں خاوند کے باپ، دادا، پردادا اور نانا، پرنانا سب شامل ہیں۔

خاوند کے بیٹے

اس سے مراد خاوند کی نرینہ اولاد ہے جو دوسری بیوی سے ہو اور اس میں بھی بیٹے، پوتے، نواسے وغیرہ سب شامل ہیں۔

بھائی

اس سے مراد ہر قسم کے بھائی ہیں یعنی سگے بھی جو باپ اور ماں دونوں کی طرف سے ہوں اور سوتیلے بھی جو صرف ماں یا صرف باپ کی طرف سے ہوں۔

بھائیوں اور بہنوں کے بیٹے

اس سے مراد بہنوں اور بھائیوں کے ہر قسم کے بیٹے ہیں یعنی سگے بھی اور وہ بھی جو صرف ماں یا صرف باپ کی طرف سے ہوں۔ اس کے علاوہ ان کے بیٹے، پوتے اور پڑپوتے بھی سب اس میں شامل ہیں۔

یہ محرم جن کا اوپر ذکر ہوا یہ تو اس معنی میں محرم ہیں کہ ان سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے یعنی یہ پیدائشی محرم ہیں۔

چچا اور ماموں

چچا اور ماموں بھی پردہ نہ ہونے کے سلسلے میں دوسرے محرموں کے مانند ہیں یعنی چچا اور ماموں بھتیجی اور بھانجی کے جسم کا وہ حصہ دیکھ سکتا ہے، جس کا دیکھنا اس کے لیے جائز ہے (یعنی چہرہ، ہاتھ اور پاؤں) چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما روایت کرتی ہیں کہ حضرت افلح رضی اللہ عنہ نے جو حضرت ابوالقیس رضی اللہ عنہ کے بھائی اور میرے رضاعی چچا تھے، مجھ سے گھر کے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب حجاب کا حکم نازل ہو چکا تھا تو میں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا، پھر جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ سے ذکر کیا کہ میں نے افلحؓ کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ اس پر آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں انھیں اجازت دے دوں۔

اس روایت کو بہت سے دوسرے محدثین نے بھی بیان کیا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اپنی مسند میں درج کیا ہے۔

ابوداؤد کی روایت اس طرح ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت افلح رضی اللہ عنہ میرے گھر آئے تو میں نے ان سے پردہ کیا۔ اس پر انھوں نے کہا: تم مجھ سے پردہ کرتی ہو حالاں کہ میں تمہارا چچا ہوں؟ میں نے کہا: کیسے؟ کہنے لگے: تم کو میرے بھائی کی بیوی نے دودھ پلایا ہے۔ میں نے کہا: دودھ تو عورت (یعنی بھائی کی بیوی) نے پلایا ہے۔ تمہارے بھائی (یعنی مرد) نے تو دودھ نہیں پلایا، پھر جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا: وہ واقعی تمہارے چچا ہیں اور تمہارے پاس آ سکتے ہیں یعنی ان سے پردہ نہیں ہے۔

اس لیے کہ چچا اور ماموں ایسے رشتہ دار ہیں، جن سے بھتیجوں اور بھانجیوں کا نکاح

حرام ہے لہٰذا وہ بھی ان محرموں کے حکم میں داخل ہیں، جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے۔ یہ رائے تابعین میں سے امام حسن بصریؒ کی ہے اور امام ابوبکر جصاصؒ نے ''احکام القرآن'' میں اس کی تائید کی ہے۔

رضاعت کا رشتہ

آیت کریمہ میں رضاعت کا ذکر نہیں ہے یعنی رضاعی بیٹے یا رضائی بھائی سے پردہ نہ ہونے کا حکم مذکور نہیں ہے لیکن رضاعت بھی نسب کی مانند ہے اور جو رشتے نسب سے ثابت ہوتے ہیں وہی رضاعت سے بھی ثابت ہوتے ہیں اور جو احکام نسبی رشتوں کے ہیں ان کا اطلاق رضاعی رشتوں پر بھی ہوتا ہے چناں چہ رضاعی بیٹا اور رضا بھائی بھی محرم شمار ہوتے ہیں۔

عورتوں سے ستر

آیت کریمہ میں ہے: او نسائھن (اپنی میل جول کی عورتیں) اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان عورت کے لیے جائز ہے کہ اپنی زینت مسلمان عورتوں کے سامنے ظاہر کرے۔ لیکن ذمی کافر عورتوں کے سامنے اظہار زینت منع ہے تاکہ وہ اپنے مردوں سے مسلمانوں عورت کے حسن و جمال اور زیب و زینت کا حال بیان نہ کرسکیں۔

چناں چہ مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے جسم کا کوئی حصہ کسی مشرک عورت کے سامنے کھولے۔ لیکن وہ اپنی مشرکہ لونڈی کے سامنے ایسا کرسکتی ہے۔

ابن جریجؒ، عبادہ بن نسیؒ اور ہشام القاریؒ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی نصرانی عورت مسلمان عورت کا بوسہ لے یا اس کے قابل ستر حصوں کو دیکھے۔

عبادہ بن نسبیؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبیدہ بن الجراحؓ کو لکھا تھا:

> ''مجھے اطلاع پہنچی ہے کہ ذمی کافروں کی عورتیں مسلمان عورتوں کے ساتھ حمام میں جاتی ہیں، لہٰذا انھیں ایسا کرنے سے روک دو۔ کیوں کہ کسی ذمی عورت کو مسلمان عورت کا ستر دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔''

یہ خط ملتے ہی حضرت ابوعبیدہؓ نے فوراً اعلان کرایا:

''جو عورت بغیر ضرورت کے حمام جائے گی یعنی محض اس غرض سے جائے گی کہ چہرے کو چمکائے تو اللہ تعالیٰ اس روز جب کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، اس کے چہرے کو سیاہ کردے گا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ کسی مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں کہ کوئی یہودی یا نصرانی عورت اسے دیکھے۔ حضرت ابن عباسؓ سے 'او نسائھن' کی تفسیر میں یہ مروی ہے کہ اس سے مراد مسلمان عورتیں ہیں اور مسلمان عورت کے لیے جسم کے جو حصے کسی یہودی یا نصرانی عورت کے سامنے کھولنا جائز نہیں وہ یہ ہیں: گردن، کان، اور زیور وغیرہ۔ یعنی وہ کچھ جس کا دیکھنا صرف محرم کے لیے حلال ہے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ کوئی مسلمان عورت کسی مشرک عورت کے سامنے اپنی اوڑھنی نہ اتارے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ''اَوْ نِسَآئِهِنَّ'' فرمایا ہے اور مشرک عورت ''نِسَآئِهِنَّ'' میں شامل نہیں ہے۔

لیکن اس سلسلے میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف ہے:

☆ حنبلیوں کے نزدیک تو مسلمان اور کافر عورت دونوں ہی اس معاملہ میں یکساں ہیں اور مسلمان عورت کے لیے اپنے جسم کے اس حصہ کے سوا جو گھٹنے سے ناف تک ہے باقی جسم کسی کافر عورت کے سامنے کھولنا حرام نہیں ہے۔

☆ لیکن باقی تمام فقہاء کا نقطہ نگاہ اس سے مختلف ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی کافر عورت مسلمان عورت کی لونڈی ہو تو وہ اپنی مالکہ کو دیکھ سکتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کسی اور کافر عورت کے لیے دیکھنا جائز نہیں ہے اور قرآن کریم میں کہا گیا ہے: ''اپنی عورتیں'' جب کہ کافر عورتیں اپنی عورتیں نہیں ہیں بلکہ غیر ہیں۔

شیخ شربینی اور لارڈ کرومر

ارشاد باری تعالیٰ اَوْ نِسَآئِهِنَّ کی وضاحت کے سلسلے میں اس برتاؤ کی تفصیل نہایت دلچسپ ہے جو شیخ شربینیؒ نے لارڈ کرومر سے ملاقات کے موقع پر کیا ہے الاستاذ محمد فہمی عبدالوہاب نے اپنی تصنیف "ورثة الکتاب" میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

شیخ شربینی رحمہ اللہ ایسے زمانے میں شیخ الازہر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے جب مصر میں برطانوی استعمار اور مصریوں کے سچے جذبہ حب الوطنی (جس کی بنیاد دین اور اخلاق پر تھی) کے درمیان کش مکش میں انتہائی شدت پیدا ہوچکی تھی۔ اس وقت مصر میں برطانوی استعمار کا نمائندہ لارڈ کرومر تھا اور الازہر اس زمانے میں اہل ایمان وطن دوست عناصر کا زبردست مرکز اور ایک مضبوط قلعہ بنا ہوا تھا۔ جارح اور ظالم استعمار اس وقت سب سے زیادہ علماء سے خائف رہتا تھا اس لیے کہ اس دور میں عوامی قوت کا سرچشمہ علماء تھے جو نہایت معزز اور صاحب صدق وصفا تھے۔ لارڈ کرومر کا ذاتی خیال یہ تھا کہ اگر شیخ شربینیؒ کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت ہوجائے تو بہت ممکن ہے کہ موجودہ خوفناک کش مکش کی شدت میں کمی آجائے، چناں چہ اس نے ارادہ کیا کہ شیخ الازہر سے ان کے گھر جاکر ملاقات کرے۔

امام شربینیؒ نے ملاقات کے لیے جو وقت دیا تھا لارڈ کرومر اپنی بیوی کے ہمراہ اس وقت پہنچ گیا۔ شیخ شربینیؒ یہ چاہتے تھے کہ جب لارڈ کرومر آئے تو آپ کو اس کے استقبال کے لیے اٹھنا نہ پڑے اس لیے کہ شیخ الازہر کو یہ کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ ایک ظالم کافر کے استقبال کے لیے اٹھے۔ آپ نے خادموں کو حکم دیا کہ جب لارڈ آئے تو اسے کمرۂ انتظار میں بٹھایا جائے جو گھر کی نچلی منزل میں تھا۔ جب لارڈ آیا تو اسے کمرۂ ملاقات میں بٹھایا گیا، تھوڑی دیر کے بعد شیخ الازہر ملاقات کے لیے نیچے آئے اور کمرۂ انتظار میں داخل ہوئے تو لارڈ اور اس کی بیگم کو شیخ کبیر کے احترام میں کھڑا ہونا پڑا اور شیخ الازہر چاہتے بھی یہی تھے انہوں نے آتے ہی لارڈ کو تو سلام کیا مگر اس کی بیگم کو نہیں کیا۔

دورانِ گفتگو لارڈ نے بڑی خوشامد سے کام لیا، وہ شیخ الازہر سے اظہار دوستی اور تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتا رہا، لیکن انہوں نے اس کی باتوں کی طرف زیادہ توجہ نہ فرمائی اور نہ ہی اس ملاقات کو کوئی اہمیت دی بلکہ آپ نے بیٹھتے وقت اس کی بیگم کی طرف اپنی پشت کرلی تاکہ آپ کی نظر اس پر نہ پڑے۔

لارڈ نے شیخ الازہر کے اس رویے کو اپنی بیگم کی توہین خیال کیا لیکن اس وقت یہ ممکن نہ تھا کہ وہ فوراً واپس چلا جاتا۔ لہٰذا وہ یہ سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ پھر اس نے شیخ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کی بیگم کو اجازت دیں تاکہ وہ اوپر کی منزل میں جاکر شیخ کی حرم محترم سے ملے، ان کے ساتھ بیٹھے اور ان سے باتیں کرے تاکہ یہ ملاقات تکمیل پذیر ہو۔

لیکن شیخ الازہر نے انکار کردیا اور بڑی سختی سے فوراً جواب دیا کہ:

> ”مجھے افسوس ہے ہماری مسلم خواتین کے لیے غیر مسلم عورتوں سے میل جول اسی طرح حرام ہے جیسے غیر محرم مردوں سے ملنا۔ اس لیے کہ غیر مسلم عورتیں غیر مردوں سے آزادانہ ملتی جلتی ہیں۔“

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ کے بارے میں اقوال

آیت کریمہ کی اس شق کے بارے میں دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ اس میں لونڈی اور غلام دونوں شامل ہیں، خواہ مسلمان ہو یا اہل کتاب..... یعنی ان سے کوئی پردہ نہیں ہے۔

دوسرے قول کے مطابق اس سے صرف لونڈیاں مراد ہیں اور غلام اس میں شامل نہیں ہیں۔

پہلا قول اہل علم میں سے ایک جماعت کا ہے اور حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کا مسلک بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے: ”کوئی حرج نہیں کہ غلام اپنی مالکہ کے بالوں کو دیکھ لے۔“

اشہبؒ بیان کرتے ہیں کہ امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا کہ کیا عورت خصی مرد کے سامنے بغیر اوڑھنی کے آسکتی ہے؟ امام مالک نے جواب دیا: ہاں آسکتی ہے، اگر یہ خصی مرد اس کا یا کسی دوسرے کا غلام ہو، لیکن اگر آزاد ہو تو نہیں آسکتی۔ چناں چہ غلام اگر جوان اور پورا مرد بھی بن جائے جب کہ وہ اسی عورت کے ملک میں چلا آرہا ہو اور کم رو اور کم حیثیت ہونے کی وجہ سے ناقابل توجہ ہو تو وہ بھی اپنی مالکہ کے بالوں کو دیکھ سکتا ہے۔

جن علماء کی یہ رائے ہے ان کے سامنے وہ حدیث ہے جسے ابوداؤد[1] نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک غلام لے کر آئے جو آپ نے انہیں ہبہ کیا تھا، اس وقت حضرت فاطمہؓ کے جسم پر صرف ایک کپڑا تھا جو اس قدر چھوٹا تھا کہ آپ اگر اس سے سر ڈھانپتیں تو پاؤں کھل جاتے تھے اور اگر پاؤں ڈھانپتیں تو سر تک نہ پہنچتا تھا۔ جب حضور ﷺ نے حضرتِ فاطمہ کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا:

انه ليس عليك باس، انما هو ابوك و غلامك

''اس شخص کے سامنے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ یہ (عمر کے لحاظ سے) تمہارے لیے باپ کی مانند ہے اور تمہارا غلام ہے۔''

دوسرے قول کو بھی اہل علم کے ایک گروہ نے اختیار کیا ہے۔ چناں چہ سعد بن المسیبؒ کا قول ہے: تم کو اس آیت او ما ملکت ایمانھن سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کیوں کہ اس سے مراد صرف لونڈیاں ہیں نہ کہ غلام۔

امام شعبیؒ اس کو مکروہ سمجھتے تھے کہ غلام اپنی مالکہ کے بال دیکھے اور یہی مجاہدؒ اور عطاؒ کا قول ہے۔

نیز امام احمد بن حنبلؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اذا كان لاحداكن مكاتب و كان له ما يودى فلتحتجب منه[1]

---

(۱) سنن ابوداؤد، حدیث: ۳۹۲۸، ج:۴، ص۲۱ (۲) مسند امام احمد، ج۶، ص۲۸۹

"اگر کسی عورت کے پاس کوئی ایسا غلام ہو جس کے ساتھ اس کا معاہدہ مکاتبت ہو (یعنی یہ معاہدہ ہو چکا ہو کہ اگر اس قدر رقم ادا کردو گے تو آزاد ہو جاؤ گے) اور اس کے پاس یہ رقم ادا کرنے کے ذرائع بھی ہوں تو اس عورت کو چاہیے کہ اس سے پردہ کرے۔"

ان دونوں آراء میں بظاہر جو اختلاف نظر آتا ہے وہ فقط اس قدر ہے کہ پہلی رائے کے مطابق یہ جائز ہے کہ غلام اپنی مالکہ کے بالوں کو دیکھے۔ لیکن دوسری رائے اختیار کرنے والے پردہ کرنے کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں اور ہمارا رجحان دوسری رائے کی طرف ہے کیوں کہ عورت کو غیر محرموں سے پردے کا حکم جس علت کی بنا پر دیا گیا ہے وہ علت مرد غلام کی صورت میں بھی پائی جاتی ہے۔

اَوِ التَّابِعِیۡنَ غَیۡرِ اُولِی الۡاِرۡبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ کی تفسیر

"غیر اولی الاربة" کے معنی ہیں: ایسے لوگ جنہیں کوئی ضرورت نہ ہو۔ یعنی جنہیں اپنے کام سے کام ہو اور عورتوں کی باتوں سے غرض نہ رکھتے ہوں اور نہ عورت کی خواہش کرتے ہوں، مثلاً ایسے خدمت گار اور ماتحت نوکر چاکر جو ہم پلہ نہ ہوں اور ساتھ ہی ان میں قدرے کم عقلی اور ذہنی بے مائگی پائی جاتی ہو۔ اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں:

۱- حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اس سے مراد ایسا کم عقل شخص ہے جسے شہوت ہی نہ ہو۔

۲- مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مراد احمق شخص ہے۔

۳- ایک قول ہے کہ اس سے مراد نامرد ہے۔

۴- ایک قول ہے کہ اس سے مراد خصی ہے۔

۵- ایک قول کے مطابق اس سے مراد مخنث ہے۔

۶- ایک قول کے مطابق: بہت بوڑھا مرد اور ایسا بچہ مراد ہے جو ناسمجھ ہو۔

۷- ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو کسی خاندان کے ساتھ رہتا ہو وہ

اسے کھانا وغیرہ دے دیتے ہوں اور وہ ہوش وحواس اور عقل وخرد کے لحاظ سے ایسا ضعیف ہو کہ اسے عورت کا خیال ہی نہ آتا ہو اور نہ جنسی شہوت ہو۔

یہ تمام مختلف اقوال قرب المفہوم ہیں اور ان میں جن اوصاف کا ذکر ہے وہ سب ایسے شخص میں جمع ہوجاتے ہیں جو نہ تو فہم وشعور رکھتا ہو اور نہ اس میں اتنی ہمت ہو کہ عورتوں کے معاملات کی طرف متوجہ ہوسکے۔

اس آیت کریمہ کے اندازِ بیان اور اس کے بارے میں مفسرین کے اقوال و آراء سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ امر طے شدہ ہیں: پہلا یہ کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو پیدائشی طور پر عورت کی حاجت نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ ان کے انتخاب اور نگرانی میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے ورنہ ان کے آنے جانے اور عورت کو ان کے سامنے ہونے سے منع کرنا ضروری ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک مخنث نبی کریم ﷺ کے اہل خانہ پاس آیا کرتا تھا اور سب اسے غیر اولی الاربة (بے حاجت لوگوں) میں سے سمجھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔ اس وقت وہ ایک عورت کی تعریف میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب وہ آگے بڑھتی ہے تو اس کے پیٹ پر چار بل پڑتے ہیں اور جب پیچھے ہٹتی ہے تو آٹھ بل پڑتے ہیں۔ دراصل اس گفتگو کا مقصد خاوند کے ساتھ اس عورت کے جنسی عمل کی کیفیت بیان کرنا تھا۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الا اری ھذا یعلم ما ھا ھنا؟ لا یدخلن علیکم ھذا.

"میرا خیال ہے کہ یہ ان سب باتوں سے باخبر ہے جو مرد اور عورت کے درمیان ہوتی ہیں، یہ تمہارے پاس ہرگز نہ آیا کرے۔"

چناں چہ سب نے اس سے پردہ کرنا شروع کردیا۔ بعد ازاں نبی کریم ﷺ نے اسے مدینہ منورہ سے نکال دیا اور حمیٰ بھیج دیا۔ نبی کریم ﷺ کی وفات تک وہ وہیں رہا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں اس نے آپ سے مدینہ میں واپس آنے کی اجازت طلب

کی۔ لیکن آپ نے اسے واپس آنے کی اجازت نہ دی۔ پھر حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اس نے مدینہ واپسی کی اجازت طلب کی تو آپ نے بھی انکار کر دیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں اس نے آپ سے اجازت طلب کی اور اس موقعے پر لوگوں نے بھی آپ سے کہا کہ اب یہ بوڑھا کمزور اور محتاج ہوگیا ہے۔ چناں چہ آپ نے اسے اتنی اجازت دے دی کہ ہر جمعہ کے دن مدینہ میں آ کر لوگوں سے مانگ لیا کرے اور پھر واپس اپنی جگہ چلا جایا کرے۔

اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرَاتِ النِّسَاءِ کی تفسیر

اس سے مراد یہ ہے کہ جو بچے ابھی اتنے کم سن ہوں کہ انہیں مرد اور عورت کے جنسی تعلق کے بارے میں کچھ پتہ نہ ہو۔

یعنی وہ اتنے کم عمر ہوں کہ ابھی عورتوں کی لوچدار گفتگو، لٹک مٹک اور خاص حرکات و سکنات کا مفہوم نہ سمجھتے ہوں۔ ایسے بچوں کے آنے جانے میں اور ان سے پردہ نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن وہ لڑکے جو قریب البلوغ ہوں یا جن پر آثار بلوغ ظاہر ہو رہے ہوں، جو عورتوں کی ایسی باتوں کو سمجھتے ہوں اور عورت کے حسن و زیبائی اور بدصورتی سے واقف ہوں اور خوبصورت اور بدصورت عورت میں فرق کر سکتے ہوں ان کا آنا جانا اور ان سے بے پردگی مناسب نہیں (۱)

---

(۱) اول الطفل الذین الخ پر جو وضاحت بیان کی گئی ہے وہ زمانہ قدیم سے کتابی دنیا میں چلی آ رہی ہے مگر اب حال یہ ہوگیا ہے کہ ۸،۹ سال عمر کے ملازم بچوں کے متعلق ایسی روایات سنی جاتی ہیں کہ ایک کہتا ہے کہ ہماری بیگم صاحبہ کا فلاں حصہ جسم مکھن کی طرح ہے اور دوسرا اسی طرح کی کوئی اور بات کہتا ہے، لہٰذا جماع پر قادر نہ ہونا اور عورت کے احوال سے آگاہ نہ ہونا پہلے زمانہ میں اور درجے پر تھا اور اب سینما، ٹیلی ویژن اور عریاں کہانیوں اور تصویروں نے کسی اور درجے میں پہنچا دیا ہے۔ (ن،ص)

حدودِ ستر

محرموں کے سامنے عورت کا ستر

جو کچھ اب تک بیان ہوا اس سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ کون سے رشتہ دار محرم ہیں لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان محرموں کی موجودگی میں ایک آزاد یعنی معزز اور شریف عورت کے لیے ستر کے حدود کیا ہیں؟

اس سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ مذکورہ بالا محرموں اور مسلمان عورت کی موجودگی میں عورت کو اپنے جسم کے جس حصہ کا مستور رکھنا ضروری ہے وہ ناف اور گھٹنوں کے درمیان کا حصہ ہے۔ اس قول کے مطابق عورت اپنے ان محرموں کی موجودگی میں یا تنہائی میں ناف اور گھٹنوں کے درمیان والے حصہ جسم کے علاوہ باقی جسم کھول سکتی ہے۔[1]

لیکن اس قول کو کامل طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ہم گزشتہ صفحات میں امام قرطبیؒ کے حوالے سے یہ بات واضح کرچکے ہیں کہ انسانوں کی ذہنی کیفیات کے اختلاف کی بنا پر محرموں کے درجے بھی مختلف ہیں اور بلاشبہ باپ اور بھائی کے سامنے عورت کی بے حجابی اپنے سوتیلے بیٹے کے سامنے بے حجابی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بے ضرر ہے۔ اسی فرق و اختلاف کے لحاظ سے عورت کے لیے جسم کو کھولنے کے درجے اور ستر کے حدود بھی مختلف ہیں۔

مالکیوں کے نزدیک مرد محرم کے سامنے عورت کے ستر کی حد عورت کا پورا بدن

---

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ص ۱۰۰، مطبع شعب۔

ہے سوائے چہرے اور اطراف کے۔ اور اطراف سے مراد سر، گردن، دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں ہیں۔

حنبلیوں کے نزدیک محرم کی موجودگی میں عورت کے ستر کی حد، چہرہ، گردن، سر، دونوں ہاتھوں، دونوں پیروں اور پنڈلی کے سوا پورا بدن ہے اور حنبلیوں کے نزدیک چوں کہ مسلمان عورت اور کافر عورت کے درمیان اس مسئلہ کے لحاظ سے فرق نہیں ہے لہٰذا مسلمان عورت کسی بھی عورت کے سامنے اس حصہ جسم کے سوا جو ناف اور گھٹنوں کے درمیان ہے اپنا پورا جسم کھول سکتی ہے۔

غیر محرم کے سامنے عورت کے ستر کی حد

غیر محرم سے مراد تمام اجنبی مرد ہیں، یعنی وہ تمام محرم جن کا ذکر اوپر ہوا اور جن کے ساتھ عورت کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے، ان کے سوا باقی تمام رشتے دار بھی جن سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام نہیں ہیں، غیر محرم ہیں اور یہ رشتہ دار اور اجنبی مرد ستر وحجاب کے معاملہ میں عورت کے لیے برابر ہیں۔

چناں چہ چچازاد اور ماموں زاد بھائی اور خاوند کے بھائی یعنی دیور اور جیٹھ اور خاوند کے چچا زاد یا ماموں زاد بھائی، ستر وحجاب کے معاملے میں ان سب کا حکم وہی ہے جو اجنبیوں کا ہے۔

چناں چہ بخاری اور مسلم میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

ایاکم والدخول علی النساء قالوا یا رسول اللہ! افرأیت الحمو؟ قال الحمو الموت.

”غیر محرم عورتوں کے پاس جانے سے بچو، صحابہ کرام نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! خاوند کے بھائیوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: خاوند کے بھائی تو موت ہیں۔“

”حمو“ سے خاوند کے سگے بھائی اور رشتہ دار کے بھائی سب مراد ہیں۔ حدیث کے

معنی یہ ہیں کہ عورت کو موت قبول کرلینا چاہیے لیکن دیور جیٹھ سے پردہ ترک نہیں کرنا چاہیے۔ بات کہنے کا یہ انداز عربوں میں عام ہے مثلاً بولا جاتا ہے: (الاسد الموت یا السلطان النار) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ شیر کے پاس جانا اپنی موت کو دعوت دینا ہے یا بادشاہ سے ملنا آگ میں پڑنے کی مانند ہے۔(۱)

آیئے اب اس مسئلہ کا کہ ''غیر محرم کے سامنے عورت کے ستر کی کیا حد ہے'' ذرا تفصیل سے جائزہ لیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

و اذا سالتموھن متاعا فاسئلوھن من وراء حجاب ذالکم اطھر لقلوبکم و قلوبھن (الاحزاب:۵۲)

''اور نبی کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔''

اس آیت کریمہ کے نزول کا سبب یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اگر آپ ازواجِ مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم دے دیں تو بہت اچھا ہو کیوں کہ ان کے پاس نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ چناں چہ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اجازت دی ہے کہ

---

(۱) ''الحمو الموت'' کا ایک معنی تو وہ ہے، جو کتاب میں درج ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا یہ مفہوم بھی قابل توجہ ہے کہ موت کی طرح اس سے تحفظ (پردہ) ممکن نہیں۔ یہ اس لیے کہ خاوند کے بھائیوں اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے پردہ کرنا بعض خادم دین زوجین کے لیے نہ صرف سخت آزمائش بنا، بلکہ ان کے لیے دعوت کا کام کرنا ممکن نہ رہا۔ اس کے لیے معتدل راستہ یہی ہے کہ زینتوں کے اخفا کے ساتھ عورت ان کے سامنے آئے اور ہنسی ٹھٹھوں اور لوچدار گفتگو کے بغیر ضروری حد تک ان سے بات کرے ہاتھوں اور چہرے کا استثنیٰ باہر کے لیے نہیں قریبی نامحرم رشتہ داروں کے لیے تو ضرور ہوسکتا ہے۔ یہ مسائل کتابی دنیا میں رہ کر نہ سوچے جائیں بلکہ تمدن و معاشرت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ (ن،ص)

اگر تمھیں کسی ضرورت کی بنا پر امہات المومنین سے کچھ مانگنا ہو یا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو ضرور پوچھو لیکن پردے کے پیچھے سے اور اس پردے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ ایسا کرنا تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح تمہارے اور ان کے دل ان برے خیالات سے پاک رہیں، جو مردوں کے دلوں میں عورتوں کے بارے میں اور عورتوں کے دلوں میں مردوں کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔ نیز اس طریقہ پر عمل کرنے سے نہ تو کسی قسم کا شک وشبہ پیدا ہونے کی گنجائش ہے اور نہ تہمت کا امکان۔ اور یہ حفاظت کی بہترین صورت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی مرد یا عورت کو اپنے اوپر ایسا وثوق و اعتماد نہیں کرنا چاہیے کہ اس کا غیر محرم کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا بے ضرر ہے جب کہ اس سے احتراز کرنا اچھا بھی ہے اور نفس کی حفاظت و عصمت کا بہترین طریقہ بھی۔

اس آیت کے حکم کو محض امہات المومنین تک محدود رکھنا کسی طرح مناسب نہیں کیوں کہ اس کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ طریقہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب ہے اور اس حکمت کا اطلاق سب مومن عورتوں پر یکساں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اگر پردے کا یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے لیے مناسب وموزوں تھا جو اپنی پاکیزگی، تقویٰ اور عصمت وعفت کے لحاظ سے سب عورتوں سے بڑھ کر ہیں اور جن کے لیے غیر مرد کا خیال دل میں لانے سے روکنے والی خود رسول اللہ ﷺ کی ذات اور شخصیت ہے جو شکل وصورت کے لحاظ سے اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ حسین وجمیل اخلاق فاضلہ کے اعتبار سے سب سے کامل، شان وشوکت کے لحاظ سے سب سے عظیم اور قوت جسمانی میں سب سے زیادہ قوی تھے۔

آپ ﷺ کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

ترجمہ اشعار

”آپ سے بڑھ کر حسین میری آنکھوں نے کبھی نہ دیکھا اور آپ جیسا کامل انسان کسی عورت نے نہیں جنا، آپ ہر خامی اور عیب سے پاک پیدا کیے گئے

> گویا کہ آپ ویسے ہی پیدا کیے گئے ہیں جیسا کہ آپ خود پیدا ہونا چاہتے تھے۔"

جب ان تمام باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کے لیے حجاب فرض قرار دیا اور اس کی حکمت یہ بتائی کہ یہ ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ موزوں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ صورت باقی مسلمان عورتوں کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے بدرجہ اولیٰ زیادہ مناسب و موزوں ہے۔ کیوں کہ عام مسلمان عورتیں نہ تو پاکیزگی اور عفت میں اس مقام پر ہیں جس پر امہات المومنین فائز تھیں اور نہ ان کو ایسے خاوند میسر ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ کی صفات کاملہ کا ہزارواں حصہ بھی پایا جاتا ہو چہ جائیکہ آپ کی تمام صفات حسنہ۔

نیز جب اللہ تعالیٰ نے واضح لفظوں میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ امہات المومنین کا پردے میں ہونا صحابہ کرامؓ کے دلوں کے لیے زیادہ باعث پاکیزگی ہے حالاں کہ یہ وہ ہدایت یافتہ اور دوسروں کو ہدایت دینے والی شخصیات ہیں، جن کی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تعریف و توصیف فرمائی ہے تو ظاہر ہے صحابہ کرامؓ کے سوا دوسرے عام مسلمانوں بالخصوص اس زمانے کے مسلمانوں کو تو عورتوں کو پردے میں رکھنے کے سلسلے میں کہیں زیادہ احتیاط و اہتمام کی ضرورت ہے تاکہ ان کے دلوں کی پاکیزگی کا سامان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ قرطبیؒ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "یہ حکم معناً تمام عورتوں کے لیے عام ہے اور شریعت اسلامیہ کے اس اصول کے بالکل مطابق ہے کہ عورت پوری کی پوری عورت یعنی قابل ستر ہے، عورت کا جسم بھی عورت ہے اور آواز بھی عورت ہے چناں چہ آواز کا سنانا بھی بغیر ضرورت کے جائز نہیں۔ مثلاً گواہی دینے کے لیے یا عورت کے جسم میں کوئی مرض ہو یا کوئی ضرورت پیش آجائے اور کچھ پوچھنا پڑ جائے تو ایسی صورت میں آواز سنانے اور بدن کھولنے کی اجازت ہے۔
>
> لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت صرف امہات المومنین کے ساتھ مخصوص ہے وہ پردہ واجب کرنے کی حکمت کو نہیں سمجھتے جو یہ تھی کہ صحابہ کرام کے دلوں

کے لیے پاکیزگی کا باعث ہو اور ظاہر ہے اگر یہ ان کے دلوں کے لیے پاکیزگی کا باعث تھا تو ہمارے دلوں کے لیے اس کی ان سے زیادہ ضرورت ہے۔ چناں چہ آیت کریمہ میں یہ حکم امہات المومنین کے لیے اس غرض سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں دوسری مسلمان عورتوں کے لیے مثال اور پیشوا ہیں اور جو حکم ان کے لیے ہے وہ سب مسلمان عورتوں کے لیے ہے۔"

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ
(النور:۳۱)

"اور اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔"

یہ آیت سورہ نور کی ہے، اس سورہ میں عفت مآبی اور ستر کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کو یہ فرمان بھیجا تھا کہ:

"اپنی عورتوں کو سورۂ نور کی تعلیم دو۔"

نیز ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

"اپنی عورتوں کو سورہ نور کی تعلیم دو اور سوت کاتنا سکھاؤ۔"

اس آیت کریمہ کی ابتداء "غض بصر" (نظریں بچانے) کے حکم سے ہوئی ہے اور "حفظ فرج" (شرم گاہ کی حفاظت) سے پہلے غض بصر کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ آنکھ دل کی جاسوس ہے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے:

النظرة سهم من سهام ابليس مسموم فمن غض البصر اورثه الله الحلاوة فی قلبه

"غمزۂ نگاہ شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے لہٰذا جس نے اپنی

نظر کو بچا کر رکھا، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ایمان کی حلاوت سے نوازے گا۔''

نیز صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ:

ان الله كتب على ابن آدم حظه من الزنى ادرك ذلك لا محالة فالعينان تزنيان و زناهما النظر.

''اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کی تقدیر میں کسی نہ کسی قدر زنا کا حصہ لکھ دیا ہے جو بہرحال اسے مل کر رہے گا۔ چناں چہ آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں اور (غیر عورت کو بہ نظر شہوت دیکھنا آنکھوں کا زنا ہے۔''

اور امام ترمذیؒ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آزاد کردہ غلام حضرت نبہان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، اس وقت آپ کے پاس آپ کی دو بیویاں حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما موجود تھیں۔ آپ نے ان دونوں سے کہا: پردہ کرلو!

ان دونوں نے کہا: وہ تو نابینا ہیں۔

اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

''کیا وہ نابینا نہیں؟ وہ تو ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے۔''

اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم دونوں بھی نابینا ہو؟ کیا تم نہیں انہیں نہ دیکھوگی؟''

اس آیت کریمہ میں ''غض بصر'' (نظر نیچی رکھنے) اور ''حفظ فرج'' (شرم گاہ کی حفاظت کرنے) کے علاوہ یہ حکم بھی ہے: "ولا يبدين زينتهن الا ما ظهر منها" (اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو ظاہر ہو جائے)۔

اس آیت مبارکہ کا شانِ نزول جیسا کہ مقاتلؒ اور ابن حبانؒ نے ذکر کیا ہے، یہ ہے

کہ حضرت اسماء بنت مرثد رضی اللہ عنہا اپنے قبیلہ بنی حارثہ کے ایک محل میں رہتی تھیں۔ عورتوں نے ان کے پاس تہبند پہنے بغیر آنا شروع کر دیا اور ان کے پاؤں میں پازیب اور ان کے سینے اور بالوں کی مینڈھیاں صاف نظر آ رہے تھے یہ دیکھ کر اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا: کتنا برا ہے یہ سب!!

چناں چہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ: و قل للمومنٰت یغضضن من ابصارھن الخ نازل فرمائی۔

تو " ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا" کے معنی یہ ہیں کہ اپنی ایسی زیب و زینت اور ایسا بناؤ سنگھار جس کا چھپانا ممکن ہو اجنبیوں کے سامنے ظاہر نہ کریں۔

لٰہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زیب و زینت کون سی ہے جس کو چھپانا ممکن ہی نہ ہو؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہا کے نزدیک اس سے چادر اور کپڑے مراد ہیں یعنی عرب عورتیں اپنے اوپر جو اوڑھنی وغیرہ اوڑھتی تھیں اس کے اندر سے یا جسم کے نچلے حصے میں سے جو کپڑے نظر آتے تھے اس میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ ان کا چھپانا ممکن نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ آپ نے آیت کریمہ وَ لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنۡھَا کی تفسیر یہ بیان کی کہ اس سے مراد چہرہ، دونوں ہتھیلیاں اور انگوٹھی ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے حضرت ابن عباسؓ نے وہ زینت مراد لی ہو جس کے ظاہر کرنے سے عورتوں کو منع کیا گیا ہے یعنی آپ نے یہ کہا ہو کہ چہرہ اور انگوٹھی کو ظاہر نہ کیا کریں۔

لیکن فقہاء کی اکثریت کا خیال یہی ہے کہ ''ما ظھر منھا'' سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں اور اس کی تائید میں یہ لوگ وہ حدیث پیش کرتے ہیں جو ابوداؤد نے خالد بن دریکؒ کے حوالے سے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے: حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوئیں کہ انہوں نے باریک

کپڑے پہن رکھے تھے لہٰذا آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا:

یا اسماء! ان المرأة اذا بلغت المحیض لم یصلح ان یری منها الا هذا ... و اشاره الی وجهه و کفیه [۱]

"اے اسماء! عورت جب بالغ ہوجائے یعنی اسے حیض آنے لگے تو مناسب نہیں کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے سوائے اس کے۔ اور یہ کہتے وقت آپ نے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کیا)۔

لیکن ابوداؤد اور ابو حاتم رازی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مرسل [۲] ہے کیوں کہ خالد بن دریک نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث خود نہیں سنی۔ لیکن اس کا یہ جواب دیا گیا کہ کسی حدیث کے مرسل ہونیا سے اس حدیث کے صحیح اور درست ہونے پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ واللہ اعلم۔

ابن عطیہؒ نے لکھا ہے: آیت کے الفاظ سے جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت اس حکم کی پابند ہے کہ اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دے اور ہر اس چیز کو چھپانے کی کوشش کرے، جس پر زینت کا اطلاق ہوتا ہو۔ اس میں سے صرف وہ مستثنیٰ ہے، جو عورت کے چلنے پھرنے اور اپنے ضروری کاموں کے لیے آنے جانے کی وجہ سے بہرحال اور از خود ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے جو اس طرح بحالت مجبوری از خود ظاہر ہو وہ عورت کے لیے معاف ہے۔

علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ چوں کہ چہرہ اور ہتھیلیاں بالعموم کھلے رہتے ہیں عادتاً بھی اور عبادت میں بھی یعنی نماز میں اور حج کے موقع پر، تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں جو استثناء ہے اس سے چہرہ اور ہتھیلیاں ہی مراد لیا جائے۔

الغرض اس سلسلے میں علماء کی دو رائیں ہیں:

---

(۱) سنن ابو داؤد، حدیث نمبر ۴۱۰۴۔ ج ۴، ص ۲۶

(۲) تفسیر قرطبی، ج ۱۲، ص ۲۲۹

۱- ایک رائے یہ ہے کہ عورت سر سے پیروں کے تلووں تک ساری کی ساری عورت یعنی قابل ستر ہے اور اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی زینت میں سے اجنبیوں کے سامنے کپڑوں کے سوا کچھ اور ظاہر ہونے دے۔

۲- دوسری رائے یہ ہے کہ عورت اپنا چہرہ اور ہتھیلیاں کھول سکتی ہے۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ کی تفسیر

''اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔''

سینے اور گردن کو چھپانا واجب ہے کیوں کہ ان کو چھپانا ان امور میں سے ہے جن کی دین نے تاکید کی ہے ''لیضربن'' میں ''ل'' تاکید کے لیے ہے۔ یعنی ضرور اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے سینوں پر ڈالے رہیں۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ اس زمانے میں عرب عورتیں اگر اپنے سر کو اوڑھنیوں سے ڈھانپتی تھیں تو اوڑھنی کو اپنی پشت پر لٹکا لیا کرتی تھیں۔ اور گردن سینہ اور کان کھلے رہتے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اوڑھنی کو اپنے سینے پر لپیٹ کر رکھو اس سے مراد یہ ہے کہ عورت اپنے دوپٹے کا بگل اپنے گریبان پر اس طرح مارے کہ سینہ ڈھک جائے۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا

حضرت حارث بن حارث الغامدی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور میرا باپ منیٰ میں تھے کہ ہمیں ایک جگہ لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا: لوگوں کا یہ ہجوم کیسا ہے؟ اس نے کہا یہ لوگ ایک ایسے شخص کے گرد جمع ہیں، جس نے نیا دین نکالا ہے۔ حارث بیان کرتے ہیں پھر ہم اُترے اور ایک روایت میں ہے کہ ہم نے جھانک کر دیکھا تو وہ رسول اللہ ﷺ تھے، جو لوگوں کو ایمان باللہ اور توحید باری تعالیٰ کی دعوت دے رہے تھے اور لوگ آپ پر پھبتیاں کستے تھے اور آپ کو ایذا پہنچا رہے تھے۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی

اور لوگ آپ کے پاس سے چھٹ گئے۔ پھر ایک عورت آئی، جس کے ہاتھ میں پانی کا پیالہ اور ایک رومال تھا۔ اس کا گریبان کھلا تھا اور وہ رو رہی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پانی کا پیالہ لے کر پانی پیا اور وضو کیا۔ پھر اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: بیٹی اپنا گریبان اوڑھنی سے ڈھانپ لو اور اپنے باپ کے بارے میں یہ خوف دل سے نکال دو کہ لوگ اس پر غلبہ پالیں گے یا اسے ذلیل کریں گے۔

حارثؓ کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ آپ کی بیٹی زینب ہے۔(۱)

مہاجر عورتیں

امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے: آپ بیان کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پہلی مہاجر عورتوں پر اپنی رحمت نازل فرمائے، جن کے ایمان کی یہ کیفیت تھی کہ جب آیت کریمہ ' ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن" نازل ہوئی تو ان خواتین نے اپنے تہبند پھاڑ کر اوڑھنیاں بنائیں اور ان سے اپنے سر ڈھانپ لیے۔

انصار عورتیں

ابوداؤدؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے: حضرت عائشہؓ نے فرمایا: بے شک قریش کی عورتوں کو ایک خاص فضیلت حاصل ہے لیکن میں نے بخدا انصار عورتوں سے بڑھ کر کتاب اللہ کی تصدیق کرنے اور قرآن مجید پر ایمان لانے والی کوئی اور عورت نہیں دیکھی، جب سورۂ نور کی یہ آیت نازل ہوئی:

"ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن" اور ان کے مرد گھروں کو لوٹ کر گئے تو جس مرد نے اپنی بیوی، بیٹی، بہن یا اپنی کسی اور رشتہ دار عورت کو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم پڑھ کر سنایا، تو کوئی

---

(۱) یہ روایت طبرانی نے المعجم الکبیر میں صفحہ نمبر ۲۴۵ کالم نمبر ۲، جلد نمبر ۱ میں اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اور امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں نقل کی ہے اور سند کے لحاظ سے حسن ہے۔

عورت ایسی نہ تھی جو اسی وقت نہ اٹھی ہو اور اس نے اپنے کجاوے کی چادر پھاڑ کر اور اس کی اوڑھنی بنا کر اپنے سر پر نہ ڈال لی ہو۔ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر ایمان لانے اور اس کی تصدیق کرنے کا عمدہ نمونہ تھا۔ جب دوسری صبح ہوئی اور عورتیں نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز کے لیے کھڑی ہوئیں تو سب کے سروں پر اوڑھنیاں تھیں جو ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے سروں پر کوّے بیٹھے ہوں۔

مختلف فقہی آراء

یہ آیات اور احادیث عورت کے لیے غیر محرم کے سامنے ستر کی نوعیت متعین کرتی ہیں۔ امام شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں لکھا ہے: آزاد عورت کے لیے ستر کی حد کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

☆ ایک قول یہ ہے کہ چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ آزاد عورت کا پورا بدن عورت ہے۔ یہ مسلک الھادیؒ کا ہے اور القاسم کے بھی دو اقوال میں سے ایک یہی ہے۔ امام شافعیؒ کے مختلف اقوال میں سے بھی ایک قول یہی ہے اور امام ابوحنیفہؒ سے اس سلسلے میں جو روایتیں ہیں ان میں سے بھی ایک روایت یہی ہے اور امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔

☆ دوسرا قول یہ ہے کہ: چہرے اور ہتھیلیوں کے سوا دونوں پاؤں اور پازیب باندھنے کا مقام بھی حکم ستر سے مستثنیٰ ہے۔ یہ مسلک ایک قول کے مطابق القاسمؒ کا ہے اور ایک روایت کے مطابق امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ سفیان ثوریؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا یہی نقطۂ نگاہ ہے۔

☆ تیسرا قول یہ ہے کہ عورت کا پورا بدن سوائے چہرے کے قابل ستر ہے۔ یہ مسلک امام احمدؒ بن حنبل اور امام داؤد ظاہریؒ کا ہے۔

☆ اور چوتھا قول یہ ہے کہ بغیر کسی استثناء کے عورت کا پورا بدن قابل ستر ہے۔ یہ مسلک امام شافعیؒ کے بعض شاگردوں کا ہے اور امام احمد بن حنبل سے بھی ایک روایت یہی ہے۔

فقہی آراء کا خلاصہ

اس مسئلہ میں فقہاء کی مختلف آراء کا خلاصہ یہ ہے:

☆ حنفی مسلک یہ ہے کہ عورت کے لیے اپنا چہرہ اور ہاتھ کھولنا جائز ہے لیکن مرد کو اس کی طرف بنظر شہوت دیکھنا حرام ہے۔

☆ مالکیوں کے اس سلسلے میں متعدد اقوال ہیں:

ایک قول کے مطابق عورت پر چہرے اور ہاتھوں کا چھپانا واجب ہے اور یہی قول ان کے مسلک میں قول مشہور ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ عورت پر تو چہرے اور ہاتھوں کا ستر واجب نہیں ہے لیکن مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی نظر نیچی رکھے۔

ایک اور قول یہ ہے کہ خوب صورت اور بدصورت عورت میں فرق کیا جائے گا۔ خوبصورت عورت کے لیے تو چہرے اور ہاتھوں کا چھپانا واجب ہے جب کہ بد صورت عورت کے لیے واجب نہیں، مستحب ہے۔

☆ شافعیوں کے اکثر علماء کا مسلک بھی یہی ہے کہ چھپانا واجب نہیں لیکن فتویٰ اس قول پر ہے کہ ستر واجب ہے۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک بھی ستر ضروری ہے۔

لیکن ایک بات ملحوظ خاطر رہے کہ علماء کے درمیان ستر اور عدم ستر کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کا محل یہ ہے کہ اگر عورت کا چہرہ کسی بناؤ سنگھار کے بغیر اپنی فطری حالت میں ہو کسی فتنہ کا امکان نہ ہو اور عورت خوب صورت بھی نہ ہو جسے دیکھ کر نظریں بہک جائیں تب تو ان کے نزدیک جو عدم ستر کے قائل ہیں ستر ضروری نہیں ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو یعنی عورت حسین وجمیل ہو اور اس نے بناؤ سنگھار بھی کر رکھا ہو تو پھر ہر حال میں اور سب کے نزدیک ستر واجب ہے تاکہ عورت ایذا سے اور مرد فتنہ سے محفوظ رہ سکے۔

چناں چہ فقہاء کی اکثریت کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ چہرہ اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں عورت نہیں ہیں اور ان کو ڈھانپنا واجب نہیں لیکن افضل یہی ہے کہ چھپایا جائے لیکن اگر فتنہ پیدا ہونے کا خوف ہوتو پھر بہرحال اور سب کے نزدیک ستر ضروری ہے۔

اس سارے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ "ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا" کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

☙ ❧

لباس اور شرائطِ لباس

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ (النور:۳۱)

”اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر اپنے شوہروں، شوہروں کے باپوں.... کے سامنے۔“

گزشتہ صفحات میں ہم ارشاد باری تعالیٰ: یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد (اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقعے پر اپنی زینت سے آراستہ رہو) کی تفسیر بیان کرتے وقت یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ زینت سے مراد ستر عورت یعنی جسم کے قابل ستر حصوں کو چھپانا ہے اور ستر عورۃ لباس کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ بھی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے کہ عورت کو نماز میں اور نماز سے باہر محرم اور غیر محرم کے سامنے جسم کے کس کس حصے کو چھپانا ضروری ہے اور اسے کو کون سے حصوں کو کھولنے کی اجازت ہے اور یہ کہ عورت کو نماز میں کیسا لباس پہننا ضروری ہے۔

اب ہم یہاں ان کپڑوں کی تفصیل اور شرائط بیان کریں گے، جن کا پہننا عام طور پر یعنی نماز سے باہر اور اجنبیوں کے سامنے عورت پر واجب ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِینَ یُدْنِینَ عَلَیْهِنَّ مِن جَلَابِیبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن یُعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِیماً ○ (الاحزاب:۵۹)

''اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔''

اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ عرب عورتوں کے عادات و اطوار میں چھچھور پن تھا۔ وہ اپنے گریبان کھلے رکھتی تھیں۔ جس کی وجہ سے مرد ان کی طرف دیکھتے تھے اور ان کا ذہن ان عورتوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچنے میں مشغول رہتا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ عورتوں کو ہدایت کریں کہ وہ اپنے ضروری کاموں کے لیے جب گھر سے نکلنے کا ارادہ کریں تو اپنی چادروں کے آنچل اپنے چہروں اور گریبانوں پر لٹکا لیا کریں تاکہ ان میں اور لونڈیوں میں نمایاں فرق ہوجائے۔ اس طرح آزاد اور شریف خواتین اپنے ستر کی بنا پر صاف پہچانی جائیں اور کنوارے جوان لڑکے ان کو چھیڑنے اور تنگ کرنے سے باز رہیں۔

اس آیت کے نزول سے پہلے مومن عورتیں جب اپنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر نکلتی تھیں تو بعض بدمعاش انہیں لونڈیاں سمجھ کر چھیڑا کرتے پھر جب وہ شور مچاتیں تو بھاگ جاتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ سے شکایت کی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

جلابیب

جلابیب جلباب کی جمع ہے اور جلباب اس چادر کو کہتے ہیں جو لباس کے اوپر اوڑھی جاتی ہے اور عام اوڑھنی سے بڑی ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعودؓ نے اس سے مراد بڑی چادر لی ہے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ نقاب یا برقع ہے۔

ایک قول کے مطابق اس سے مراد وہ کپڑا ہے جو پورے جسم کو ڈھانپ لے۔

جلباب کے آنچل کو اپنے اوپر لٹکانے یعنی اس سے خود کو ڈھانپنے کے سلسلے میں بھی علماء کے درمیان کچھ اختلاف ہے، چناں چہ:

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عبید سلمانیؒ کا خیال ہے کہ عورت چادر کو اپنے اوپر اس طرح لپیٹ لے کہ اس کے جسم میں سے سوائے ایک آنکھ کے جس سے دیکھنے کا کام لے اور کچھ کھلا ہوا نہ ہو۔

☆ نیز حضرت ابن عباسؓ ہی کا قول ہے اور قتادہؒ کا قول بھی یہی ہے کہ جلباب کے استعمال کی صورت یہ ہے کہ اسے پیشانی کے اوپر لپیٹ کر باندھ لے۔ پھر اس کا پلو موڑ کر ناک بھی چھپالے اس صورت میں کہ اگر چہ آنکھیں کھلی رہیں لیکن سینے اور چہرے کا بڑا حصہ ڈھک جائے۔

☆ امام حسن بصری علیہ الرحمہ کا قول یہ ہے کہ جلباب اس طرح اوڑھے کہ آدھا چہرہ چھپ جائے۔

لیکن ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جمہور علماء کی رائے میں اگر فتنے کا خوف نہ ہو تو چہرے اور ہاتھ کو چھپانا ضروری نہیں ہے۔

جلباب کیسی ہونی چاہیے؟

جلباب میں چند مخصوص صفات کا ہونا ضروری ہے، ان صفات کو شیخ محمد ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب "حجاب المرأۃ المسلمۃ فی الکتاب و السنۃ" میں تفصیل سے بیان کیا ہے جو درج ذیل ہے:

۱- اس میں یہ خوبی ہو کہ جسم کے ان حصوں کے سوا جو مستثنٰی ہیں پورے جسم کو ڈھانپ لے۔

۲- خوبصورت نہ ہو کہ خود زینت بن جائے۔

۳- موٹی اور دبیز ہو کہ اس میں سے جسم یا لباس نہ جھلکے۔

۴- ڈھیلی ڈھالی ہو، تنگ یا چست نہ ہو۔

۵- خوشبو میں بسی ہوئی نہ ہو کہ اس میں سے مہک کی لپٹیں اٹھیں۔

۶- مردانہ لباس سے مشابہ نہ ہو۔

۷- کافر عورتوں کے لباس سے مشابہ نہ ہو۔

۸- ایسی ممتاز اور نمایاں نہ ہو کہ باعث شہرت بنے۔

اب ہم مندرجہ بالا شرائط میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں:

۱- ایسی ہو کہ مستثنیٰ حصوں کے سوا پورے جسم کو ڈھانپ لے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جمہور فقہاء کے نزدیک چہرہ اور ہاتھ ستر سے مستثنیٰ ہیں نیز وہ ظاہری لباس بھی مستثنیٰ ہے جس کا چھپانا ممکن نہ ہو کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ: الا ما ظھر منھا میں یہ استثناء موجود ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ عورت اپنی زینت اجنبیوں کے سامنے ظاہر نہ کرے سوائے اس کے جس کا چھپانا ممکن ہی نہ ہو۔ جیسا کہ ہم پہلے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

۲- خوبصورت نہ ہو کہ خود زینت بن جائے۔

اس شرط کی بنیاد یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

و لا تبرجن تبرج الجاھیلة الاولیٰ (الاحزاب:۳۳)
''اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو)

امام ذہبیؒ نے ''کتاب الکبائر'' میں لکھا ہے کہ جن امور کی بنا پر عورت ملعون قرار پا سکتی ہے ان میں یہ امور بھی شامل ہیں:

نقاب کے نیچے سے اپنے بناؤ سنگھار اور سونے اور موتی وغیرہ کے زیورات کی نمود و نمائش، گھر سے نکلتے وقت مشک و عنبر اور اعلیٰ درجے کی خوشبوؤں سے خود کو مہکانا، رنگا رنگ

کپڑے، ریشمی زیر جامہ اور تنگ و چست قمیض پہننا، کپڑے کو زیادہ لمبا رکھنا کہ زمین پر لٹکتا رہے، آستینوں کو چوڑا اور لمبا بنانا تا کہ باہر سے نظر آتی رہیں۔ یہ تمام افعال وہ تبرج (عورت کا بن ٹھن کر باہر نکلنا) ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سخت ناپسند فرمایا ہے اور وہ اس کی مرتکب عورت سے دنیا اور آخرت میں ناراض ہوتا ہے۔ انہی باتوں کی وجہ سے جو عورتوں میں اکثر پائی جاتی ہیں نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

اطلعت علی النار فرأیت اکثر اھلنا من النساء

''مجھے دوزخ دکھایا گیا تو میں نے دیکھا کہ اہل دوزخ میں اکثریت عورتوں کی ہے۔''

۳۔موٹی اور دبیز ہو کہ اس میں سے لباس اور جسم نہ جھلکے۔

یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ باریک اور شفاف کپڑے سے ستر کا مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ تو عورت کی فتنہ سامانی میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

ایک بار نبی کریم ﷺ خواب سے بیدار ہوئے اور فرمایا:

سبحان اللہ! ماذا انزل اللیلة من الفتن؟ و ماذا فتح من الخزائن؟ من یوقظ صواحب الحجر؟ رب کاسیة فی الدنیا عاریة فی الاٰخرة. (بخاریؒ)

''سبحان اللہ! آج رات کیسے کیسے فتنے نازل ہوئے ہیں! اور کیسے کیسے خزانے کھلے ہیں! کوئی ہے جو پردہ والیوں کو بیدار کرے۔ بہت سی وہ عورتیں جو آج دنیا میں لباس پہنے ہوئے ہیں، آخرت میں وہ ننگی ہوں گی۔''

نیز طبرانی نے معجم صغیر میں بہ سند صحیح یہ حدیث روایت کی ہے:

سیکون فی امتی نساء کاسیات عاریات علی رؤسھن کاسنمة البخت، العنوھن فانھن ملعونات.

''عن قریب میری امت میں ایسی عورتیں ہوں گی جو بظاہر لباس پہنے ہوں گی

لیکن اصل میں وہ ننگی ہوں گی اور ان کے سروں پر بختی اونٹ کے کوہان کی مانند (جوڑا) ہوگا، ان پر لعنت بھیجو کیوں کہ یہ عورتیں ملعون ہیں۔"

بخاری کی ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ زائد ہیں:

لا یدخلن الجنة ولا یجدن ریحها و ان ریحها لتوجد من مسیرة کذا و کذا.

"یہ عورتیں جنت میں ہرگز داخل نہ ہوں گی اور نہ جنت کی خوشبو پائیں گی، حالاں کہ جنت کی خوشبو اتنے اور اتنے فاصلے سے یعنی بہت دور سے محسوس کی جاسکتی ہے۔"

ایک بار حفصہؓ بنت عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما جب ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو ایک باریک کپڑے کا دو پٹہ اوڑھے ہوئی تھیں، جس میں سے ان کی پیشانی جھلک رہی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اس دو پٹے کو پھاڑ دیا اور فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں کیا حکم دیا ہے؟ پھر آپ نے ایک اور اوڑھنی منگوائی اور انہیں اڑھادی (یہ روایت ابن سعدؒ نے بیان کی ہے)۔

ایک اور روایت ہے بنی تمیم کی کچھ عورتیں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، جنھوں نے باریک پڑے پہن رکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: اگر تم مسلمان ہوتو یہ لباس مسلمان عورتوں کا نہیں ہے اور اگر تم غیر مسلم ہوتو یہ لباس پہنے رہو۔

۴- وہ چادر ڈھیلی ڈھالی ہو، تنگ اور چست نہ ہو۔

یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ لباس کی غرض و غایت یہ ہے کہ فتنہ پیدا نہ ہو اور یہ غرض ایسے لباس سے ہی پوری ہوسکتی ہے جو ڈھیلا ڈھالا ہو، تنگ اور چست لباس میں سے پورے جسم یا اس کے کچھ حصے کی ساخت نمایاں ہوتی ہے اور اس کا حجم نظر آتا ہے۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کپڑوں میں سے جو آپ کو حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے بطور ہدیہ پیش کیے تھے، مجھے ایک گاڑھا

کتانی کپڑا پہننے کے لیے عطا فرمایا: میں نے وہ کپڑا اپنی بیوی کو دے دیا۔ بعد ازاں آپ نے (جب دیکھا کہ وہ کپڑا میں نے نہیں پہنا تو) فرمایا:

ما لك لم تلبس القبطية؟

''کیا بات ہے تم نے وہ کتانی کپڑا نہیں پہنا؟''

میں نے عرض کیا: میں نے وہ اپنی بیوی کو دے دیا۔ تو آپ نے فرمایا:

مرها فلتجعل تحتها غلالة، فانی اخاف ان تصف حجم عظامها

''اسے کہو کہ اس کے نیچے کوئی اور کپڑا ضرور پہنے کیوں کہ مجھے ڈر ہے کہ اس میں سے اس کے جسم کی بناوٹ نمایاں ہوگی۔''

اس روایت کو ضیاء المقدسیؒ نے ''الاحادیث المختارۃ'' میں اور امام احمدؒ اور بیہقیؒ نے سند حسن سے درج کیا ہے)۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ جب ہرقل کے پاس سے لوٹ کر آئے تو نبی کریم ﷺ نے آپ کو ایک کتانی کپڑا عطا کیا اور فرمایا:

اجعل صديعا لك قميصا واعط صاحبتك صديعا تختمر به

''اس کے ایک ٹکڑے میں سے تم قمیص بنالو اور ایک ٹکڑا اپنی بیوی کو دے دو کہ وہ اس کی اوڑھنی بنالے۔''

پھر فرمایا:

مرها تجعل تحتها شيئا لئلا يصف

''اسے کہنا کہ اس کے نیچے کچھ پہن لے تاکہ اس میں سے جسم کی بناوٹ نمایاں نہ ہو۔''

بعض علماء کا خیال ہے کہ قبطیہ باریک کپڑا ہوتا ہے جیسا کہ امام شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں لکھا ہے۔ لیکن غالباً ان کی نگاہ سے وہ بات اوجھل ہوگئی ہے،

جس کی طرف مذکورہ حدیث میں اشارہ موجود ہے کہ وہ کثیف (گاڑھا) تھا اور اگر باریک ہوتا تو آپ اس کے بارے میں بجائے یہ فرمانے کے کہ ''مجھے ڈر ہے کہ اس میں سے اس کے جسم کی بناوٹ نمایاں ہوگی'' یہ فرماتے کہ ''مجھے ڈر ہے کہ اس میں سے اس کا جسم جھلکے گا'' کیوں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم عطا فرمائے تھے۔ آپ مشکل سے مشکل بات کو بھی نہایت عمدہ طریقے سے واضح فرما دیتے تھے۔

ہشام بن عروہؒ سے روایت ہے کہ منذرؒ بن زبیر عراق سے واپس لوتے تو انہوں نے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں علاقہ مرو کے کوہستانی باریک کپڑے کا ایک جوڑا بھیجا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب حضرت اسماءؓ کی بینائی ختم ہوچکی تھی۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اس کپڑے کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔ پھر فرمایا: اوہ! اس کا جوڑا اسی کو واپس بھیج دو۔ یہ بات منذر بن زبیر پر بہت گراں گزری اور انہوں نے کہا: اماں جان! یہ شفاف تو نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا شفاف نہیں ہے لیکن جسم کی ساخت نمایاں کرسکتا ہے (یہ روایت ابن سعدؒ نے سند صحیح سے منذرؒ کے حوالے سے بیان کی ہے)۔

بیہقیؒ نے عبد اللہ بن ابی سلمہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قبطی (کتان سے بنا ہوا) کپڑا لوگوں میں تقسیم کیا، پھر فرمایا: خیال رکھنا، کہیں اسے تمہاری عورتیں نہ جھپٹ لیں، اس پر ایک شخص نے کہا: اے امیر المومنین! میں نے یہ کپڑا اپنی بیوی کو پہنا کر دیکھا تھا اور وہ گھر میں چلی پھری تھی، سیدھی چلی پھر پیٹھ موڑ کر چلی۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ کپڑا شفاف نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگرچہ شفاف نہیں ہے لیکن وہ جسم کی بناوٹ کو ظاہر کرتا ہے۔

۵- مردانہ لباس سے مشابہ نہ ہو۔

اس بارے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں کہ جو عورت لباس وغیرہ میں مردوں سے مشابہت پیدا کرتی ہے وہ ملعون ہے۔

چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس مرد پر

لعنت بھیجی جو زنانہ لباس پہنے اور اس عورت پر بھی لعنت بھیجی جو مردانہ لباس پہنے (یہ روایت ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم اور احمد بن حنبل نے نقل کی ہے اور یہ روایت امام مسلم کی شرائط صحت کے مطابق صحیح ہے اور بعض کے نزدیک اس کے راوی حدیث صحیح کے معیار کے ہیں)۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:

لیس منا من تشبه بالرجال من النساء ولا من تشبه بالنساء من الرجال. (مسند احمد)

''ہم میں سے نہیں وہ عورت جس نے مردوں کے ساتھ مشابہت پیدا کی اور وہ مرد جس نے عورتوں کے ساتھ مشابہت پیدا کی۔''

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے لعنت بھیجی ان مردوں پر جو ہیجڑے بنتے ہیں اور ان عورتوں پر جو مرد بنتی ہیں۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: انھیں گھروں سے نکال دو (بخاری، ابوداؤد، دارمی، احمد اور ابن ماجہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے)۔

اس موقعے پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل جو مسلمان عورتیں پتلون پہنتی ہیں ان کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟

بعض علماء کا خیال ہے کہ پتلون پہننا حرام ہے اور ان علماء نے مذکورہ بالا حدیثوں کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہم علی الحساب حکم نہیں لگا سکتے بلکہ ہمیں فرق کرنا پڑے گا اس عورت میں جو تنگ پتلون اور اس کے اوپر چھوٹا سا بلاؤز یا چھوٹی جیکٹ پہنتی ہے اور اس عورت میں جو پتلون کے اوپر لمبی جیکٹ یا لمبا کوٹ پہنتی یا بڑی چادر اوڑھتی ہے جس سے جسم کی بناوٹ ظاہر نہیں ہوتی۔

پہلی عورت کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایسا کام کر رہی ہے جو ممنوع ہے

لیکن دوسری عورت کے بارے میں یہ حکم نہیں لگ سکتا کیوں کہ لمبی جیکٹ یا لمبا کوٹ ''جلباب'' سے مشابہ ہے، بشرطیکہ وہ ڈھیلا ڈھالا اور موٹے کپڑے کا ہو۔

ہم نے یہ رائے اس بنا پر قائم کی ہے کہ جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ ایسی مشابہت ہے جو اس نیت اور ارادے سے ہو کہ عورت بظاہر دیکھنے میں مرد نظر آئے۔

اب اگر کوئی عورت کسی ضرورت کے تحت مثلاً سردی سے بچاؤ کی خاطر چوغہ یا پوستین پہن لیتی ہے تو اسے منع نہیں کیا جائے گا کیوں کہ اس کا مقصد مرد نظر آنا اور مردوں سے مشابہت پیدا کرنا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی عورت شلوار پہن کر اس کے اوپر جلباب (بڑی چادر) اوڑھ لیتی ہے تو ایسا کرنا نہ تو حرام ہے اور نہ مکروہ۔ کیوں کہ اس سے تو ستر کا مقصد بدرجہ اولیٰ پورا ہو رہا ہے۔

پھر ان باتوں میں ممانعت کا حکم عادات و اطوار کے اختلاف اور زمانے اور مقام کے بدلنے سے بھی بدل جاتا ہے۔ اصل اہمیت جس چیز کی ہے وہ ستر ہے۔ اگر یہ حاصل ہے تو پھر کوئی ممانعت نہیں۔

لہٰذا وہ عورتیں اور لڑکیاں جو پتلون پہنتی ہیں اور اس کے اوپر لمبی جیکٹ یا لمبا کوٹ پہن لیتی ہیں یا بڑی چادر اوڑھ لیتی ہیں۔ یہ کپڑے نہ تو ایسے چست ہوتے ہیں کہ ان میں سے جسم کی بناوٹ ظاہر ہو اور نہ اتنے باریک ہوتے ہیں کہ جسم جھلکے۔ ان کا مقصد مردوں کا سا حلیہ بنانا یا مردوں سے مشابہت پیدا کرنا بھی نہیں ہوتا بلکہ مقصد جسم کو چھپانا ہوتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بالخصوص جب کہ مردوں اور عورتوں میں اب اس لباس کا عام رواج بھی ہو گیا ہے۔

الغرض عورتوں کے لیے مردانہ حلیہ بنانا اور مردوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا منع ہے۔

اسلامی تاریخ میں بھی ہمیں اس بات کا کہیں ثبوت نہیں ملتا کہ مسلمانوں نے جب کوئی ملک یا علاقہ فتح کیا تو وہاں کے باشندوں کا لباس بدل ڈالا ہو بلکہ رہن سہن کے طور

طریقے، اور لباس جیسے وہاں رائج تھے وہی رہنے دیے کیوں کہ جو لباس منع ہے وہ ایسا لباس ہے جس میں سے جسم کی ساخت نمایاں ہو یا اتنا شفاف ہو کہ جسم جھلکے، یا پھر وہ اہل کفر کا مخصوص شعار ہو یعنی وہ کافروں کی پہچان اور ان کے باطل دین وعقیدے کی علامت ہو۔

پتلون میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی لہٰذا اس کا پہننا نہ تو حرام ہے اور نہ مکروہ کیوں کہ پتلون بھی دراصل ایک قسم کا پاجامہ ہے اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اس دن آپ اون کا پاجامہ، اون کا جبہ، اون ہی کا کمبل اور اون ہی کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔

امام شعرانیؒ نے اپنی کتاب ''کشف الغمہ'' میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ شلوار اور پاجامہ پہننے کی ترغیب دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ

خالفوا اهل الكتاب فانهم لا يتسرولون ولا يأتزرون.

''اہل کتاب کی مخالفت کرو، وہ نہ تو شلوار پہنتے ہیں اور نہ پاجامہ، لہٰذا تم پہنا کرو۔''

نیز آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

اتخذوا السراويلات و حضوا عليها نسائكم اذا خرجن

''شلواریں پہنا کرو اور اپنی عورتوں کو ترغیب دو کہ جب گھر سے باہر جائیں تو شلوار پہن کر جائیں۔''

چناں چہ پتلون بھی چوں کہ ایک قسم کا پاجامہ ہی ہے اور اس کے پہننے سے شرم وحیا کا مقصد بھی پورا ہوتا ہے اور اس سے فتنہ پیدا ہونے کا ڈر بھی نہیں ہے، اس میں اسلامی لباس کی تمام شرطیں بھی پائی جاتی ہیں لہٰذا اس کے پہننے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ لباس عورت کے لیے کچھ زیادہ بہتر اور زیادہ ہی پردہ پوش ہے۔

۶- کافر عورتوں کے لباس سے مشابہت نہ ہو۔

یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا اپنا مخصوص تشخص ہو جو اہل کتاب سے الگ اور ممتاز ہو۔ اسی لیے آپ نے ہم کو ان کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے سے منع فرمایا ہے اس سلسلے میں متعدد احادیث ہیں۔

۱- نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

من تشبه بقوم فهو منهم (حاكم و طبرانی)

''جس شخص نے کسی قوم کے ساتھ مشابہت پیدا کی وہ انہی میں شمار ہوگا۔''

۲- حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اياكم ولبوس الرهبان فانه من تزيا بهم او تشبه فليس منى (اخرجه الطبرانی فی الاوسط)

''خبردار! راہبوں جیسا لباس نہ پہنو، کیوں کہ جس نے ان جیسا لباس پہنایا ان سے مشابہت پیدا کی، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

۳- حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے زرد رنگ کے دو کپڑے دیکھے تو فرمایا:

ان هذه من ثياب الكفار فلا تلبسها (مسلم، نسائی، حاكم و احمد)

''یہ کافروں کا لباس ہے، لہٰذا تم اسے نہ پہنو۔''

۷- ایسی ممتاز اور نمایاں نہ ہو کہ باعث شہرت ہے:

من لبس ثوب شهرة فی الدنيا البسه الله ثوب مذلة يوم القيامة، ثم الهب فيه نارا (ابوداؤد)

''جس شخص نے دنیا میں نمائش کی خاطر لباس پہنا اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا پھر اس میں آگ لگا دے گا۔''

اس ضمن میں امام شوکانیؒ نے ''نیل الاوطار'' میں لکھا ہے کہ ہر وہ کپڑا جسے پہننے کا مقصد لوگوں میں شہرت حاصل کرنا ہو، خواہ وہ اعلیٰ درجے کا ہو جو دنیاوی زیب و زینت اور فخر و

غرور کی غرض سے پہنا جائے یا گھٹیا درجے کا ہو جو ریا کاری سے، خود کو عابد و زاہد ظاہر کرنے کے لیے پہنا جائے، حدیث کے مفہوم میں داخل ہے۔

اس سلسلے میں ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ شہرت کے معنی ہیں کسی چیز کو نمایاں اور ظاہر کرنا اور ''ثوب شہرت'' سے مراد ہر وہ کپڑا ہے جس کا رنگ عام لوگوں کے کپڑوں سے مختلف ہو اور اس بنا پر اسے شہرت حاصل ہو اور لوگ اسے نظریں اٹھا کر دیکھیں اور صاحب لباس اس کی وجہ سے فخر و غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے۔

لیکن ہمارے خیال میں حصولِ شہرت کے لیے محض رنگ کا مختلف ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ اس میں ہر وہ بات داخل ہے جو دوسروں سے ممتاز و منفرد ہونے کی بنا پر وجہ شہرت بن سکے۔

مذکورہ بالا تصریحات پیش کر کے غالباً ہم نے اس زینت کے بارے میں پوری وضاحت کر دی ہے جس کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا منع ہے البتہ خوشبو کی بات باقی رہ گئی ہے جس کے لیے ہم اسی باب میں ایک الگ فصل تحریر کریں گے۔

زینتِ پازیب

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيَعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (النور:۳۱)

''اور اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔''

اس مقام پر ہم چوں کہ عورت کے لباس کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں کہ وہ ستر کے لحاظ سے کیسا ہونا چاہیے؟ اس لیے ضروری ہے کہ پازیب پہن کر پاؤں پر مارنے کا مسئلہ بھی بیان کر دیں تا کہ عورت کے گھر سے نکلنے کے آداب کا موضوع اپنے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے مکمل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے جب زینت کے بارے میں تمام احکام بیان کردیے اور یہ وضاحت بھی فرمادی کہ کس قسم کی زینت کا اظہار عورت کے لیے جائز ہے اور کس قسم کی زینت کا اظہار ناجائز ہے۔ اس کے بعد عورتوں کو اپنے پاؤں زمین پر مار کر چلنے سے بھی منع فرمادیا تاکہ لوگوں کو ان کی چھپی زینت کا علم نہ ہو۔ چناں چہ ارشاد فرمایا کہ:

ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن

یعنی عورت چلتے وقت اپنے پاؤں زمین پر نہ مارے جس سے اس کی پازیب بجنے کی آواز سنائی دے کیوں کہ زیورات کی آواز سنانا بھی زینت کا اظہار ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ جب کہ جو چیز مطلوب و مقصود ہے وہ ستر ہے۔

زمانہ جاہلیت میں عورت پازیب پہنتی اور اگر چلتے وقت اس کی آواز پیدا نہ ہوتی تو وہ اپنا پاؤں زمین پر مارتی تھی تاکہ اس کی آواز پیدا ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کو ایسی حرکات کرنے سے منع فرمادیا۔

یہ حکم محض پازیب ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اگر عورت نے کسی اور قسم کا زیور پہن رکھا ہو جو نظر آتا ہو اور وہ کوئی ایسی حرکت کرے جس سے اس زیور کا اظہار ہو تو وہ بھی اس ممانعت کے حکم میں داخل ہے کیوں کہ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں: لیعلم ما یخفین من زینتھن کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہوجائے۔

امام ابن حزمؒ نے ''المحلی'' میں لکھا ہے: یہ آیت کریمہ دلیل ہے اس بات کی کہ دونوں پاؤں اور پنڈلیاں بھی جسم کے ایسے حصے ہیں جن کو چھپانا ضروری ہے اور ان کا کھلا رکھنا جائز نہیں۔(۱)

اور اس امر کی شہادت سنت نبوی میں بھی ملتی ہے:

۱۔ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ابو عمر بن حفص رضی اللہ عنہ نے مجھے تین طلاقیں دیں جب کہ وہ خود غیر حاضر تھے۔ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں

حاضر ہوئی اور آپ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کے گھر عدت گزاروں اور فرمایا کہ تم ام شریک کے گھر منتقل ہو جاؤ۔ ام شریکؓ انصار کی ایک مالدار خاتون تھیں۔ وہ اللہ کی راہ میں بہت خرچ کیا کرتی تھیں اور ان کے ہاں مہمان آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا: میں عنقریب ان کے ہاں منتقل ہو جاؤں گی۔ پھر آپ نے فرمایا: نہیں ایسا نہ کرنا کیوں کہ ام شریک کے ہاں بکثرت مہمان آتے رہتے ہیں اور مجھے یہ پسند نہیں کہ تمہارا دوپٹہ اتر جائے یا پنڈلی کھل جائے اور کوئی شخص تمہارے جسم کا کوئی ایسا حصہ دیکھ لے جس کا کھولنا مکروہ ہے۔ اس لیے تم اپنے چچا زاد بھائی عبد اللہ بن ام مکتومؓ کے گھر منتقل ہو جاؤ، وہ نابینا ہیں۔ اگر کسی وقت تمہارا دوپٹہ اتر بھی گیا تو وہ تم کو دیکھ نہ سکیں گے۔ راوی کا بیان ہے کہ ابن ام مکتوم اور فاطمہ بنت قیس کا قبیلہ ایک ہی تھا۔ (صحیح مسلم)

۲- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

من جر ثوبه خيلا، لم ينظر الله اليه يوم القيامة

”جس شخص نے اپنا کپڑا تکبر و غرور کی بنا پر لٹکایا تا کہ پیچھے گھسٹتا رہے، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی طرف التفات سے نہیں دیکھے گا۔“

اس پر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: تو عورتیں اپنے دامنوں کا کیا کریں؟ آپ نے فرمایا: (يرخين شبرا) ایک بالشت یعنی نصف پنڈلی تک لٹکا لیا کریں۔ (اور بعض لوگوں کا قول ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ٹخنوں تک لٹکا لیا کریں) اس پر ام سلمہؓ نے عرض کیا: اس صورت میں تو ان کے پاؤں کھلے رہیں گے۔ آپ نے فرمایا: (فيرخينه ذراعا لا يزدن عليه) تو ہاتھ بھر لٹکا لیا کریں لیکن اس سے زیادہ نہ ہو۔ (یہ روایت ترمذیؒ نے بیان کی ہے اور اسے صحیح حسن قرار دیا ہے)۔

امام بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے لیے اپنے دونوں پاؤں چھپانا واجب ہے۔

۳- قرون اولیٰ کی مسلمان عورتیں (اللہ ان سے راضی ہو) اسلام کے ان اعلیٰ

آداب پر عمل کرتی تھیں۔ وہ اس بات کی احتیاط کرتی تھیں کہ کہیں ان کی پنڈلی یا پاؤں کا ستر نہ کھلے۔ اس لیے وہ اپنے دامن اس قدر لمبے رکھا کرتی تھیں کہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم ﷺ سے دریافت کرنا پڑا کہ یا رسول اللہ! میرا دامن لمبا ہونے کی وجہ سے چلتے وقت گندی زمین پر بھی گھسٹتا ہے اور ناپاک ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: "یطھرہ ما بعد" اسے بعد میں دھولیا جائے۔ (یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے اور اس کی سند صحیح ہے)۔

۴۔ قبیلۂ بنی عبد الاشہل کی ایک عورت روایت کرتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارا راستہ جو مسجد کی طرف جاتا ہے، بہت گندا ہے لہٰذا جب بارش ہو تو ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا: الیس بعدھا طریق ھی اطیب منھا کیا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے جو اس سے صفا ستھرا ہو؟ میں نے عرض کیا: ہے کیوں نہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا (فھذہ ھذہ) جب بارش ہو تو اس راستہ کو استعمال کیا کرو۔ (سنن ابوداؤد)

امام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم مخالفة اصحاب الجحیم" میں لکھا ہے: یہی وجہ ہے کہ چوں کہ مسلمان عورت کے لیے اپنے پاؤں اور پنڈلیاں چھپانا واجب ہے لہٰذا مسلمانوں کی طرف سے اہل ذمہ پر جو شرائط عائد کی جاتی ہیں ان میں یہ شرط بھی ہے کہ ان کی عورتیں اپنی پنڈلیاں اور پاؤں کھلے رکھیں گی تا کہ مسلمان عورتوں کے ساتھ مشابہت پیدا نہ ہو۔

مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دین اسلام میں عورت کے ستر کا کس قدر اہتمام ہے کیوں کہ اس میں ایک طرف تو عورت کے لیے پاؤں اور پنڈلیاں کھولنا حرام ہے اور دوسری طرف پازیب کی جھنکار پیدا کرنا بھی حرام ہے۔ تا کہ دوسروں کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے اپنے پاؤں اور پنڈلیوں میں کیا زیور پہن رکھے ہیں اور اس طرح یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلام مرد اور عورت بلکہ اپنے پورے معاشرے کی حفاظت کا کتنا عظیم انتظام کرتا ہے۔

خوشبو کی زینت

۱- ایک حدیث میں ہے:

لا يقبل الله صلوة امرأة تطيبت لهذا المسجد حتى ترجع فتغتسل غسلها من الجنابة (ابوداؤد)

"اللہ تعالیٰ ایسی عورت کی نماز قبول نہیں فرماتا جو مسجد کو جاتے وقت خوشبو لگا کر جائے جب تک کہ وہ واپس آ کر پورا غسل نہ کرلے، جیسا غسل جنابت سے کیا جاتا ہے۔"

۲- حضرت زینب ثقفی رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اذا شهدت احداكن العشاء فلا تطيب تلك الليلة (مسلم)

"جب کوئی عورت نماز عشاء کے لیے مسجد میں آئے تو اسے چاہیے کہ وہ خوشبو لگا کر نہ آئے۔"

۳- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم سے فرمایا:

اذا شهدت احداكن المسجد فلا تمس طيبا (مسلم)

"جب کوئی عورت نماز عشاء میں حاضر ہونا چاہے تو خوشبو کو نہ چھوئے۔"

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ عورت کو مسجد جانے سے منع نہیں کیا جائے گا لیکن عورت اگر مسجد جانا چاہے تو علماء نے اس کے لیے کچھ شرطیں بیان کی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

مسجد جانے والی عورت نہ تو خوشبو لگائے، نہ بناؤ سنگھار کرے، نہ پازیب پہنے جس کی آواز سنائی دے، نہ بھڑکیلا لباس پہنے اور نہ ایسے راستے سے جائے کہ مردوں کے ساتھ اختلاط ہو۔ اگر عورت شوہر والی ہے یا اس کا آقا ہے اور مذکورہ بالا شرائط پائی جاتی ہیں تو پھر اسے منع کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ لیکن اگر عورت کا شوہر یا آقا نہ ہو اور وہ مذکورہ بالا شرائط پوری

کرے تو پھر اسے مسجد جانے سے منع کرنا حرام ہے۔

نیز امام نوویؒ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد: اذا شهدت احداكن العشاء فلا تطيب تلك الليلة کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ عورت ہے جو نماز عشاء کے لیے جانا چاہے لیکن جو نماز پڑھ کر گھر واپس آ گئی ہو اس کے لیے خوشبو لگانا منع نہیں ہے۔

۴- نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

كل عين زانية والمرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا و كذا يعني زانية

"آنکھ بھی زنا کرتی ہے اور جب کوئی عورت خوشبو لگا کر ایسی جگہ سے گزرتی ہے جہاں لوگ بیٹھے ہوں تو وہ بھی ایسی اور ایسی ہے یعنی زانی ہے۔"

(یہ روایت ابوداؤد اور ترمذی میں ہے اور امام ترمذی نے اسے حسن، صحیح قرار دیا ہے)

۵- نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ايما امرأة استعطرت فمرت على قوم ليجدوا ريحها فهي زانية و كل عين زانية

"جو عورت خوشبو لگا کر لوگوں کے قریب سے گزرے تا کہ وہ اس کی خوشبو محسوس کریں وہ زانی ہے اور آنکھ بھی زنا کرتی ہے) اس روایت کو نسائی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے نقل کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔"

۶- ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے قریب سے ایک عورت گزری جس میں سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں، آپ نے پوچھا، یا امۃ الجبار! کہاں جا رہی ہو؟ اس نے کہا: مسجد جا رہی ہوں، آپ نے کہا: اور تم نے خوشبو لگا رکھی ہے؟ کہنے لگی، ہاں! آپ نے کہا: گھر واپس جاؤ اور غسل کرو۔ کیوں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

لا يقبل الله من امرأة خرجت الى المسجد الصلوٰة و ريحها يعصف حتى ترجع فتغتسل (ابوداؤد، نسائی، اور ابن ماجہ)

''جو عورت نماز کے لیے مسجد کی طرف جائے اور اس کے بدن سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی ہوں تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کی نماز قبول نہیں فرماتا جب تک کہ واپس آ کر غسل نہ کر لے۔''

ابن حجر نے ''الزواجر'' میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے میرے نزدیک یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسی عورت پر غسل کرنا واجب ہے اور اگر غسل کیے بغیر نماز پڑھ لے تو اس کی نماز قبول نہ ہوگی۔ لیکن غسل سے مراد یہی نہیں ہے کہ ضرور غسل ہی کرے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کے جسم سے خوشبو زائل ہو جائے۔

۷- حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ جانے کے لیے نکلتے تھے تو بوقت احرام ہماری پیشانیوں پر خوشبو دار لیپ لگا ہوتا تھا اور جب پسینہ آتا تو یہ خوشبو دار لیپ بہہ کر چہرے پر آ جاتا اس کیفیت کو نبی کریم ﷺ دیکھتے لیکن ہمیں خوشبو کا لیپ لگانے سے منع نہ فرماتے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک احرام باندھتے وقت اپنے بدن پر خوشبو لگانا مستحب ہے۔ اور یہ حکم مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں ہے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ خوشبو احرام کے بعد بھی باقی رہے اور خواہ خوشبو ایسی ہو جس کا ٹھوس مادہ ہو اسی بنا پر اگر کپڑے پر عطر لگا لیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

مذکورہ بالا احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا خود کو خوشبو میں بسا کر باہر نکلنا حرام ہے اور ابن حجر علیہ الرحمہ نے تو کہا ہے کہ خواہ شوہر کی اجازت سے ہی خوشبو استعمال کرے تب بھی حرام ہے۔

ابن حجر علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے صراحتاً یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عورت کا خوشبو لگا کر نکلنا حرام ہے لیکن مناسب یہی ہے کہ اصول تطبیق احادیث کے مطابق اس حدیث کو اس صورت پر محمول کیا جائے جب حقیقتاً فتنہ پیدا ہو۔ اگر محض خوف فتنہ ہو تو خوشبو کا استعمال عورت کے لیے مکروہ ہے اور اگر ظن غالب ہو تو حرام ہے لیکن گناہ کبیرہ نہیں، جیسا کہ بظاہر

معلوم ہوتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عورت کے لیے ایسی خوشبو حرام ہے، جس کی مہک پھیلتی ہو اور جو جذبات کو بر انگیختہ کرے اور فتنہ پیدا کرے اور یہ بات نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد ہے سمجھ میں آتی ہے جو حدیث نمبر۴ میں ہے کہ: (وریحها یعصف) ''اس میں سے خوشبو کی لپٹیں اٹھتی ہوں۔'' ان سب سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ کا قول، جسے المناویؒ نے ''فیض القدیر'' میں نقل کیا ہے، یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عورت کے لیے خوشبو لگانا حرام ہے جو مسجد جانا چاہتی ہو کیوں کہ ایسا کرنے سے شہوانی جذبات کو تحریک ملے گی۔ گویا حرمت کی اصل علت شہوت نفسانی کی تحریک اور فتنہ پیدا کرتا ہے یعنی اگر یہ علت نہ پائی جائے تو پھر خوشبو لگانا حرام نہیں ہے۔

استاد یوسف القرضاوی نے اپنی کتاب "الحلال والحرام" میں لکھا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عورتیں لوگوں کے پاس سے گزرتے وقت اپنے پاؤں زمین پر مارا کرتی تھیں تا کہ ان کی پازیب بجنے کی آواز سنائی دے۔ قرآن نے اس حرکت سے منع فرما دیا کیوں کہ اس طرح شہوانی جذبات رکھنے والے مردوں کو ان کی طرف متوجہ ہونے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ عورت کی نیت بد ہے اور وہ چاہتی ہے کہ مردوں کی نظریں اس کی طرف اور اس کی زیب و زینت کی طرف اٹھیں۔

اور اس حکم کا اطلاق تمام قسموں کی خوشبوؤں اور عطریات پر ہوتا ہے جن کی مہک ہر طرف پھیلتی ہے اور جو جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں اور مردوں کی توجہ عورت کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

البتہ استاد یوسف القرضاوی نے یہ قید لگا دی ہے کہ جو خوشبو عورت کے لیے حرام ہے وہ ایسی خوشبو ہے، جس میں سے لپٹیں اٹھتی ہوں اور جس سے جذبات برانگیختہ ہوتے ہوں اور جو لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہو۔

یہ جو کچھ بیان ہوا اس پر ہم مزید یہ اضافہ کرتے ہیں:

جیسا کہ طہارت کے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ عورت کے لیے مستحب ہے، جب وہ حیض سے پاک ہو تو روئی کا ایک ٹکڑا لے کر اس پر خوشبو لگا لے اور ان مقامات پر پھیر دے جہاں خون لگا ہو۔ ظاہر ہے یہ ایک ایسا فعل ہے جس سے خوشبو پیدا ہوتی ہے اگر چہ کم ہی ہو۔ اسی طرح جیسا کہ ابھی گزرا کہ عورت کے لیے بوقت احرام حج وعمرہ خوشبو لگا لینا مستحب ہے تا کہ سفر حج میں پسینہ کی بدبو کے اثرات کچھ کم ہو جائیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ عورت کے لیے صرف وہ خوشبو حرام ہے جو تیز ہو، جس سے لپٹیں ہر طرف پھیلیں، جو جذبات کو برانگیختہ کرے، لوگوں کی توجہ کو جذب کرے اور جس کی وجہ سے فتنہ پیدا ہو۔ یہی حنفی مسلک ہے۔ واللہ اعلم

آواز کا پردہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

و لا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض (الاحزاب:۳۲)

''اور دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے۔''

کیا آزاد عورت کی آواز بھی ''عورۃ'' ہے؟

☆ ایک قول کے مطابق عورت کی آواز عورۃ نہیں ہے اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہراتؓ صحابہ کرامؓ سے باتیں کیا کرتی تھیں اور مسلمان ان سے دین کے احکام سنا کرتے تھے، لیکن عورت کی آواز کا سننا اس صورت میں ضرور حرام ہے جب فتنہ پیدا ہونے کا خوف ہو خواہ یہ آواز تلاوتِ قرآن کی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ قول احناف کا ہے۔

☆ ایک قول یہ ہے کہ عورت کی آواز اجنبی مرد کے سامنے بہرحال قابل ستر ہے خواہ فتنے کا خوف ہو یا نہ ہو۔ یہ قول بعض شافعی علماء کا ہے۔

لیکن ہماری رائے میں عورت کی آواز اجنبی کے سامنے بھی ''عورۃ'' یعنی قابل ستر نہیں ہے بشرطیکہ باتیں عام اور رسمی قسم کی ہوں، فتنہ پیدا ہونے کا خوف نہ ہو اور گفتگو میں نزاکت اور دلکشی نہ ہو۔

ہماری اس رائے کے متعدد دلائل ہیں:

۱- ازواجِ مطہراتؓ، صحابہ کرامؓ سے باتیں کیا کرتی تھیں اور حضرات صحابہؓ ان سے احکام دین سنا کرتے تھے۔

۲- جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مہر کی ایک خاص مقدار مقرر کرنے کا ارادہ کیا تو مسجد کے آخری کنارے سے ایک عورت نے اس کی مخالفت کی اور قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی:

و ان اردتم استبدال زوج مکان زوج و اٰتیتم احداھن قنطارًا فلا تاخذوا منه شیئا (النساء: ۳۰)

''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کرلو تو خواہ تم نے اسے ڈھیروں مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔''

لیکن اس پر نہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی اعتراض کیا اور نہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے۔ بلکہ حضرت عمرؓ نے کہا: ایک عورت صحیح بات پاگئی اور عمرؓ سے غلطی ہوگئی۔

۳- جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی الہ عنہا کے درمیان باغ فدک کے معاملہ پر اختلاف پیدا ہوا تو حضرت زہراءؓ خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئیں اور کہا جاتا ہے کہ حضرت زہراءؓ نے اپنی رائے بیان کرنے اور اس پر اپنا حق ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ ایک تقریر کی اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان اسی مسئلہ پر کافی بحث و مباحثہ ہوا۔

ان تمام واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی آواز ''عورۃ'' نہیں ہے یعنی اس کو چھپانا ضروری نہیں ہے بشرطیکہ گفتگو عام اور رسمی قسم کی ہو اور اس پر "خضوع فی القول" (نرم و نازک اور لوچدار گفتگو) کا اطلاق نہ ہوتا ہو کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

و لا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبهٖ مرض

''اور دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں

پڑ جائے۔"

یہ بات کرنے کا وہ مہذب طریقہ ہے، جس کو اختیار کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہراتؓ کو دیا ہے اور امت کی عورتیں اس حکم میں ان کے طریقہ پر عمل کرنے کی پابند ہیں گویا اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورت کو ہی یہ حکم دیا ہے کہ غیر مردوں سے گفتگو کرتے وقت نرم و نازک اور دلفریب انداز میں بات نہ کیا کرو۔

نماز میں عورت کی آواز - بلند یا پست؟

☆ مالکیوں کے نزدیک نماز میں عورت کا "جہر" یعنی بلند آواز سے تلاوت کرنا مرد کے جہر سے کم تر ہونا چاہیے اور اس کی حد یہ ہے کہ خود سن سکے۔ جیسا کہ حج میں تلبیہ (لبیک کہنے) کے سلسلے میں عورت کے لیے حکم ہے کہ آواز بس اس قدر بلند ہو کہ خود سن سکے گویا عورت کے لیے نماز میں زیادہ سے زیادہ جہر اور کم سے کم جہر کی حد ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ فقط خود سن سکے اور پست آواز سے پڑھنے کی حد یعنی جن نمازوں میں قرأت بلند آواز سے نہیں کی جاتی ان میں پڑھنے کا انداز یہ ہے کہ صرف زبان میں حرکت ہو آواز پیدا نہ ہو۔ مالکی مسلک میں قول معتمد یہی ہے۔

یہ علماء اپنی بات کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ عورت کی آواز فتنہ پیدا کرسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ عورت کا اذان دینا بالاتفاق ناجائز ہے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک عورت کا عورتوں کے درمیان بہ آواز بلند پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ اسے کوئی اجنبی مرد نہ سنے اور عورت کی پست آواز کی حد یہ ہے کہ اگر کوئی مانع موجود نہ ہو تو اتنی آواز سے پڑھے کہ فقط خود سن سکے۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک عورت کے لیے نماز میں بلند آواز سے پڑھنا سنت تو نہیں ہے لیکن اگر کوئی اجنبی مرد نہ سن رہا ہو تو جہراً پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ اگر اجنبی مرد کے سننے کا امکان ہو تو عورت کو بلند آواز سے پڑھنے سے منع کر دیا جائے گا۔

☆ حنفیوں کے نزدیک مرد کے بلند آواز سے پڑھنے کی کم سے کم حد یہ ہے کہ دوسرے لوگ جو اس کے قریب نہ ہوں سن سکیں۔ مثلاً پہلی صف والے سنیں۔ اگر اس طرح پڑھا کہ صرف قریب کے ایک یا دو آدمیوں نے سنا تو یہ جہر نہیں کہلائے گا اور جہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر نہیں ہے۔ پست آواز سے پڑھنے کی کم سے کم حد یہ ہے کہ خود اور قریب کے ایک دو آدمی سن سکیں اور صحیح ترین قول کے مطابق محض زبان ہلانا کافی نہیں ہے۔ اگرچہ حروف صحیح ادا ہوں۔

لیکن حنفیوں کے قول معتمد کے مطابق چوں کہ عورت کی آواز عورۃ نہیں ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک نماز میں بلند آواز سے تلاوت کرنے کے سلسلے میں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ گویا دونوں کے لیے جہر کی حد ایک ہی ہے لیکن وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ پڑھنے والی عورت کی آواز میں نغمگی، نزاکت اور بناوٹ نہ ہو جس کے نتیجے میں سننے والے مردوں کی شہوت میں ہیجان پیدا ہو۔ اب اگر کسی عورت کی آواز مندرجہ بالا صفات کی حامل ہو تو وہ ''عورۃ'' ہے۔ اسے جہراً پڑھنا جائز نہیں اور اگر پڑھے گی تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور اسی علت کی بنا پر عورت کے لیے اذان دینا منع ہے۔

عورت کی اذان

یہ بات متفق علیہ ہے، جس میں کسی مسلک کا اختلاف نہیں کہ موذن کے لیے مرد ہونا شرط ہے لہٰذا اگر عورت یا مخنث اذان دے تو صحیح نہیں ہوگی۔ امام شعرانی نے کشف الغمہ میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ عورتوں میں اذان بھی دیا کرتی تھیں اور نماز کی امامت بھی کرتی تھیں۔ لیکن آپ عورت کو مردوں کے لیے اذان دینے سے منع کیا کرتی تھیں۔ نیز حضرت عائشہؓ کے بارے میں ابن المنذرؒ نے بھی روایت کیا ہے کہ آپ اذان بھی دیتی تھیں اور اقامت بھی کہتی تھیں۔

امام کو غلطی پر متنبہ کرنا

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

التسبیح للرجال و التصفیق للنساء (بخاری و مسلم)

''نماز میں امام سے اگر کوئی خلاف معمول بات ہوجائے تو مرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کریں۔''

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ اگر نماز میں کوئی خلاف معمول بات پیش آجائے اور امام کو متنبہ کرنا ضروری ہو تو سنت یہ ہے کہ مرد سبحان اللہ کہے اور عورت اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر مار کر آواز پیدا کرے لیکن دونوں ہاتھوں کو ہتھیلیوں کو ایک دوسرے سے ٹکرانا جیسے کھیل کود میں تالی بجائی جاتی ہے، جائز نہیں۔ اگر تالی بجائے گی تو نماز باطل ہوجائے گی کیوں کہ یہ فعل نماز کے منافی ہے۔

عورت کا اجنبی مرد کے سامنے گانا

جب نماز اور ایسے تمام امور جن کا تعلق عبادت سے ہے اور اجنبی مرد سے مخاطب ہونے کے سلسلے میں شریعت اسلامیہ کے احکام عورت کی آواز کے بارے میں یہ ہیں جو اوپر بیان ہوئے تو عورت کا اجنبی مردوں کا گانا سنانا بلاشبہ حرام ہونا چاہیے۔

امام ابن حجر اپنی کتاب ''کف الرعاع عن محرمات اللهو و السماع'' میں لکھتے ہیں: اجنبی عورت (آزاد ہو یا لونڈی) کا گانا بہرحال حرام ہے اس لیے کہ ہمارے یعنی شافعیوں کے نزدیک عورت کی آواز بھی ''عورۃ'' ہے خواہ اس کی وجہ سے فتنہ پیدا ہونے کا خوف ہو یا نہ ہو۔

روضۃ الطالبین اور اس کے متن میں تین مقامات پر شیخینؒ کا جو کلام مذکور ہے اس کے مطابق مسلک شافعیہ میں قول راجح یہی ہے کہ گانا حرام ہے۔

اور قاضی ابو الطیب الطبریؒ نے جو ہمارے مسلک کے اماموں میں سے ہیں، نقل کیا ہے کہ اگر گانا پس پردہ گایا جائے تو بھی حرام ہے۔ اور قاضی حسینؒ نے بھی واضح طور پر اسے حرام قرار دیا ہے بلکہ انھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اس مسئلہ میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے کیوں کہ اس سلسلے میں ایک صحیح حدیث وارد ہے۔

من استمع الی قینة صب فی اذنیه الآنك

''جس نے پیشہ ور گانے والی کا گانا سنا اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔''

حافظ ابن حجرؒ اس کے بعد لکھتے ہیں:

باقی صحیح بات یہی ہے کہ عورت کی آواز ''عورۃ'' نہیں اور اس کا سننا، سنانا حرام نہیں، سوائے اس صورت کے جب فتنہ پیدا ہونے کا ڈر ہو لیکن اس سے مراد گانے کی وہ آواز نہیں ہے جو عام گانے والیاں ناز و ادا کے ساتھ لہک لہک کر گیت اور اشعار گاتے وقت نکالتی ہیں بلکہ یہ بات عام بول چال کے بارے میں ہے۔ کیوں کہ گانے میں محض آواز ہی نہیں سنی جاتی بلکہ کچھ اور باتیں بھی شامل ہوتی ہیں لہٰذا اس میں حرمت کا پہلو غالب رہے گا۔ خواہ یہ تسلیم ہی کیوں نہ کرلیں کہ عورت کی آواز ''عورۃ'' نہیں ہے۔ لہٰذا عورت کی آواز کے ''عورۃ'' ہونے یا نہ ہونے کے اختلاف کو اس آواز کے حکم پر محمول کیا جائے گا، جس میں یہ حرمت کے پہلو نہ پائے جاتے ہوں۔ اس لیے کہ گانے کی آواز تو فسق و فجور کی تحریک پیدا کرتی ہے۔

اس گفتگو کے بعد امام ابن حجر نے امام رافعی اور امام اوزاعی رحمہم اللہ کے اقوال نقل کیے ہیں۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ:

''پھر میں دیکھتا ہوں کہ امام رافعی نے بھی عورت کے گانے کو بالکل حرام لکھا ہے اور امام اوزاعی نے علامہ قرطبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان علماء کی اکثریت کا فیصلہ بھی جو گانا سننے کو مباح قرار دیتے ہیں یہی ہے کہ اجنبی عورت کا گانا سننا مردوں اور عورتوں کے لیے حرام ہے۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جو کچھ سنا جائے وہ اشعار ہوں یا قرآن مجید ہو۔ اس لیے کہ اجنبی عورت کے گانے کی آواز شہوت میں ہیجان پیدا کرتی ہے اور فتنہ پیدا ہونے کا خوف رہتا ہے، بالخصوص اس صورت میں جب کہ وہ ترنم کے ساتھ پڑھے۔

دراصل عورت کی مترنم اور سریلی آواز کا سننا عورت کے جسمانی محاسن پر مطلع ہونے کے برابر ہے بلکہ عورت کا گانا اس کے جسمانی حسن کے مقابلہ میں فساد پیدا کرنے کے سلسلے میں کہیں زیادہ مؤثر ہے۔ کیوں کہ گانا سننے کا اثر نفس انسانی پر عورت کو دیکھنے سے پہلے ہوتا ہے۔ باقی اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ گانا شہوت میں ہیجان پیدا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان فتنے میں مبتلا ہوسکتا ہے۔(۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ عورت کی آواز سننے سے بہرحال شہوت میں تحریک پیدا ہونے کا امکان ہے امام اوزاعیؒ نے اس موضوع پر طویل گفتگو کی ہے، جس کا حاصل یہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رافعیوں کے تین بڑے علماء یعنی رافعیؒ، اوزاعیؒ اور ابن حجرؒ اس بات پر متفق ہیں کہ اجنبی عورت کا مردوں کا گانا سنانا حرام ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

> ''قاضی ابو الطیب نے لکھا ہے کہ مردوں کا غیر محرم عورتوں سے گانا سننا امام شافعیؒ کے اصحاب کے نزدیک کسی حالت میں جائز نہیں ہے خواہ وہ سامنے گائے یا پس پردہ اور خواہ گانے والی آزاد عورت ہو یا لونڈی۔''

نیز امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

> ''امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ باندی کا مالک اگر مردوں کو جمع کر کے اپنی لونڈی کا گانا سنواتا ہے تو ایسا شخص ''سفیہ'' یعنی احمق ہے اور اس کی گواہی ناقابل قبول ہے۔''

---

(۱) اس کی تائید میں مولانا جلال الدین رومی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد　　　بسا کیں لذت از گفتار خیزد

امام مالک نے بھی گانے سے مطلقاً منع کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر کسی شخص نے لونڈی خریدی اور پھر معلوم ہوا کہ وہ گلوکارہ ہے تو اس عیب کی بنا پر اسے وہ لونڈی واپس کرنے کا حق ہے۔ ابراہیمؒ بن سعد کے سوا تمام علماء مدینہ کا یہی مسلک ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی گانا ناپسندیدہ فعل ہے اور آپ گانا سننے کو کبیرہ گناہ سمجھتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں ان کے بیٹے عبد اللہؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے گانے سے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا: گانا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے اور مجھے بالکل پسند نہیں۔

یہی عبد اللہ بن احمد بن حنبل بیان کرتے ہیں کہ میرے والد نے مجھ سے بیان کیا کہ مجھے اسحاق بن عیسی الطباع نے بتایا کہ میں نے امام مالکؒ بن انس سے پوچھا کہ علماء مدینہ کے نزدیک کس بنا پر کسی خاص قسم کا گانا گانے اور سننے کی رخصت ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ کام ہمارے ہاں صرف فاسق لوگ کرتے ہیں۔

عبد اللہ بن احمد بن حنبل بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو کہتے سنا ہے کہ میں نے محمد بن یحیٰ القطان سے یہ بات سنی ہے کہ: اگر کوئی شخص تمام رخصتوں پر عمل کرے۔ مثلاً اہل کوفہ کے نزدیک نبیذ کی رخصت ہے، اہل مدینہ کے ہاں گانا سننے کی رخصت ہے، اہل مکہ نے متعہ کی رخصت دی ہے وغیرہ او کما قال تو ایسا شخص بہر حال فاسق ہے۔

شیخ مکحولؒ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے کہا:

”اگر کوئی ایسا شخص مر جائے جس کے پاس گانے والی باندی ہو تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔“ (۱)

---

(۱) الامر بالمعروف والنھی عن المنکر، مصنفہ ابوبکر احمد بن ہارون الخلاص، ص ۱۵۸-۱۶۰، دار الاعتصام

ان علماء کے دلائل جو اجنبی مردوں کے سامنے عورت کا گانا مباح قرار دیتے ہیں

جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ اجنبی مردوں کے سامنے عورتوں کے گانے کے بارے میں مختلف ائمہ فقہ کے اقوال تھے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خود کو اہل علم کہلواتے ہیں اور انھوں نے ان تمام ائمہ کے قوال رد کردیے ہیں اور عورت کا غیر مردوں کے سامنے گانا مباح قرار دے دیا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ جو گانے گائے جائیں وہ اخلاقی اور دینی ہوں۔ انہوں نے اس کے لیے کچھ دلائل بھی پیش کیے ہیں جو نہایت کمزور ہیں۔ وہ دلائل یہ ہیں:

۱- جمہور فقہاء کے نزدیک عورت کی آواز ''عورۃ'' نہیں ہے۔

۲- نبی کریم ﷺ ہجرت کے موقع پر جب مدینہ تشریف لائے تو بنی نجار کی عورتوں نے آپ کے استقبال میں یہ گیت گایا۔ ع:

طلع البدر علینا...... الخ

''ہمارے لیے چودھویں کا چاند نکل آیا۔''

اور نبی کریم ﷺ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

۳- ایام منیٰ یعنی عید کے دنوں میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں دو لڑکیوں نے گانا گایا اور آپ ﷺ نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ بلکہ جب حضرت ابوبکرؓ آئے اور انھوں نے ان کو گاتے سنا تو سخت ناراض ہوئے اور کہا: یہ شیطانی ساز اور نبی کریم ﷺ کے گھر میں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: انہیں کچھ نہ کہو! یہ عید کے دن ہیں۔ (مسلم)

۴- عورت اگر اجنبی مردوں کو گانا سنائے اور گانے کا مضمون اخلاقی اور دینی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ان دلائل کے جوابات

ان تمام دلائل میں استدلال کا فساد صاف نظر آ رہا ہے اس لیے کہ:

۱- عورت کی آواز اگرچہ جمہور فقہاء کے نزدیک ''عورۃ'' نہیں ہے۔ تاہم بعض فقہاء کے نزدیک تو ''عورۃ'' ہے۔ پھر جو فقہا اس بات کے قائل ہیں کہ عورت کی آواز ''عورۃ'' نہیں ہے انہوں نے بھی یہ شرط لگائی ہے کہ ایک تو فتنہ پیدا ہونے کا خوف نہ ہو اور دوسرے جو باتیں سنی جائیں وہ عام روزمرہ کی باتیں ہوں۔ رہا گانا تو وہ عام رسمی گفتگو کے دائرے میں نہیں آتا بلکہ اس سے دل میں گداز پیدا ہوتا ہے۔ لہک لہک کر گایا جاتا ہے اور اس میں نرمی اور لطافت ہوتی ہے اور یہ سب باتیں فتنہ پیدا کرنے والی ہیں۔

پھر جب بلا استثناء تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت کا اذان دینا حرام ہے تو گانا گانا عورت کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

۲- بنی نجار کی عورتوں نے جو ''طلع البدر علینا'' گایا تھا وہ ہجرت کے ابتدائی دنوں کی بات ہے جب کہ ابھی آیاتِ حجاب نازل نہیں ہوئی تھیں۔ حجاب کی آیات غزوۂ خندق کے بعد ۵ھ میں نازل ہوئیں اور ان کی بنا پر مدینہ میں کچھ ایسے نئے احکام نافذ ہوئے جو ان کے نزول سے پہلے رائج نہ تھے۔

۳- عید کے ایام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دو لڑکیوں کے گانے کی جو روایت ہے اس میں ''جاریۃ'' کا لفظ آیا ہے اور جاریہ ایسی لڑکی یا بچی کو کہتے ہیں، جو سب جگہ آ جا سکے اور ابھی بالغ عورتوں کے زمرے میں شامل نہ ہوئی ہو، جن پر حجاب کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔

اور اگر یہ لڑکیاں باندیاں تھیں تو پھر بھی مسئلہ کی نوعیت مختلف ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ باندی کے لیے ستر و حجاب کی حد آزاد عورت کے ستر و حجاب سے مختلف ہے لہٰذا آزاد عورتوں کے احکام کو ان احکام پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جو باندیوں کے لیے ہیں۔

پھر نبی کریم ﷺ نے جس موقع پر ان لڑکیوں کے گانے کو مباح قرار دیا تھا وہ ایک استثنائی صورتِ حال تھی۔ ایک تو عید کا موقع تھا۔ دوسرے یہ کوئی محفلِ عام نہ تھی کہ سب لوگ سنتے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کا گھر تھا۔ اور استثنائی حالت پر نہ تو دوسرے معاملات کو قیاس کیا جاتا ہے اور نہ اس کے احکام کو عام کیا جاسکتا ہے کہ ہر موقع پر اس کا اطلاق ہو سکے۔

اور پھر جب ہم اس روایت کی تفصیل دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ جب نبی کریم ﷺ کے گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ ان لڑکیوں کی طرف سے پیٹھ پھیر کر چادر اوڑھے لیٹے ہوئے ہیں لہٰذا آپ کا طرزِ عمل شرعی لحاظ سے پوری طرح درست تھا۔

۴- اگر ہم عورت کے لیے اخلاق اور دینی اشعار کا گانا مباح قرار دیتے ہیں تو اول تو اباحت کی یہ تخصیص بلا دلیل ہے کیوں کہ اس طرح تو عورت کے لیے غزل اور ایسے عشقیہ اشعار گانا بھی مباح قرار دیا جاسکتا ہے جن کے مضامین فحش نہ ہوں دوسرے اگر آپ عورت کو اخلاقی اشعار و قصائد گانے کی اجازت دیتے ہیں تو پھر تلاوتِ قرآن اور اذان کی اجازت بدرجہ اولیٰ ہونی چاہیے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء نے عورت کے لیے بلند آواز میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور اذان دینا جب کہ اجنبی مرد سن رہے ہوں، بالاتفاق حرام قرار دیا ہے۔

۵- یہ لوگ جنھوں نے عورت کے گانے کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے شریعت کے اس مشہور اصول کو ملحوظ نہیں رکھا کہ برائی کے سبب اور ذریعہ کو روکنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی برائی کو روکنا۔ چناں چہ عورت کے لیے اگر گانا مباح ہوگا تو گانے والی عورت کو گانا سیکھنے اور سرتال یاد کرنے کے لیے بار بار موسیقار کے پاس آنا جانا پڑے گا۔ یا موسیقار اس کے پاس آئے گا اور گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھیں گے۔ اور ایسا میل جول گناہ ہے اور ایسی خلوت جو شک و شبہ پیدا کرے حرام ہے کیوں کہ اس کے ایسے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جو اس سے بھی زیادہ پر خطر اور حرام ہوں۔

۶- آخر میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ آخری دلیل نہیں ہے کہ گانا جب بھی ہوگا

کھلی مجالس میں ہوگا اور عام لوگوں کے سامنے ہوگا جو سب نہیں تو ان میں سے اکثر فاسق و فاجر ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گانا ایک لحاظ سے فاسقوں کی محافل منعقد کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہوا۔ اور امام مالکؒ نے بالکل صحیح فرمایا:

''ہمارے ہاں گانا سننا سنانے کا شغل وہ لوگ کرتے ہیں جو فاسق و فاجر ہیں۔''

تو ایک ایسی صورتِ حال کو آپ کیا کہیں گے کہ فاسق و فاجر لوگوں کا ایک ہجوم ہے جس کے وسط میں ایک جوان عورت گا بجا رہی ہے اور لوگ اسے ناپاک اور بھوکی نظروں سے گھور رہے ہیں اور کان ایسی آوازوں کے شور سے پھٹے جا رہے ہیں جو دلوں کو اندھا کر رہی ہیں اور ان کی وجہ سے روح میں فساد پیدا ہو رہا ہے اور شہوت میں ہیجانی کیفیت۔ ظاہر ہے یہ انتہائی ناپاک منظر ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

۞۞

عورتوں کے مسائلِ نماز

حیض اور نفاس میں نماز

حیض کی حالت میں نماز شروع کرنا یا اگر نماز پڑھتے وقت حیض آ جائے تو نماز پڑھتے رہنا حرام ہے خواہ اس کی مقدار کم ہی ہو۔ اسی طرح نفاس کی حالت میں نماز پڑھتے رہنا حرام ہے۔ حیض و نفاس یا جنابت کی حالت میں یا بغیر وضو کے جان بوجھ کر نماز پڑھنا گناہ کبیرہ ہے اور اسے جائز سمجھنا کفر ہے۔ اسی طرح حیض و نفاس اور جنابت کی حالت میں سجدۂ تلاوت اور سجدہ شکر بھی حرام ہے۔

حضرت عمرؓ عورتوں کو نماز عشاء میں تاخیر کرنے سے منع کیا کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں حیض شروع ہو جائے اور وہ نماز نہ پڑھ سکیں۔

امام شعبیؒ کا قول ہے کہ اگر کسی عورت نے نماز میں تاخیر کردی اور اسے حیض آنا شروع ہو گیا تو وہ اس نماز کی قضا پڑھے جس کا وقت پاک حالت میں (یعنی جب حیض شروع نہیں ہوا تھا) اس پر آ گیا تھا اور اس نے وہ نماز نہیں پڑھی تھی۔

حائضہ جب پاک ہو جائے

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ حائضہ اگر سورج غروب ہونے سے پہلے پاک ہو جائے یعنی اس کا حیض ختم ہو جائے تو وہ ظہر اور عصر کی نماز جمع کر کے

پڑھے۔ اور اگر فجر سے پہلے پاک ہوجائے تو مغرب اور عشاء کی نماز جمع کر کے پڑھے۔

لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کا استدلال اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کافر اگر ایسے وقت مسلمان ہو یا حائضہ ایسے وقت پاک ہو جو کسی نماز کا آخری وقت ہو تو اس پر صرف اسی ایک نماز کی ادائیگی لازم ہوگی، جس کا آخری وقت باقی تھا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

من ادرك ركعة من الصلوة فقد ادرك الصلوة (بخاری و مسلم)

''جس شخص کو نماز باجماعت کی ایک رکعت مل گئی اس کی یہ نماز باجماعت ہوگئی۔''

نفاس والی عورت اور نماز

سنن ابوداؤد میں ہے: ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نفاس والی عورت چالیس دن اور چالیس رات نماز نہیں پڑھتی تھی اور ہم چھائیاں دور کرنے کے لیے اپنے چہرے پر زعفران اور ورس سے بنا ہوا غازہ ملا کرتے تھے(۱)

حیض اور نفاس کے دنوں کی نمازوں کی قضا نہیں ہے

حیض اور نفاس کے دنوں میں عورت جو نمازیں نہیں پڑھ سکی ان کی قضاء نہیں ہے۔ صحیح مسلمؒ میں ہے کہ معاذہؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ حیض والی عورت کے لیے روزے کی تو قضا ہے لیکن نماز کی قضا نہیں ہے؟ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کیا تو خارجی ہے؟ اس نے کہا: خارجی تو نہیں ہوں ویسے یہ سوال کر رہی ہوں، آپ نے فرمایا: (وجہ کیا ہوگی) ہمیں جب حیض آتا تھا تو روزوں کی قضاء کا حکم دیا جاتا تھا لیکن نماز کی قضا کا حکم نہیں تھا۔

امام نوویؒ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے یہ جو

(۱) ورس یمن کا ایک پودا تھا جو کپڑے کو زرد رنگ دینے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس سے غازہ بنایا جاتا تھا۔

فرمایا کہ ''ہمیں روزوں کی قضا کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضاء کا حکم نہیں تھا۔'' تو یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ سب مسلمان علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حیض اور نفاس کے دنوں میں عورت پر نہ نماز پڑھنا فرض ہے اور نہ روزہ رکھنا اور اس پر بھی اجماع ہے کہ نماز کی قضا عورت پر فرض نہیں اور اس پر بھی اجماع ہے کہ روزوں کی قضا فرض ہے۔

علماء نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ نمازیں بہت جمع ہوجاتی ہیں کیوں کہ روزانہ پانچ بار نماز پڑھنا فرض ہے۔ اس لیے اس کی قضا میں تکلیف ہے۔ اس کے برعکس روزے سال میں صرف ایک ماہ کے فرض ہیں اور حیض بسا اوقات ایک دو دن آتا ہے۔ اس لیے روزے ایک دو یا اگر زیادہ بھی ہوں تو ان کی قضا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

ہمارے علماء (یعنی شافعیوں) کے نزدیک حیض کے دنوں کی کسی نماز کی قضا نہیں ہے سوائے طواف کی دو رکعتوں کے کہ اگر یہ رہ گئی ہوں تو ان کی قضا پڑھنا ضروری ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جو یہ سوال کیا کہ کیا تم خارجی ہو؟ تو اس کا مقصد یہ تھا کہ خارجی فرقہ کے لوگ حیض والی عورت کے لیے نمازوں کی قضا واجب قرار دیتے ہیں اور یہ بات مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔ حضرت عائشہؓ کا اس سوال سے مقصد یہ ظاہر کرتا تھا کہ خارجیوں کا یہ طریقہ جو انہوں نے حائضہ عورت کی نماز کے سلسلے میں اختیار کر رکھا ہے بہت برا ہے۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے معاذہؒ سے کہا کہ کیا تم خارجی ہو؟ ہمیں جب نبی کریم ﷺ کے زمانے میں حیض آتا تھا تو نماز قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ یعنی خود نبی کریم ﷺ یہ جاننے کے باوجود کہ ہمیں حیض آیا تھا اور ہم نے ان دنوں نماز نہیں پڑھی، نماز قضا کرنے کا حکم نہیں دیا کرتے تھے اور اگر قضا کرنا واجب ہوتا تو آپ ضرور حکم دیتے۔

امام شعرانی نے ''کشف الغمة'' میں یہ روایت نقل کی ہے کہ:

''ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کیا گیا کہ حضرت سمرہ بن

جندب رضی اللہ عنہ عورتوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ایام حیض کی فوت شدہ نمازوں کی قضا پڑھیں تو حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا: تم ہرگز قضا نہ پڑھنا کیوں کہ نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں سے جسے نفاس کا خون آتا وہ چالیس دن تک نماز نہیں پڑھتی تھی اور نہ نبی کریم ﷺ اسے نفاس کے دنوں کی نمازوں کی قضا پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔"

استحاضہ والی عورت کے لیے نماز کے احکام

"کتاب الطھارۃ" میں ہم استحاضہ کا بیان کر چکے ہیں اور اس کے بارے میں فقہاء کے اختلافات کا تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔

استحاضہ وہ خون ہے جو حیض اور نفاس کے دنوں کے علاوہ عورت کے رحم سے آتا ہے۔ چناں چہ وہ خون جو حیض اور نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت پوری ہونے کے بعد آئے یا حیض و نفاس کی کم سے کم مدت سے بھی کم وقت آئے یا حیض شروع ہونے کی عمر (یعنی نو سال کی عمر) سے بھی پہلے آئے وہ استحاضہ ہے۔

استحاضہ کے عارضہ میں عورت نماز نہیں چھوڑے گی

ام المومنین حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیشؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے مسلسل خون استحاضہ آتا ہے اور کبھی پاک نہیں ہوتی یعنی خون رکتا ہی نہیں تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا ...انما ذالك عرق و ليس بالحيضة فاذا اقبلت الحيضة فدعى الصلوٰة و ايذا ادبرت فاغسلى عنك الدم و صلى (بخاری ومسلم)

"نہیں... نماز نہ چھوڑو کیوں کہ یہ خون کسی رگ سے آرہا ہے، حیض کا خون نہیں ہے۔ اس لیے جن دنوں حیض کا خون آئے، نماز چھوڑ دو اور جب حیض ختم ہو جائے ان دنوں اپنے جسم سے خون دھو کر نماز پڑھ لیا کرو۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ استحاضہ والی عورت، ان دنوں کے سوا جن کے بارے میں یہ

قطعی علم ہو کہ یہ حیض کے دن ہیں، باقی دنوں میں باقاعدہ نماز پڑھے گی۔ اس مسئلہ پر سب فقہاء کا اجماع ہے۔

استحاضہ کا خون کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور کتنی ہی طویل مدت تک آئے نماز میں مانع نہیں۔ امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ بنت جحش رضی اللہ عنہا (جو کہ نبی کریم ﷺ کی سالی یعنی ام المومنین زینب بنت جحشؓ کی بہن اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی زوجہ تھیں) کو سات سال تک خون استحاضہ آتا رہا اور انہوں نے اس کے بارے میں نبی کریمؐ سے مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا:

ان هذه ليست بالحيضة و لكن هذا عرق فاغتسلي و صلي

"یہ حیض کا خون نہیں ہے کسی رگ سے آ رہا ہے۔ لہٰذا تم غسل کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔"

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہؓ اپنی بہن ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ایک ٹب میں غسل کیا کرتی تھیں اور اس کا پانی خون کی وجہ سے سرخ ہو جاتا تھا۔

نماز کے لیے استحاضہ والی عورت کی طہارت

اس مسئلہ میں مختلف فقہاء کے چار اقوال ہیں:

۱- ایک قول یہ ہے کہ استحاضہ والی عورت پر طہارت کے لیے صرف ایک مرتبہ غسل کرنا واجب ہے اور یہ غسل اس وقت کرے گی جب اس کا خون حیض ختم ہوگا جس کی علامات ہم کتاب الطہارۃ میں بیان کر چکے ہیں۔

یہ علماء جو صرف ایک مرتبہ غسل طہارت واجب ہونے کے قائل ہیں ان کے پھر دو گروہ ہیں:

ایک گروہ کے نزدیک ایسی عورت کے لیے جسے خون استحاض آتا ہو واجب ہے کہ

ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرے۔ ان علماء کی دلیل فاطمہ بنت ابی جحشؓ والی حدیث ہے جو ہم کتاب الطہارۃ میں بیان کر چکے ہیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور بعض علماء حدیث نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں مذکور ہے کہ نبی کریمؐ نے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش سے فرمایا تھا: توضئی لکل صلوٰۃ ''ہر نماز کے لیے وضو کرلیا کرو۔''

☆ لیکن دوسرا گروہ ہر نماز کے لیے وضو کرنا واجب قرار نہیں دیتا بلکہ اسے مستحب کہتا ہے یعنی اسے اختیار ہے اگر چاہے تو ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرلیا کرے اور چاہے تو ایک ہی بار کی طہارت (وضو) پر اکتفا کرے یعنی اگر وضو ٹوٹنے کا کوئی دوسرا سبب پیدا نہ ہو تو ایک ہی وضو سے دن بھر کی نمازیں پڑھ سکتی ہے۔ یہ مسلک امام مالک رحمۃ اللہ کا ہے۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر ہر نماز کے لیے غسل طہارت واجب ہے۔ ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو ابھی گزری ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ نے نبی کریم ﷺ سے فتویٰ پوچھا کہ مجھے استحاضہ کا خون آتا ہے تو آپ نے فرمایا: انما ذلك عرق فاغتسلی ثم صلی ''یہ حیض کا خون نہیں ہے بلکہ کسی رگ سے آرہا ہے، لہٰذا تم غسل کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔'' چناں چہ حضرت ام حبیبہؓ ہر نماز کے لیے غسل کیا کرتی تھیں۔

لیث بن سعدؒ کہتے ہیں کہ: ابن شہابؒ نے یہ نہیں کہا کہ نبی کریم ﷺ نے ام حبیبہؓ کو حکم دیا تھا کہ ہر نماز کے لیے غسل کیا کرو، بلکہ ایسا وہ اپنی مرضی سے کیا کرتی تھیں۔

حضرات ابن عمرؓ، ابن الزبیرؓ اور عطاء بن ابی رباحؒ سے بھی یہی قول مروی ہے کہ استحاضہ والی عورت ہر نماز کے لیے غسل طہارت کرے۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ دن میں تین بار غسل طہارت کرے۔

جن علماء کی یہ رائے ہے وہ کہتے ہیں کہ استحاضہ والی عورت پر واجب ہے کہ نماز ظہر کو عصر کے وقت تک موخر کرے اور غسل کر کے دونوں نمازیں جمع کر کے ایک ہی وقت پڑھے۔ اسی طرح نماز مغرت کو آخر وقت تک موخر کرے اور جب عشاء کا اول وقت ہوجائے تو دوبارہ غسل طہارت کرے اور مغرب و عشاء کی نمازیں جمع کر کے ایک ہی وقت میں

پڑھے۔ پھر تیسرا غسل طہارت فجر کی نماز کے لیے کرے، گویا اس طرح ان لوگوں نے اس پر ایک دن رات یعنی چوبیس گھنٹوں میں تین بار غسل کرنا واجب قرار دیا ہے۔

یہ لوگ اپنے مسلک کے ثبوت میں اس روایت کو پیش کرتے ہیں، جو ابوداؤد نے نقل کی ہے اور جسے ابو محمد بن حزمؒ نے صحیح کہا ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا، یا رسول اللہ! فاطمہ بنت ابی حبیش کو استحاضہ کا عارضہ ہے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> لتغتسل للظهر و العصر غسلا واحدا و للمغرب والعشاء غسلا واحدا و تغتسل للفجر و تتوضا فيما بين ذلك.
>
> ''اسے چاہیے کہ ظہر اور عصر کی دو نمازوں کے لیے ایک غسل کرلیا کرے اور مغرب وعشاء کی دو نمازوں کے لیے بھی ایک غسل کرلیا کرے اور پھر فجر کی نماز کے لیے بھی غسل کیا کرے، اور ان اوقات کے درمیان (اگر نماز پڑھنا چاہے تو) وضو کرلیا کرے۔''

اور امام شعرانیؒ نے ''کشف الغمہ'' میں لکھا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا کو استحاضہ کا عارضہ لاحق تھا تو نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ ہر نماز کے لیے غسل کیا کریں، لیکن جب ہر نماز کے لیے غسل کرنا ان کے لیے مشکل ہوگیا تو آپ نے حکم دیا کہ ایک غسل کر کے ظہر اور عصر کی دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھ لیا کرو اور مغرب وعشاء کی دو نمازیں ایک غسل سے جمع کر کے پڑھ لیا کرو اور نماز فجر کے لیے الگ غسل کیا کرو اور ان اوقات کے درمیان وضو کرلیا کرو۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے: آپ نے فرمایا کہ اگر تم کرسکو تو ہر نماز کے لیے نیا غسل کرلیا کرو، ورنہ نمازوں کو جمع کرلیا کرو (یعنی جیسا کہ مذکورہ بالا روایت میں ہے کہ ظہر اور عصر کے لیے ایک غسل اور مغرب وعشاء کے لیے ایک غسل)۔

۴- چوتھا قول یہ ہے کہ استحاضہ والی عورت پر ایک دن رات میں یعنی چوبیس گھنٹوں

میں ایک غسل طہارت واجب ہے۔

جن علماء کا یہ قول ہے کہ استحاضہ والی عورت پر چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک غسل واجب ہے ان میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے اس ایک غسل کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا یعنی دن رات میں جب چاہے ایک بار غسل کرے، یہ رائے حضرت علیؓ سے مروی ہے اور بعض کے نزدیک پہلے دن ظہر کی نماز کے لیے غسل کرے۔ پھر دوسرے دن ظہر کے وقت غسل کرے۔ یہ رائے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی ہے۔ آپ فرمایا کرتی تھیں کہ وہ عورت جسے استحاضہ کا خون آتا ہو روزانہ نمازِ ظہر کے وقت غسل کرلیا کرے اور حضرت سعید بن المسیب اور امام حسن بصری رحمہما اللہ سے بھی یہی رائے مروی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''معلوم ہونا چاہیے کہ استحاضہ والی عورت پر نہ تو کسی نماز کے لیے اور نہ دن میں کسی خاص وقت پر غسل کرنا واجب ہے بلکہ اس پر صرف ایک غسل واجب ہے اور وہ اس وقت جب حیض کا خون آنا بند ہو۔''

علمائے متقدمین و متاخرین میں سے جمہور کا یہی مسلک ہے اور یہی رائے حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور عروہ بن زبیر، ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں:

> ''جمہور علماء کی دلیل یہ ہے کہ غسل کے سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ غسل فی نفسہٖ واجب نہیں ہے لہٰذا سوائے ان حالتوں کے جہاں شریعت نے وجوب غسل کا حکم دیا ہے کسی اور حالت میں اسے واجب نہیں کیا جاسکتا۔ نبی کریم ﷺ سے بھی صحیح سند سے یہ بات ثابت نہیں کہ آپ نے استحاضہ والی عورت کو ایک موقع کے علاوہ کسی اور غسل کا حکم دیا ہو اور یہ موقع وہ ہے جب اسے حیض آنا بند ہو۔

آپ کا ارشاد ہے:

اذا اقبلت الحیضۃ فدعی عن الصلوٰۃ و اذا ادبرت فاغتسلی

''جب حیض آنا شروع ہو تو نماز چھوڑ دو اور جب بند ہو جائے تو غسل کرلو۔''

اس ارشاد میں کوئی ایسا لفظ نہیں، جس سے بار بار غسل کرنے کا مفہوم لیا جا سکے۔

''باقی جو حدیثیں سنن ابو داؤد اور بیہقی وغیرہ میں ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے استحاضہ والی عورت کو ایک سے زیادہ مرتبہ غسل کرنے کا حکم دیا ہے تو ان میں سے کوئی حدیث بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ بلکہ خود امام بیہقی اور کچھ دوسرے متقدمین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ان تمام روایات میں صحیح روایت وہ ہے جو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے صحیحین میں درج کی ہے اور وہ یہ ہے: ام حبیبہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کو استحاضہ کا خون آتا تھا تو ان سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

انما ذلك عرق فاغتسلی ثم صلّی

''یہ کوئی رگ ہے، جس سے خون آ رہا ہے لہٰذا تم غسل کرلیا کرو پھر نماز پڑھ لیا کرو۔''

چناں چہ وہ ہر نمازِ کے وقت غسل کیا کرتی تھیں۔

امام شافعیؒ نے لکھا ہے:

''نبی کریم ﷺ نے انہیں صرف یہ حکم دیا تھا کہ غسل کرلیا کرو اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ آپ نے انہیں ہر نماز کے لیے غسل کرنے کا حکم دیا تھا۔''

امام شافعیؒ مزید لکھتے ہیں:

''ماشاء اللہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ام حبیبہؓ جو غسل کیا کرتی تھیں وہ اپنی خوشی سے تھا۔ ایسا کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا اور اس میں ان کے لیے کافی وسعت تھی۔''

امام شافعیؒ نے جو بات فرمائی ہے وہ ہم نے انہی کے الفاظ میں بیان کردی ہے۔

امام شافعیؒ کے استاد امام سفیان عیینہ اورلیث بن سعدؒ وغیرہ کا قول بھی اس کے بارے میں یہی ہے اور ان سب کے الفاظ قریب قریب یکساں ہیں۔

خلاصۂ بحث

استحاضہ والی عورت پر صرف ایک بار غسل طہارت واجب ہے اور وہ اس وقت جب حیض آنا بند ہو۔ اس کے علاوہ اگر چاہے تو ہر نماز کے لیے غسل کرے۔ چاہے دن میں تین بار غسل کرے اور چاہے دن رات میں ایک بار غسل کرے۔ یہ تمام غسل اختیاری ہیں۔ یعنی اگر صرف ایک بار حیض سے فارغ ہوکر غسل کرنے پر اکتفا کرے تو بھی کوئی حرج نہیں۔

اسی طرح اس پر ہر نماز کے لیے وضو کرنا بھی واجب نہیں ہے۔ البتہ مستحب ضرور ہے۔(۱)

استحاضہ والی عورت کو نماز کے وقت کیا کرنا چاہیے؟

امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

جب استحاضہ والی عورت نماز پڑھنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وضو کرنے میں احتیاط برتے اور نجاستِ خون سے طہارت میں بھی احتیاط اختیار کرے۔ اسے چاہیے کہ وضو یا تیمّم سے پہلے اپنی شرم گاہ کو پانی سے دھوئے اور خون کی نجاست کو روکنے یا کم کرنے کے لیے روئی یا کپڑے کا ٹکڑا لے کر اسے شرم گاہ میں رکھ لے۔ اب اگر خون کی آمد کم ہے اور صرف اس تدبیر سے اس کا بہنا رک سکتا ہے تو بس یہی کافی ہے، کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر اس طرح خون نہیں رکتا تو پھر کس کر لنگوٹ باندھے۔ ہمارے علماء یعنی شافعیوں کے نزدیک کثرتِ خون کی صورت میں لنگوٹ کس کر باندھنا واجب ہے۔ سوائے درج ذیل صورتوں کے:

۱- اگر لنگوٹ باندھنا باعث تکلیف ہو۔ مثلاً اس طرح خون زیادہ جمع ہو جاتا ہو تو

---

(۱) حنفی مسلک کے مطابق صاحب عذر پر نماز کے لیے نیا وضو واجب ہے۔ (مترجم)

لنگوٹ باندھنا ضروری نہیں کیوں کہ اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔

۲- دوسرے اگر وہ روزے دار ہے تو ان میں روئی یا کپڑے کا ٹکڑا شرم گاہ میں نہ رکھے صرف کس کر لنگوٹ باندھ لینا کافی ہے۔

ہمارے علماء کے نزدیک وضو سے پہلے شرم گاہ میں روئی یا کپڑے کا ٹکڑا رکھنا اور لنگوٹ باندھنا واجب ہے اور لنگوٹ باندھنے کے فوراً بعد بغیر کسی تاخیر کے وضو کرے۔ اگر لنگوٹ باندھ لیا لیکن وضو کرنے میں دیر کی اور کافی وقت گزر گیا پھر وضو کیا تو اس کے بارے میں دو قول ہیں، جن میں سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں وضو درست نہ ہوگا۔

اب اگر کسی عورت نے لنگوٹ کس کر باندھ لیا اور روئی یا کپڑے کا ٹکڑا بھی رکھا اسی طرح جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، پھر بھی خون نکلتا رہا جس میں اس کی کوتاہی کو دخل نہیں تو اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا اور نماز باطل نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ اگر فرض نماز کے بعد نوافل بھی پڑھنا چاہے تو اسی وضو سے پڑھ سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں خون مریض کی طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی اور صورت حال ایسی ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

لیکن اگر خون اس وجہ سے خارج ہو رہا ہے کہ اس نے لنگوٹ باندھنے میں کوتاہی کی ہے یا لنگوٹ ڈھیلا ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا جس کے نتیجے میں خون زیادہ خارج ہونے لگا تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر نماز پڑھتے ہوئے یہ صورت حال پیدا ہوئی تو نماز باطل ہو جائے گی لیکن اگر فرض نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایسا ہوا تو فرض نماز تو صحیح ہوگی، لیکن وہ اب اس وضو سے نفل نہیں پڑھ سکتی کیوں کہ اس میں اس کی اپنی کوتاہی شامل ہے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ شرم گاہ کو ہر فرض نماز کے وقت دھویا جائے اور اس میں روئی یا کپڑے کا ٹکڑا رکھا جائے تو اس کے بارے میں یہ ہے کہ اگر لنگوٹ اپنی جگہ سے ہٹ گیا لیکن خون ظاہر نہیں ہوا تو اس سلسلے میں علماء شافعیہ کے دو قول ہیں جن میں سے میں صحیح قول یہ ہے کہ لنگوٹ بھی نیا باندھے اور وضو بھی دوبارہ کرے یہ ہے جو اس مسئلہ کے بارے میں امام نووی نے لکھا ہے اور شافعی علماء کی رائے یہی ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ استحاضہ والی عورت پر ہر

نماز کے لیے اپنی شرم گاہ کو دھونا اور اس میں روئی یا کپڑے کا ٹکڑا رکھنا اور لنگوٹ باندھنا واجب نہیں ہے البتہ بہتر ضرور ہے۔ (۱)

جمہور علماء کی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے کہ استحاضہ والی عورت کو چاہیے کہ کسی بھی نماز کے لیے اس کا وقت شروع ہونے سے پہلے وضو نہ کرے کیوں کہ اس کی طہارت عذر کی وجہ سے بر بنائے ضرورت ہے۔ لہٰذا اسے اسی وقت حاصل ہونا چاہیے جب اس کی ضرورت ہو۔ وقت سے پہلے نہیں ہونا چاہیے۔

عورت کے لیے اذان کے وقت موذن کے کلمات کو دہرانا

اذان کے وقت عورت کے لیے مستحب ہے (خواہ اسے حیض یا نفاس آرہا ہو یا بحالت جنابت ہو) کہ موذن کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کو دہراتی جائے جو موذن کہتا ہے البتہ جب موذن حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح (نماز کے لیے آؤ، فلاح اور نجات کی طرف آؤ) کہے تو جواب میں لا حول ولا قوۃ الا اللہ العلی العظیم (اللہ، برتر و عظیم کی مدد کے بغیر کوئی چارہ گری اور کوئی قوت حاصل نہیں ہوسکتی) کہنا چاہیے۔

اور فجر کی اذان میں جب موذن الصلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) کہے تو کہنا چاہیے: صدقت و بررت (تونے سچ کہا اور نیکی کی بات کہی)۔

لیکن احناف کے نزدیک عورت اگر حیض و نفاس کی حالت میں ہو تو اس کے لیے موذن کے کلمات کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ کیوں کہ اس حالت میں عورت عملی طور پر نماز نہیں پڑھ سکتی۔ لہٰذا اسے زبان سے بھی ایسا نہیں کہنا چاہیے۔

عورت کے لیے تکبیر اقامت کہنا

تکبیر اقامت سے مراد یہ ہے کہ مخصوص الفاظ بول کر نماز کی جماعت کے قیام کا اعلان کیا جائے۔ مختلف علاقوں کے فقہاء کی رائے میں مردوں کے لیے تکبیر اقامت کہنا اذان

(۱) فقہ السنہ للشیخ سید سابق رحمہ اللہ

سے بڑھ کر سنت مؤکدہ ہے۔

تکبیر اقامت کے الفاظ

☆ **مالکیوں کے نزدیک تکبیر اقامت کے کلمات یہ ہیں:**

الله اکبر، الله اکبر ....اشهد ان لا اله الا الله

اشهد ان محمدا رسول الله ....حی علی الصلوٰة

حی علی الفلاح ....قد قامت الصلوٰة

الله اکبر، الله اکبر ....لا اله الا الله

☆ **شافعیوں کے نزدیک بھی تکبیر اقامت مالکیوں کی طرح ہی ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ شافعیؒ قد قامت الصلوٰۃ دوبار کہتے ہیں۔**

☆ **حنفیوں کے نزدیک اقامت کے شروع میں اللہ اکبر چار بار کہنا چاہیے اور آخر میں دوبار، باقی الفاظ دو دو بار کہے جائیں۔**

نماز کی تکبیر اقامت کہنا ثواب کا کام ہے اور اقامت کے بعد جو دعا مانگی جائے وہ رد نہیں ہوتی۔ حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا ترد علی داع دعوته حین تقام الصلوٰة و فی الصف فی سبیل الله (رواه ابن حبان)

''کسی دعا مانگنے والے کی، دو موقعوں پر مانگی ہوئی دعا رد نہیں کی جاتی، ایک اس وقت جب نماز کی جماعت کھڑی ہوتی ہے، دوسرے جب دعا مانگنے والا جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے صف میں کھڑا ہو۔''

نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

الدعا بین الاذان والاقامة لا یرد (رواه ابوداؤدؒ، و ترمذیؒ و نسائیؒ و ابن خزیمةؒ و ابن حبانؒ)

''اذان اور تکبیر کے درمیان جو دعا مانگی جائے وہ رد نہیں ہوتی۔ یعنی ضرور قبول

ہوتی ہے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بات واضح ہے کہ عورت اذان نہیں دے سکتی تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ عورت کو تکبیر اقامت کہنا چاہیے؟

☆ جمہور فقہاء کا قول یہ ہے کہ تکبیر اقامت کا حکم بھی وہی ہے جو اذان کا ہے یعنی عورت کو تکبیر اقامت بھی نہیں کہنا چاہیے۔

☆ مالکی کہتے ہیں کہ اگر عورت نماز کے لیے تکبیر اقامت کہے تو اچھا ہے یعنی کارِ ثواب اور مستحب ہے۔ اگر نہ کہے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر بالغ مرد (ایک یا زیادہ) موجود ہوں تو عورت کو تکبیر اقامت کہنا جائز نہیں۔

☆ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ عورت اگر اذان اور اقامت کہے تو اچھا ہے۔

☆ اسحاقؒ کہتے ہیں کہ عورتوں کے لیے اذان اور اقامت دونوں ضروری ہیں۔

☆ ابن منذرؒ نے لکھا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اذان بھی کہتی تھیں اور اقامت بھی۔

اصل اختلاف اس بات میں ہے کہ عورت امامت کرا سکتی ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ درحقیقت عورت عبادت کے معاملے میں ہر لحاظ سے مرد کی مانند ہے الا یہ کہ کسی خاص عبادت کے سلسلے میں کوئی دلیل موجود ہو کہ اس میں عورت مرد سے مختلف ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ بعض عبادات میں عورت پوری طرح مرد کی مثل ہے اور بعض میں مرد سے مختلف ہے، بشرطیکہ شرعی دلیل موجود ہو۔(۱)

عورت کا نماز کے لیے مسجد میں جانا

احادیث نبویؐ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کو مسجد جانے سے منع نہیں کیا جا سکتا۔

امام بخاری نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی فجر اور عشاء کی نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے مسجد جایا کرتی تھیں، ان سے کہا گیا: "آپ کو معلوم ہے کہ

---

(۱) بدایۃ المجتہد، ج۱، ص۱۱۹

حضرت عمرؓ خواتین کا مسجد جانا پسند نہیں کرتے اور غیرت کھاتے ہیں پھر آپ کیوں جاتی ہیں؟ انہوں نے کہا: حضرت عمرؓ مجھے خود منع کیوں نہیں کرتے۔ مجھے روکنے میں انہیں کیا چیز مانع ہے؟ اس شخص نے جواب دیا: اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے نہ روکو۔''

بس یہی بات انہیں آپ کو روکنے میں مانع ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اذا استاذنت احدکم امراته الی المسجد فلا یمنعها

''اگر کسی شخص سے اس کی بیوی مسجد جانے کی اجازت طلب کرے تو وہ اسے نہ روکے۔''

لا تمنعوا اماء الله مساجد الله

''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے نہ روکو۔''

ان دو حدیثوں اور ان کے علاوہ اس سلسلہ میں وارد احادیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ عورت کو مسجد جانے سے منع نہ کیا جائے۔

امام نوویؒ اس بارے میں لکھتے ہیں:

''لیکن یہ حکم درج ذیل امور کے ساتھ مشروط ہے، جنھیں علماء نے احادیث نبویہؐ ہی سے اخذ کیا ہے۔

۱-عورت نے خوشبو نہ لگا رکھی ہو۔

۲- سج بن کر نہ جائے۔

۳- ایسی پازیب نہ پہن رکھی ہوں جن کے بجنے کی آواز سنائی دے۔

۴- لباس فاخرہ نہ پہن رکھا ہو۔

۵- اس طرح نہ جائے کہ مردوں کے ساتھ اختلاط ہو۔

۶- اور نہ ایسی جوان اور حسین ہو کہ فتنہ پیدا ہونے کا خوف ہو۔

۷- راستہ محفوظ ہو یعنی راستے میں کوئی ایسی صورت نہ ہو جس سے فساد پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔

حدیث میں عورت کو مسجد جانے سے نہ روکنے کا جو حکم ہے یہ کراہت تنزیہی پر محمول ہے یعنی اگر عورت کا خاوند یا آقا ہے اور مندرجہ بالا شرائط بھی پائی جاتی ہیں تو پھر منع کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ لیکن اگر ایسی عورت ہے جس کا خاوند یا آقا نہیں ہے اور سب شرطیں پائی جاتی ہیں تو پھر اسے مسجد جانے سے منع کرنا حرام ہے۔''

ام المومنین حضرت عائشہؓ کی طرف سے تنبیہ

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''اب عورتوں نے جو نئی باتیں پیدا کرلی ہیں اگر یہ سب نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں ہوتا تو آپ عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع فرما دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا۔''

حضرت عائشہؓ کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ اب عورتوں نے آداب اسلامی کو ملحوظ رکھنا چھوڑ دیا ہے اور اسلام نے مسجد میں جانے کے لیے عورت پر جو شرائط عائد کی ہیں کہ بنی ٹھنی نہ ہوں، خوشبو نہ لگا رکھی ہوں، بھڑکیلا لباس نہ پہن رکھا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اب انہوں نے ان کا التزام کرنا چھوڑ دیا ہے جس کی وجہ سے فتنہ کا خوف رہتا ہے۔ گویا آپ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ عورت اگر مسجد جائے تو ان شرائط کی پابندی کرے جو علماء نے اس سلسلے میں بتائی ہیں اور جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

عورت کا گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے

لیکن عورت کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں نماز پڑھے، جس کا ثواب بھی زیادہ ہے اور مستحسن بھی ہے۔ بلکہ عورت کے لیے سنت موکدہ یہی ہے۔ اس سلسلے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں۔

۱- امام احمد بن حنبلؒ اور ابن خزیمہؒ نے حضرت ام حمیدؓ سے (جو کہ حضرت ابو حمید ساعدیؓ کی زوجہ تھیں) روایت کیا ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا:

یا رسول اللہ! مجھے آپ کے ساتھ نماز پڑھنا بہت پسند ہے۔ آپ نے فرمایا:

قد علمت انک تحبین الصلٰوۃ معی و صلٰوتک فی بیتک خیر من صلوتک فی حجرتک و صلٰوتک فی حجرتک خیر من صلوتک فی دارك و صلوتك فی دارك خیر من صلوتك فی مسجدی.

''مجھے معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہو۔ لیکن تمہاری وہ نماز جو تم گھر کے اندرونی کمرے میں پڑھو اس نماز سے بہتر ہے، جو برآمدہ میں پڑھی جائے اور برآمدہ والی نماز اس نماز سے بہتر ہے، جو تم گھر کے صحن میں پڑھو اور صحن والی نماز اس نماز سے بہتر ہے جو تم میری مسجد میں پڑھو۔''

راوی بیان کرتے ہیں کہ پھر ام حمیدؓ نے اپنے گھر کے سب سے آخری اور تاریک ترین گوشے میں اپنے لیے نماز کی جگہ بنالی اور جب تک زندہ رہیں اسی جگہ نماز پڑھتی رہیں۔

۲- امام احمدؒ اور امام طبرانیؒ نے اپنی معجم کبیر میں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

خیر مساجد النساء قعر بیوتھن

''عورت کی سب سے بہتر مسجد اس کے گھر کا اندرونی حصہ ہے۔''

۳- نیز طبرانی نے ہی اپنی معجم اوسط میں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ: ''عورت جو نماز اپنے گھر کے اندرونی کمرے میں پڑھے، اس نماز سے بہتر ہے، جو وہ برآمدے میں پڑھے۔ اور برآمدے کی نماز اس نماز سے بہتر ہے، جو وہ گھر کے صحن میں پڑھے اور گھر کے صحن کی نماز اس نماز سے بہتر ہے جو وہ محلّہ کی مسجد میں پڑھے۔

۴- ابوداؤد علیہ الرحمہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی

کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تمنعوا نسائکم المساجد و بیوتھن خیر لھن

"اپنی عورتوں کو مسجد جانے سے منع نہ کرو لیکن ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔"

یعنی گھر میں نماز پڑھنا ان کے لیے افضل ہے۔

۵- طبرانی علیہ الرحمہ نے معجم کبیر میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ: عورت کی نمازوں میں سے اللہ تعالیٰ کو اس کی وہ نماز سب سے زیادہ پسند ہے جو وہ اپنے گھر کے تاریک ترین گوشہ میں پڑھتی ہے۔

اس مسئلہ میں فقہی آراء

☆ مالکیوں کے نزدیک عورت کے لیے مسجد کی بجائے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے اور عورتوں کے لیے باجماعت نماز پڑھنا باعث ثواب ہے۔ بشرطیکہ امام مرد ہو۔

☆ حنبلیوں کی رائے میں عورتوں کے لیے باجماعت نماز پڑھنا سنت ہے بشرطیکہ مردوں سے الگ پڑھیں۔ امام خواہ مرد ہو یا عورت اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن حسین عورت کا مردوں کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے اور غیر حسین عورت مردوں کے ساتھ نماز پڑھے تو مباح ہے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک عورتوں کا گھر میں باجماعت نماز پڑھنا مسجد میں نماز باجماعت سے افضل ہے اور عورتوں کے لیے باجماعت نماز باعث ثواب ہے یعنی سنت مؤکدہ ہے۔

☆ حنفیوں کی رائے میں عورتوں کا باجماعت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے جب کہ امام عورت ہو۔ اگرچہ عورت امامت کرائے گی تو اس کی امامت بھی صحیح ہوگی اور اس طرح جو نماز پڑھی جائے گی وہ بھی ہو جائے گی۔ لیکن اگر امامت مرد نے کی ہے تو اگر یہ باجماعت نماز مسجد میں پڑھی گئی ہے تب تو مرد کی امامت مکروہ نہیں۔ اگرچہ عورتوں کا مسجد جانا خوف فتنہ کی بنا پر

مکروہ ہے۔ اور اگر مرد نے گھر میں عورتوں کی امامت کی ہے اور وہ مرد خاوند اور محرم کے علاوہ ہے اور اس وقت گھر میں اس امام کے سوا کوئی اور مرد بھی نہیں ہے تو اس مرد کی امامت مکروہ ہے لیکن اگر گھر میں خاوند یا محرم امامت کرائے یا مرد کی امامت کے وقت امام کے علاوہ کوئی مرد بھی موجود ہو تو پھر مکروہ نہیں ہے۔

نماز باجماعت میں عورت کہاں کھڑی ہو؟

سنت طریقہ یہ ہے کہ باجماعت نماز میں عورت مرد کے یا اگر امام کے علاوہ اور مرد بھی ہوں تو سب مردوں کے پیچھے کھڑی ہو۔ لیکن اگر صرف ایک ہی مرد ہو جو امامت کر رہا ہو یا خاوند اور بیوی باجماعت نماز پڑھ رہے ہوں تو عورت پھر بھی مرد کے پیچھے کھڑی ہو۔

اس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۱- صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت انس اور ان کی والدہ یا خالہ کو باجماعت نماز پڑھائی تو حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ آپ نے مجھے دائیں جانب کھڑا کیا اور عورت کو ہمارے پیچھے کھڑا کیا۔

اور امام مالکؒ نے یہی حدیث حضرت انسؓ سے اس طرح روایت کی ہے کہ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اور ایک یتیم بچے نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے صف باندھی اور بڑھیا ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی۔

۲- امام شعرانیؒ نے ''کشف الغمۃ'' میں یہ روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ مردوں کی صف بچوں کے آگے بنوایا کرتے تھے اور بچوں کو عورتوں کے آگے صف میں کھڑا کرتے تھے۔

اور نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے: مردوں کی بہترین صف وہ ہے جو سب سے آگے ہو اور سب سے بری صف وہ ہے جو پیچھے ہو اور عورتوں کی بہترین صف وہ ہے جو سب سے پیچھے ہو اور بدترین صف وہ ہے جو سب سے آگے ہو۔

عورت کے لیے نماز باجماعت کے آداب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنا سر سجدے سے اس وقت تک نہ اٹھائے جب تک مرد اپنے سر نہ اٹھالیں، کیوں کہ حضرت سہل بن سعدؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں لوگ اس حالت میں نماز پڑھا کرتے تھے کہ اپنے تہبندوں کو بچوں کی مانند اپنی گردن میں گرہ دے کر باندھ لیا کرتے تھے اور اس وقت عورتوں سے کہا جاتا تھا کہ جب تک مرد اٹھ کر سیدھے نہ ہوجائیں تم اپنا سر سجدے سے نہ اٹھانا۔

اس روایت کے سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ اس وقت (کپڑے کی قلت کی وجہ سے ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھی جاتی تھی) لوگ اپنے تہبند گردن میں گرہ دے کر باندھ لیا کرتے تھے اور اس طرح رکوع و سجود کے وقت کبھی ان کا ستر کھل جاتا تھا لہٰذا عورتوں سے کہا جاتا تھا کہ وہ اپنا سر مردوں کے بیٹھنے سے پہلے نہ اٹھائیں۔

عورت کی امامت

باجماعت نماز میں یہ جائز نہیں ہے کہ عورت مردوں کی امامت کرے۔ کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

لا تؤمّن امرأة رجلاً (ابن ماجہؒ)

''ہرگز کوئی عورت کسی مرد کی امامت نہ کرے۔''

اور بخاریؒ، احمدؒ بن حنبلؒ، ترمذیؒ اور نسائیؒ نے حضرت ابوبکرہؓ سے اور طبرانیؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے:

لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأة

''ہرگز نہیں فلاح پاسکتی وہ قوم جو اپنے معاملات کی باگ ڈور عورت کے سپرد کردے۔''

نیز نبی کریم ﷺ عورتوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ گھر میں اذان دینے کی جگہ مقرر

کریں اور نماز باجماعت کے لیے ان میں سے ایک عورت باقی عورتوں کی امامت کرے۔

چناں چہ ابوداؤد میں ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت ام ورقہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ سے اپنے گھر میں اذان دینے کی جگہ مقرر کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ نے انہیں اجازت دے دی اور حکم دیا کہ اپنے گھر کی عورتوں کی امامت کیا کرو۔

ام المومنین حضرت عائشہ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما نماز میں عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں لیکن صف میں عورتوں کے برابر کھڑی ہوا کرتی تھیں، آگے نہیں۔

اس مسئلہ میں فقہی آراء

عورت کی امامت کے مسئلہ پر فقہاء میں اختلاف ہے:

جمہور فقہاء کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ عورت، مردوں کی امامت کرے۔ البتہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ عورت کے لیے عورتوں کی امامت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ امام شافعیؒ اس کو جائز سمجھتے ہیں اور امام مالکؒ کے نزدیک عورت کا عورتوں کی امامت کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن ابوثورؒ اور طبریؒ نے جمہور سے اختلاف کیا ہے اور انتہائی عجیب رائے کا اظہار کیا ہے کہ عورت کے لیے مردوں اور عورتوں دونوں کی امامت کرنا جائز ہے۔

جمہور فقہاء کا اس مسئلہ میں کہ عورت مردوں کی امامت نہیں کرسکتی۔ اتفاق اس بنا پر ہے کہ اگر یہ جائز ہوتا تو قرنِ اول سے اس کی کوئی روایت ملتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بالاتفاق ناجائز ہے نیز عورتوں کے لیے باجماعت نماز میں کھڑا ہونے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ صف میں مردوں کے پیچھے کھڑی ہوتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا آگے کھڑا ہونا جائز نہیں اور پھر نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ہے:

اخّروھن حیث اخّرھن اللّٰہ

”عورتوں کو پیچھے رکھو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پیچھے رکھا ہے۔“

اور بعض علماء نے جو نماز میں عورتوں کے لیے عورت کا امامت کرنا جائز قرار دیا ہے

بشرطیکہ سب ترتیب میں برابر ہوں یعنی امام صف کے آگے نہ کھڑی ہو تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ بھی بعض صحابۂ کرامؓ سے منقول ہے۔

جن علماء نے عورتوں کے لیے عورت کی امامت کو جائز کہا ہے ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت ام ورقہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور آپ نے ان کے لیے گھر میں ایک جگہ مقرر فرمائی جہاں اذان دی جاتی تھی اور انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کی امامت کیا کریں۔(۱)

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر مقتدی مرد یا مخنث ہو تو امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ حقیقتاً مرد ہو۔ چناں چہ مردوں کے لیے عورت کا یا خنثِ مشکل (وہ مخنث جس کی تعیین جنس مشکل ہو) کا امام بننا جائز نہیں، نہ فرض نماز میں اور نہ نفل نماز میں۔ لیکن اگر مقتدی عورتیں ہوں تو ان کی امامت کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ امام مرد ہی ہو۔ بلکہ عورت اور مخنث بھی امام ہو سکتے ہیں جیسا کہ امام شافعیؒ کا قول ہے۔ اس کے باوجود شافعیوں کے نزدیک افضل یہی ہے کہ عورتوں کا امام مرد ہو۔

البتہ مالکیوں کے نزدیک عورت امامت نہیں کر سکتی نہ فرض نماز میں نہ نفلوں میں، نہ مردوں کی اور نہ عورتوں کی۔ اگر کسی نے عورت کی اقتدا میں نماز پڑھی، خواہ نماز پڑھنے والا مرد ہو یا عورت تو مالکیوں کے ہاں فتویٰ اس پر ہے کہ وہ اپنی نماز دہرائے۔ البتہ امامت کرانے والی عورت کی اپنی نماز صحیح ہو جائے گی خواہ اس نے امامت کی نیت کی ہو یعنی اسے اپنی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت ام ایمنؓ کے بیٹے روایت کرتے ہیں کہ ام ایمنؓ اپنے جیسی عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں۔(۲)

حنفیوں کے نزدیک عورت اگر عورتوں کی امامت کرے تو اس کی امامت بھی درست ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے والی عورتوں کی نماز بھی صحیح ہوگی لیکن یہ فعل یعنی عورت کا امامت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

---

(۱) بدایۃ المجتہد لابن رشد، ج۱، ص۱۰۵ (۲) بدایۃ المجتہد لابن رشد، ج۱، ص۱۰۵

امامت کی صورت میں عورت کہاں کھڑی ہو؟

اگر عورت عورتوں کی امامت کرے تو ضروری ہے کہ وہ بھی صف میں دوسری عورتوں کے برابر کھڑی ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں اور صف میں ان کے درمیان ہی کھڑی ہوا کرتی تھیں۔ آگے کھڑی نہیں ہوتی تھیں۔

عیدین کی نماز اور خواتین

عورت کے نماز کے لیے جانے کے مسئلے پر سلف صالحین اور فقہاء کا اختلاف ہے (سلف صالحین سے مراد صحابہ کرام و تابعین عظام رضی اللہ عنہم ہیں)۔

ایک گروہ کا خیال تھا کہ نماز عید کے لیے جانا عورت پر اللہ کا حق ہے، جس سے منع نہیں کیا جاسکتا۔ یہ رائے حضرت ابوبکر، حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کی تھی۔

اور بعض حضرات عورتوں کو نماز عید کے لیے جانے سے منع کرتے تھے، منع کرنے والوں میں حضرت عروۃ بن الزبیر، قاسم، یحییٰ انصاری، امام مالک اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ شامل ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اس سلسلے میں دو قول منسوب ہیں۔ ایک قول کے مطابق امام صاحب کے نزدیک عورت کو نماز عید کے لیے جانا جائز ہے اور دوسرے قول کے مطابق ناجائز ہے۔(1)

حضرت ام عطیہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہم سب لڑکیاں، بالیاں اور چادر والی عورتیں نماز عید کے لیے جائیں اور حیض والی عورتوں کو حکم دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے نماز پڑھنے کی جگہ سے ذرا ہٹ کر رہیں۔ (بخاری و مسلم)

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ہمارے یعنی شافعیؒ علماء کے نزدیک ایسی عورتوں کو نمازِ عید کے

---

(1) شرح نووی علی صحیح مسلم، مطبوعہ مطبع شعیب۔ ص ۵۴۱

لیے جانا جو بنی ٹھنی اور خوب صورت کپڑے پہنے ہوئے ہوں، مستحب ہے اور اس بات کا جواب کہ نبی کریم ﷺ نے تو بلا امتیاز سب عورتوں کو جو چادر والیاں اور پردہ دار ہوں نماز عید کے لیے جانے کا حکم دیا تھا، انھوں نے یہ دیا ہے کہ اس زمانے میں آج کل کے برعکس فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ نہیں تھا، اس لیے آپ نے اجازت دی تھی۔

اور ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ ہم سب عورتوں کو عیدین کی نماز کے لیے جانے کا حکم دیا جاتا تھا، پردہ دار کو بھی اور کنواری کو بھی۔ اور حیض والیوں کے لیے حکم تھا کہ وہ بھی جائیں لیکن سب سے پیچھے رہیں (نماز میں شریک نہ ہوں) اور لوگوں کے ساتھ تکبیریں کہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حیض اور جنابت کی حالت میں عورت اللہ کا ذکر کرسکتی ہے۔ اس کے لیے صرف قرآن کریم کی تلاوت حرام ہے۔ نیز حیض والی عورتوں کو نبی کریم ﷺ نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے نماز پڑھنے کی جگہ سے ذرا دور رہیں۔

حضرت ام عطیہؓ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: نبی کریم ﷺ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز کے لیے ہم سب جائیں خواہ لڑکیاں بالیاں ہوں یا چادر والیاں یا حیض والی ہوں، البتہ حیض والی عورتیں نماز سے علیحدہ رہیں لیکن اس کارِ خیر اور مسلمانوں کی دعا میں حاضر رہیں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر کسی کے پاس بڑی چادر نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ آپ نے فرمایا: اس کی کوئی بہن اپنی چادر میں سے اسے بھی اوڑھا دے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے دن نماز کے لیے تشریف لے گئے اور آپ نے دو رکعت نماز پڑھی (اس وقت) اس سے پہلے اور اس کے بعد کوئی اور نماز نہ پڑھی۔ پھر آپ عورتوں کی طرف تشریف لے گئے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے اور آپ نے عورتوں کو صدقہ دینے کی تلقین کی تو عورتیں اپنے زیور، کانوں کی بالیاں اور انگوٹھیاں اور گلے کے ہار صدقہ کے طور پر دینے لگیں۔ (مسلم)

اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں عید کے دن نبی

کریم ﷺ کے ساتھ عید کی نماز میں حاضر ہوا تو آپ نے خطبہ سے پہلے نماز پڑھائی، جس کے لیے نہ اذان کہی گئی نہ اقامت، پھر آپ حضرت بلالؓ کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو اللہ سے ڈرنے کی تلقین کی، انہیں اطاعتِ الٰہی کی ترغیب دی اور نصیحت فرمائی پھر آپ عورتوں کی طرف تشریف لے گئے انھیں بھی نصیحت فرمائی اور فرمایا:

> ''اے عورتو! تم صدقہ دیا کرو۔ کیوں کہ تمہاری اکثریت جہنم کا ایندھن بنے گی۔ یہ سن کر عورتوں کے درمیان سے ایک پچکے رخساروں والی عورت کھڑی ہوئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ! ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ تم شکوہ، شکایت زیادہ کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔''

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ پھر عورتیں اپنے زیور بطور صدقہ دینے لگیں اور حضرت بلالؓ کے رومال میں اپنے کانوں کی بالیاں اور انگوٹھیاں ڈالنے لگیں۔

عورتوں کے لیے نمازِ جنازہ کے احکام

نمازِ جنازہ اس نماز کو کہتے ہیں، جو میت کو غسل اور کفن دینے کے بعد اس پر پڑھی جاتی ہے۔ یہ نماز زندہ مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے لہٰذا اگر کچھ لوگ یعنی صرف ایک شخص بھی پڑھ لے تو باقی لوگوں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے اور فرض ساقط ہونے کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ ایک سمجھ دار بچہ ہی بشرطیکہ مرد ہو، اکیلا یا دوسروں کے ہمراہ جنازے پر نماز پڑھ لے۔ لیکن اگر مرد یا سمجھ دار بچے کی موجودگی میں عورت نماز جنازہ پڑھے گی خواہ اکیلی پڑھے یا اس کی اقتداء میں کچھ مرد یا بچے بھی پڑھ لیں تو فرض ساقط نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ایک بھی مرد یا سمجھ دار بچہ موجود نہ ہو تو پھر عورتوں پر واجب ہوگا کہ وہ نماز جنازہ پڑھیں اور ان کے پڑھنے سے بھی یہ فرض کفایہ دوسروں پر سے ساقط ہو جائے گا۔ اور اگر عورتیں نماز جنازہ پڑھیں تو ان کے لیے بھی باجماعت پڑھنا سنت ہے۔

عورتوں کے نماز جنازہ پڑھ لینے کے بعد اگر کوئی مرد آجائے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن اگر مرد موجود نہ تھے اور نماز جنازہ عورتوں نے پڑھی اور ابھی شروع ہی کی تھی، ختم نہیں ہوئی تھی کہ کوئی مرد آ گیا تو کیا ایسی صورت میں مرد پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا لازم ہے یا نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب واضح نہیں ہے لیکن قرین قیاس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں مرد پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہو۔(۱)

---

(۱) حاشیہ بجیرمی علی الخطیب ج ۲، ص ۲۴۵

عورتوں کا جنازے کے ساتھ جانا

یہ گفتگو تو نماز جنازہ کے بارے میں تھی۔ اب رہ گیا عورتوں کا جنازے کے ساتھ جانے کا مسئلہ تو اس سلسلے میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو جنازے کے ساتھ جانے سے منع فرمایا ہے، حضرت ام عطیہؓ بیان کرتی ہیں کہ ہم عورتوں کو جنازے کے ساتھ جانے سے منع کیا جاتا تھا، لیکن اس سلسلے میں زیادہ شدت اختیار نہیں کی جاتی تھی۔ (مسلم)

یعنی عورتوں کا جنازے کے ساتھ جانا حرام نہیں ہے، بلکہ مکروہ تنزیہی ہے۔

☆ جمہور علماء کا قول یہی ہے کہ عورتوں کو جنازے کے ساتھ جانے سے منع کیا جائے۔ یہی حنفی مسلک ہے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک عورت کا جنازے کے ساتھ جانا مکروہ ہے، حرام نہیں ہے۔ لیکن علمائے مدینہ نے ان کی اجازت دی ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک بھی جائز ہے، البتہ جوان عورت کا جانا مکروہ ہے۔

سب سے صحیح رائے اس مسئلہ میں جمہور علماء کی ہے۔

میت پر رونے پیٹنے کی ممانعت

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

ان المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ (بخاری و مسلم)

”بے شک میت کو اس پر اس کے گھر والوں کے رونے پیٹنے سے عذاب دیا جاتا ہے۔“

اور ایک دوسری روایت میں ہے: (ببعض بکاء اھلہ علیہ) ....اس پر اس کے گھر والوں کے خاص قسم کے رونے سے ....اور ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں: (بمانیح علیہ...) اس نوحے کی وجہ سے جو اس پر کیا جاتا ہے، عذاب دیا جاتا ہے۔“

صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے تو حضرت صہیبؓ اپنی قیام گاہ سے مدینہ میں حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور آپ کے سامنے کھڑے ہو کر رونے لگے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: کس لیے رو رہے ہو؟ کیا مجھ پر روتے ہو؟ حضرت صہیبؓ نے جواب دیا: ہاں! بہ خدا اے امیر المومنین! میں آپ پر ہی رو رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: بہ خدا تمہیں معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

من یبکی علیه یعذب

''جس پر رویا جائے اسے عذاب دیا جاتا ہے۔''

ان احادیث کا مفہوم متعین کرنے کے سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ جمہور علماء نے اس سے یہ مراد لیا ہے کہ جو شخص یہ وصیت کرے کہ مرنے کے بعد اس پر رویا پیٹا جائے اور اس کی وصیت پر عمل بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کے گھر والوں کے رونے پیٹنے اور نوحہ کرنے کی بنا پر عذاب دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنے کا اس نے خود حکم دیا تھا۔ لیکن جس شخص نے ایسی کوئی وصیت نہ کی ہو اور اس کے اہل خانہ اس پر از خود روئیں پیٹیں تو اسے عذاب نہیں ہوگا کیوں کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ولا تزر وازرة وزر اخری (الانعام: ١٦٤)

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔''

علماء نے کہا ہے کہ: عرب جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ مرنے والا ایسی وصیت کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اس حدیث کو جو بظاہر عام ہے اہل عرب کے اس رواج پر محمول کر کے اس شرط کے ساتھ مشروط کیا جائے گا کہ اگر مرنے والے نے خود وصیت کی ہوگی تو اسے عذاب دیا جائے گا۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس حدیث کا اطلاق اس شخص پر بھی ہوتا ہے جس نے رونے پیٹنے کی وصیت کی ہو اور اس پر بھی جس نے مرتے وقت اپنے اوپر رونے پیٹنے سے منع

نہ کیا ہو، گویا ان دونوں شخصوں کو عذاب دیا جائے گا۔ اسے بھی جس نے رونے پیٹنے کی وصیت کی ہوگی اور اس کو بھی جس نے یہ نصیحت نہ کی ہو کہ اس پر رویا پیٹا نہ جائے لیکن جس شخص نے نصیحت کی ہوگی کہ اس پر رویا پیٹا نہ جائے اور اس کے باوجود اس کے اہل خانہ اس پر نوحہ اور ماتم کریں گے اس کا عذاب مرنے والے کو نہیں ہوگا کیوں کہ اس فعل میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو نبی کریم ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ چند صحابہ کرامؓ بھی تھے۔ جب نبی کریم ﷺ حضرت سعد بن عبادہ کے پاس پہنچے تو انہیں بے ہوش پایا۔ یہ دیکھ کر آپ نے دریافت فرمایا: کیا انتقال ہوگیا؟ لوگوں نے عرض کیا، نہیں یا رسول اللہ! پھر آپ رونے لگے۔ جب لوگوں نے آپ کو روتے دیکھا تو سب رونے لگے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

الا تسمعون ان الله لا یعذب بدمع العین و لا بحزن القلب و لکن یعذب بهذا (و اشار الی لسانه) او یرحم.

''سنو! اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسو بہانے اور دل کے غمگین ہونے پر عذاب نہیں دیتا بلکہ وہ اس پر (آپؐ نے زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) ضرور عذاب دیتا ہے یا (اگر وہ کلمہ خیر نکالے تو) رحم فرماتا ہے۔''

اور صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے:

العین تدمع و القلب یحزن و لا نقول ما یسخط الله

''آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل رنج وغم سے متاثر ہوتا ہے لیکن ہم کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالیں گے جس سے ہمارا رب ناراض ہو۔''

اس مسئلہ میں جزوی اختلاف کے باوجود اس امر پر سب فقہاء کا اجماع ہے کہ وہ رونا منع ہے جو بلند آواز سے ہو اور جس کے ساتھ بین کیے جائیں، محض آنسوؤں سے رونا منع

نہیں ہے۔

نوحہ کرنے اور رونے پیٹنے والی عورتوں کے بارے میں بھی متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً:

صحیح مسلم میں حضرت ابو مالک اشعریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

النائحة اذا لم تتب قبل موتها تقام یوم القیامة و علیها سربال من قطران و درع من جرب

''میت پر بین کرنے اور رونے پیٹنے والی عورت اگر اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کرے گی تو قیامت کے دن اس حالت میں اٹھائی جائے گی کہ اس کے جسم پر تارکول کا پیرہن اور کھجلی کی قمیض ہوگی۔''

سیاہ لباس پہننے کی ممانعت

مذکورہ بالا حدیث کی تشریح کرتے ہوئے بعض علماء نے کہا ہے کہ (سربال من قطران) ''تارکول کا لباس'' اس لیے پہنایا جائے گا کہ نوحہ و ماتم کرنے والی عورتیں سیاہ ماتمی لباس پہنا کرتی تھیں۔ اور اس حدیث میں (درع من جرب) ''کھجلی کی قمیض'' کے الفاظ ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے اعضاء پر خارش کی بیماری اس طرح مسلط کر دی جائے گی کہ اس کے سارے جسم پر چھا جائے گی کیوں کہ وہ اپنے پرسوز الفاظ سے مصیبت زدہ لوگوں کے دلوں کو جلایا کرتی تھی۔

نیز مسلم میں حضرت ام عطیہؓ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

یبایعنك علی ان لا یشرکن باللہ شیئا .... ولا یعصینك فی معروف الخ (الممتحنة:۱۲)

''جب مومن عورتیں تمہارے پاس بیعت کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گی .... اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، الخ۔''

تو اس میں مردوں پر نوحہ کرنا بھی شامل تھا۔ کیوں کہ نوحہ و ماتم (مردوں پر رونا پیٹنا) زمانۂ جاہلیت کی ایک رسم تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ماتم اور نوحہ گری کو اس لیے حرام کیا ہے کہ یہ انتہائی قبیح فعل ہے اور نبی کریم ﷺ نے اس سے روکنے اور منع کرنے کا جو بطور خاص اہتمام فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے غم میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور یہ چیز تسلیم و رضا کے خلاف ہے اور احکام الٰہی پر بے یقینی کا مظہر ہے۔

میت کا سوگ منانا

صحیح بخاری میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مروی ہے کہ آپؓ نے فرمایا: کسی عورت کے لیے جو اللہ پر ایمان رکھتی ہے جائز نہیں کہ میت پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے سوائے خاوند کی وفات کے۔ (کیوں کہ خاوند کے مرنے پر عورت کے لیے عدت چار مہینے دس دن ہے اور اس میں سوگ بھی شامل ہے)۔

عورتوں کا قبروں پر جانا

عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے قبروں پر جانا مستحب ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آدمی کو موت اور آخرت کی ہولناکیاں یاد آتی ہیں، دوسرے مرنے والوں کے لیے دعا کی جاتی ہے جس سے انہیں فائدہ پہنچتا ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے:

> كنت نهيتكم عن زيارة القبور فقد اذن لمحمد فی زيارة امه، فزورها فانها تذكر الآخرة. (مسلم و ابوداؤد والترمذی وا بن حبان الحاكم)
>
> ”میں نے تم کو قبروں پر جانے سے منع کیا تھا لیکن محمد (ﷺ) کو اپنی والدہ کی قبر پر جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ اب تم بھی قبروں پر جایا کرو۔ کیوں کہ قبر آخرت کی یاد دلاتی ہے۔“

خود نبی کریم ﷺ شہدائے احد اور اہل بقیع کی قبروں پر تشریف لے جاتے، ان کو سلام کرتے اور ان کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے:

السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنیئن والمسلمین و انا ان شاء الله بکم لا حقون نسأل الله لنا و لکم العافیة (مسلم احمد ابن ماجه)

''اے ان گھروں کے رہنے والے مومنو اور مسلمانو! تم پر سلام اور ہم بھی انشاء اللہ عنقریب تم سے آ کر ملنے والے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت طلب کرتے ہیں۔''

عورتوں کے قبروں پر جانے کے مسئلہ پر اختلافِ فقہاء

علماء کے ایک گروہ کی رائے میں عورتوں کا قبروں پر جانا مکروہ ہے۔ یہ کراہت تحریمی بھی ہوسکتی ہے اور بعض کے نزدیک یہ کراہت تنزیہی ہے (یعنی یہ فعل جائز تو ہے لیکن اس سے بچنا اچھا ہے) ان لوگوں کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ نبی کریمؐ نے قبروں پر بکثرت جانے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔'' یہ حدیث احمد بن حنبلؒ، ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کی ہے۔

لیکن علماء کی اکثریت کے نزدیک عورتوں کا قبروں پر جانا جائز ہے بشرطیکہ اس سے کسی قسم کا فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ ان کی دلیل درج ذیل احادیث ہیں:

۱- وہ حدیث ہے جو مسلم نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے: حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جب میں قبروں پر جاؤں تو یا کہوں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

۲- امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک قبر کے قریب سے گزرے۔ اس قبر پر ایک عورت بیٹھی رو رہی تھی اور آپ نے اسے کچھ ناپسندیدہ الفاظ کہتے سنا تو فرمایا:

اتقی الله واصبری

''اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔''

لیکن آپ نے اس کے قبر پر آنے کو ناپسند نہیں فرمایا:

۳- حاکم نے المستدرک میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ

رضی اللہ عنہا ہر جمعہ کے دن اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ کی قبر پر جایا کرتی تھیں۔

۴۔ عبد اللہ بن ابی ملکیہؒ روایت کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک دن قبرستان سے واپس آئیں تو میں نے آپ سے پوچھا: اے ام المومنین! آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟ فرمایا: اپنے بھائی حضرت عبد الرحمٰن رضی الہ عنہ کی قبر سے، میں نے عرض کیا: کیا نبی کریم ﷺ نے قبروں پر جانے سے منع نہیں فرمایا تھا؟ کہنے لگیں: ہاں! پہلے آپ نے قبروں پر جانے سے منع فرمایا تھا۔ بعد ازاں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

(مستدرک حاکم)

ان احادیث اور روایات سے ثابت ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث جس میں نبی کریم ﷺ نے "زوارات القبور" (قبروں پر بہت زیادہ جانے والیوں) پر لعنت بھیجی ہے اس کا اطلاق اس صورت پر کیا جائے گا جب قبر پر جانے سے فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو یا قبر پر جا کر کوئی غیر شرعی کام کیا جائے مثلاً رونا پیٹنا اور بین کرنا۔ دوسرے حدیث میں لفظ "زوارات" ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ جانے والیاں، لہٰذا حدیث کا مفہوم یہ ہوا کہ ان پر لعنت ہو جو اس فعل کو بہت زیادہ اور بار بار کریں اور غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس زیادہ آنے جانے سے ایک طرف تو خاوند کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی، دوسرے بے پردگی اور نمائش بھی ہے اور قبرستان میں جا کر چیخ و پکار مچائی جاتی ہے۔

اگر ایسی تمام باتوں سے بچا جا سکے تو عورتوں کے قبروں پر جانے میں کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ ان کو بھی مردوں کی طرح موت کی یاد دہانی ضروری ہے۔

اس طرح ان احادیث میں جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف مفہوم رکھتی ہیں مطابقت پیدا ہو جائے گی۔ یہی بات حنفیوں میں سے علامہ سراجؒ اور امام بدر الدین عینیؒ نے بھی کہی ہے اور شیخ شرنبلالیؒ نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ اگر کسی غیر شرعی حرکت کے ارتکاب کا خوف نہ ہو تو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے قبروں پر جانا مستحب ہے۔ لیکن اگر قبر پر جا کر غیر شرعی امور کا ارتکاب کیا جائے تو پھر مردوں کا جانا بھی مکروہ ہے۔

کتاب ''بحر'' کے مصنف نے اس سلسلے میں شافعی علماء کے دو قول نقل کیے ہیں۔ ایک قول جمہور کی تائید کرتا ہے یعنی اس کے مطابق قبر پر جانا مکروہ ہے۔ دوسرے قول کے مطابق جانا مکروہ نہیں۔ پھر مصنف لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ صحیح یہی ہے کہ اگر فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو جانا مکروہ نہیں۔

علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''المغنی'' میں امام احمد بن حنبلؒ سے دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک کے مطابق عورتوں کا قبروں پر جانا مکروہ تنزیہی ہے اور دوسری کے مطابق مکروہ نہیں اور انھوں نے عدم کراہت پر ابن ابی ملکیہؒ کی اسی حدیث سے استدلال کیا ہے جو ہم نے ابھی ذکر کی ہے۔

درمختار اور دیگر کتب فقہ کے مطابق حنفیوں کے نزدیک مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے قبروں پر جانا مستحب اور کارِ ثواب ہے۔ کیوں کہ حدیث کے الفاظ عام ہیں جو مرد اور عورت دونوں کو شامل ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ عورتوں کے لیے قبروں پر جانا حرام ہے لیکن ''البحر الرائق'' میں ہے کہ صحیح یہی ہے کہ حدیث سے عورتوں کے لیے بھی اجازت ثابت ہے۔

و صلی اللہ علی سیدنا محمد و علی آلہ و صحبہ و سلم

زکوٰۃ

زکوٰۃ ارکانِ اسلام میں سے تیسرا رکن ہے۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی ہیں: پاک کرنا اور بڑھنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قد افلح من زکھا (الشمس:۹)

''فلاح پا گیا جس نے نفس کو پاک کرلیا۔''

یعنی کفر و شرک اور سفلی خواہشات کے میل کچیل سے پاک صاف کرلیا۔

عربی محاورے میں بولا جاتا ہے: زکا الزرع (کھیتی بڑھ گئی) یعنی پھل پھول گئی۔

زکوٰۃ کی اصطلاحی تعریف

مال کے ایک مخصوص حصہ کا کسی ایسے شخص کو مالکؒ بنانا جو مخصوص شرائط کے ماتحت اس کا مستحق ہو۔

زکوٰۃ سن دو ہجری میں فرض کی گئی اور اس کی فرضیت دلائل قطعیہ سے ثابت ہے۔

فرضیت زکوٰۃ کی دلیل قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

و اٰتوا الزکوۃ

''اور زکوٰۃ ادا کرو۔''

نیز ارشاد ہے:

و فی اموالھم حق للسائل والمحروم (الذاریٰت:۱۹)

''اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل اور محروم کے لیے۔''

اور سنت نبویؐ سے فرضیت زکوٰۃ اس حدیث سے ثابت ہے:

بنی الاسلام علی خمس: شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمدا رسول اللہ و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ و صوم رمضان و حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ (بخاری و مسلم)

''اسلام کی بنیاد پانچ ارکان پر رکھی گئی ہے۔ یہ شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا لیکن صرف اس کے لیے جو بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔''

احادیث میں ان اموال کی تفصیل بھی بیان کردی گئی ہے، جن کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے اور اموال میں نصاب کی مقدار بھی بیان کردی گئی ہے اور ہر نصاب مالی پر زکوٰۃ کی جو مقدار واجب الادا ہے وہ بھی بیان کردی گئی ہے۔

مال کی مختلف اقسام میں زکوٰۃ واجب الادا ہے اور ہر قسم کا نصاب اور اس میں سے ادا کی جانے والی زکوٰۃ کی مقدار مقرر ہے، مثلاً چوپائے (اونٹ، گائے اور بکریوں) کی زکوٰۃ، سونے اور چاندی کی زکوٰۃ خواہ سکوں کی شکل میں ہوں یا غیر مضروب، سامان تجارت کی زکوٰۃ، معادن اور دفینہ کی زکوٰۃ اور کھیت کی پیداوار اور پھلوں کی زکوٰۃ وغیرہ۔

ان مختلف اقسام کے اموال پر مقدارِ زکوٰۃ اور ہر سال کے نصاب کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ یہاں پر ہم زکوٰۃ کے صرف ان احکام و مسائل سے بحث کریں گے جن کا تعلق بطور خاص خواتین سے ہے۔ مثلاً زیورات کی زکوٰۃ۔

زیور کی زکوٰۃ نہ ادا کرنے پر وعید

۱- ابوداؤد نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ایک

عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی، جس کے ہاتھوں میں سونے کے دو موٹے موٹے کنگن تھے، ان کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے اس عورت سے فرمایا:

أ تعطين زکوٰة هذا؟

''کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟''

اس عورت نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا:

أيسرك ان يسورك الله بهما يوم القيامة سوارين من نار؟

''کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں ان کنگنوں کے بدلے آگ کے دو کنگن پہنائے؟''

راوی بیان کرتے ہیں کہ اس عورت نے وہ کنگن کاٹ ڈالے، اور ایک روایت میں ہے کہ اتار کر نبی کریم ﷺ کے آگے ڈال دیے اور عرض کیا: یہ اللہ اور اللہ کے رسول کی نذر ہیں۔ (یہی روایت احمد بن حنبلؒ، ترمذی اور دار قطنی وغیرہ نے بھی درج کی ہے)۔

الخطابیؒ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ نے جو فرمایا:

''أيسرك ان يسورك الله بهما سوارين من نار''

یہ دراصل ارشادِ باری تعالیٰ:

يوم يحمٰى عليها فى نار جهنم فتكوىٰ بهما جباههم و جنوبهم و ظهورهم. (التوبة: ۳۰)

''ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا'' کی تفسیر ہے۔

۲۔ نسائی میں ایک مرسل روایت ہے کہ دو عورتیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں

حاضر ہوئیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن تھے، انھیں دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا: (اتودیان زکوته؟) کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ انہوں نے عرض کیا: نہیں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

أتحبان ان يسور كما الله سوارين من نار؟

''کیا تم پسند کرتی ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آگ کے دو کنگن پہنائے؟''

انھوں نے عرض کیا: نہیں۔

تو آپ نے ارشاد فرمایا: فادیا زکوٰته (تو اس کی زکوٰۃ ادا کرو)

۳- ابوداؤدؒ، دار قطنی اور بیہقی نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریمؐ میرے ہاں تشریف لائے اور آپ نے میرے ہاتھ میں سونے کے چھلے دیکھے تو فرمایا:

(ما هٰذا یا عائشه؟) ''اے عائشہ! یہ کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا: یہ میں نے بنوائے ہیں تاکہ انہیں پہن کر آپ کے لیے بناؤ سنگار کروں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: (اتودین زکوٰتهن؟) کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ یا جو الفاظ اس وقت اللہ تعالیٰ نے میری زبان سے کہلوائے۔ آپ نے فرمایا: (هی حسبك من النار) تمہارے جہنم میں جانے کے لیے یہی کافی ہے۔''

محدث الخطابی لکھتے ہیں:

''بظاہر جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ محض چھلے تو اتنے وزنی نہیں ہوسکتے کہ وہ زکوٰۃ کا نصاب بن جائیں۔ آپ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ اے عائشہ! تمہارے پاس اس کے علاوہ جو اور زیور ہے اس کو بھی اس میں شامل کر کے سارے زیور کی زکوٰۃ ادا کرو۔''

۴- امام احمد بن حنبلؒ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت اسماء بنت زید رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ:

''میں اور میری خالہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت ہم

نے سونے کے کنگن پہن رکھے تھے، آپ نے دریافت کیا فرمایا: (اتعطیان زکوٰتہ؟) کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ ہم نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: (أما تخافان ان یسور کما اللہ اسورۃ من نار؟ ادیا زکوٰتہ) کیا تم کو اس بات سے ڈر نہیں لگتا کہ اللہ تعالیٰ (ان کی وجہ سے) تم کو آگ کے کنگن پہنائے گا؟ ان کی زکوٰۃ ادا کرو۔"

عورت کے زیوروں کی زکوٰۃ

اس مسئلہ پر فقہاء میں اختلاف ہے کہ عورت کا سونے اور چاندی کا زیور جس کا پہننا اس کے لیے مباح ہے، آیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور اگر واجب ہے تو اس کا ادا کرنا کب واجب ہوتا ہے؟

☆ حنفی مسلک: امام ابو حنیفہؒ اور امام ابن حزم کے نزدیک سونے چاندی کا زیور اگر اس مقدار میں ہو کہ نصاب زکوٰۃ بن جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ یہ دونوں امام نبی کریمؐ کی ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو اس سلسلے میں مروی ہیں۔ مثلاً وہ حدیث جو پہلے بیان ہو چکی ہے اور جسے ابوداؤدؒ، دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو حکم دیا کہ اپنے سونے کے چھلوں کی زکوٰۃ ادا کرو۔

اسی طرح وہ حدیث جو امام احمدؒ نے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت اسماء اور ان کی خالہ رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ اپنے کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرو۔ نیز وہ حدیث جسے نسائیؒ نے روایت کیا ہے کہ دو عورتیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، انھوں نے سونے کے کنگن پہن رکھے تھے۔ آپؐ نے انہیں حکم دیا کہ اپنے کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرو۔

☆ مالکی مسلک: مالکیوں کے نزدیک عورت کے سونے چاندی کے زیورات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے سوائے مندرجہ ذیل صورتوں کے:

۱- زیور اس قدر ٹوٹ پھوٹ جائے کہ پہننے کے قابل نہ رہے اور بغیر گھڑے بنائے اس کا اپنی اصلی حالت میں لانا ممکن نہ ہو۔

۲- یا زیور ٹوٹ گیا ہو اور بغیر گھڑے بنائے اس کو دوبارہ قابل استعمال بھی بنایا جاسکتا ہو لیکن اس کی مالکہ کا ارادہ اسے درست کرانے کا نہ ہو۔

۳- زیور پہننے کے لیے نہیں بلکہ کسی آڑے وقت کام آنے کے لیے سینت کر رکھا ہو۔

۴- زیور کسی ایسی غرض سے بنوا کر رکھا ہو کہ مثلاً لڑکی کی پیدائش پر متوقع ہے اس کے کام آئے گا۔

۵- زیور اس مقصد سے تیار کرا کر رکھا ہو کہ بیٹے کی ہونے والی بیوی کو مہر میں دیا جائے گا۔

۶- زیور اس نیت سے رکھا ہو کہ اس سے تجارت کی جائے گی۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں میں زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

☆ شافعی مسلک: شافعیوں کے نزدیک ایسے زیور پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے جس کا پہننا عورت کے لیے مباح ہے خواہ اس پر پورا سال گزر چکا ہو بشرطیکہ اسے علم ہو کہ میں ہی اس کی مالک ہوں لیکن اگر اسے اس بات کا پتہ نہ ہو کہ میں اس کی مالک ہوں مثلاً کسی عورت کو میراث میں بقدر نصاب زیور ملا اور اس پر پورا سال گزر گیا لیکن سال کے دوران میں اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ اس کی ملکیت میری طرف منتقل ہو چکی ہے تو اس پر گزرے ہوئے سال کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

اسی طرح اگر عورت کے زیورات اتنے زیادہ ہوں جو حد اسراف کو پہنچ جائیں مثلاً پازیب ہی دو سو مثقال وزن کی ہو۔ ایسے زیور پر زکوٰۃ واجب ہے۔

شافعیوں کے نزدیک ایسے گلو بند پر بھی زکوٰۃ واجب ہے جو سونے کا بنا ہوا ہو لیکن اس کی زنجیر، سونے کی ہو یا تانبے کی اس کے ساتھ لگی ہوئی نہ ہو۔ البتہ اگر اس کی سونے یا تانبے کی زنجیر موجود ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے اور اگر زیور ٹوٹ جائے تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے بشرطیکہ مالکہ اس کو درست کرانے کا ارادہ رکھتی ہو اور پگھلانے اور ڈھالنے کے بغیر اس کی مرمت ممکن ہو۔ ورنہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

☆ حنبلی مسلک: حنبلیوں کے نزدیک زیور اگر استعمال کی خاطر یا عاریتاً دینے کی غرض سے تیار کرایا گیا ہے اور جس کے قبضے میں ہے اس کے لیے اس کا استعمال بھی مباح ہے تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے لیکن اگر استعمال کے لیے ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ زیور اگر ٹوٹ جائے اور اسی حالت میں اس کا پہننا ممکن ہو تو اس کا حکم صحیح زیور کا ہے۔ یعنی اس پر زکوٰۃ نہیں ہے لیکن اگر زیادہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے کہ پہننا ممکن نہ رہا ہو اور درست کرنے کے لیے اس کو پگھلا کر دوبارہ ڈھالنا ضروری ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن اگر پگھلائے اور ڈھالے بغیر درست ہوسکتا ہو اور مالکہ اس کو درست کرانے کا ارادہ بھی رکھتی ہو تو پھر اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

چاروں اماموں کے دلائل کا تجزیہ

حنفیوں کے نزدیک تو عورت کا زیور اور اس کی ملکیت میں موجود سونا چاندی جب بقدر نصاب ہو جائے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

لیکن باقی تین ائمہ کے نزدیک عورت کے زیورات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے خواہ کسی مقدار میں ہوں اور اس سلسلے میں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱- امام بیہقیؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما اپنی بیٹی کو سونے کا زیور پہنایا کرتی تھیں، جس کی مالیت تقریباً پچاس ہزار درہم تھی اور اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تھیں۔

۲- مؤطا امام مالکؒ میں ہے کہ عبد الرحمٰن بن قاسمؒ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زیر پرورش ان کے بھائی کی یتیم بیٹیاں تھیں، جن کی ولی بھی خود حضرت عائشہؓ تھیں اور ان لڑکیوں کا زیور بھی تھا لیکن حضرت عائشہؓ ان زیورات کی زکوٰۃ نہیں نکالتی تھیں۔

مؤطا ہی میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اپنی بیٹیوں اور باندیوں کو سونے کا زیور

پہنایا کرتے تھے لیکن ان زیورات کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے اور ہر بیٹی کے زیور کی مالیت چار سو دینار تھی۔

محدث الخطابی لکھتے ہیں کہ ''قرآن مجید سے بظاہر جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اس سے تو ان علماء کے قول کی شہادت ملتی ہے جو عورت کے زیور پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب خیال کرتے ہیں اور احادیث نبویؐ اور اقوالِ صحابہؓ سے بھی انہی کی تائید ہوتی ہے اور جن علماء نے زیور پر سے زکوٰۃ ساقط کردی ہے انہوں نے تاویل و اجتہاد سے کام لیا ہے اور بعض آثار صحابہؓ سے ان کی تائید بھی ہوتی ہے تاہم احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ زیور کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔''

یہ اختلاف تو ایسے زیور کے بارے میں تھا جس کا پہننا عورت کے لیے جائز ہے۔ لیکن اگر عورت کے پاس ایسا زیور ہو جسے وہ استعمال نہیں کرسکتی۔ مثلاً مردوں کی زیب و زینت کا سامان جیسے تلوار کی آرائش کا زیور وغیرہ تو یہ عورت کے لیے حرام ہے اور اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ یہی حکم سونے چاندی کے برتنوں کا ہے۔(۱)

خلاصۂ بحث

مختلف آراء و اقوال اور احادیث و آثار جو اس سلسلے میں مروی ہیں، ان سب پر اگر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو جو بات سمجھ میں آتی ہے اس کے پیش نظر یہ کہنا ممکن ہے کہ عورت کے پاس جو زیور ہے اس کی غرض و غایت اگر زینت و آرائش ہے جو عورت کی حقیقی ضرورت ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے خواہ اس کی مقدار کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

لیکن اگر عورت نے زیور بطور کنز ذخیرہ کر رکھا ہے یا ضائع ہونے سے محفوظ کرنے کے لیے سینت کر رکھا ہے تو یہ نقد مال کے حکم میں ہے۔ اس کے ساتھ اس کی اصلی ضرورت یعنی آرائش و زیبائش وابستہ نہیں ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

اور یہی وہ رائے ہے جس پر فتویٰ ہے۔ لیکن یہ ایک قسم کی رخصت ہے۔ اگر عورت زکوٰۃ سے بچنا چاہے تو اس پر عمل کرلے۔

---

(۱) فقہ السنہ۔ مرتبہ شیخ سید سابق ج ۱، ص ۳۴۳۔ دار الکتب العربی، بیروت

لیکن عزیمت جو تقویٰ کا تقاضا بھی ہے اور جس میں احتیاط بھی ہے یہی ہے کہ اگر زیور بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور ضرور ادا کی جائے۔ قرآن و حدیث کے نصوص اور صحابہ کرامؓ کے آثار سے بھی بظاہر یہی بات سمجھ میں آتی ہے اور امام ابو حنیفہؒ اور امام بن حزم کا بھی یہی مسلک ہے۔

حضرت انسؓ کہا کرتے تھے کہ اگر زیور پہننے یا دوسری عورتوں کو عاریتاً دینے کے لیے رکھا ہے تو اس کی زکوٰۃ صرف ایک بار ادا کر دینا کافی ہے۔(۱)

وہ زیورات جن پر زکوٰۃ نہیں ہے

اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ہیرے، جواہر، مثلاً یاقوت، موتی، مرجان، زمرد اور پنّا وغیرہ قسم کی قیمتی پتھروں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ تجارت کی غرض سے رکھے جائیں تو پھر ان پر زکوٰۃ ہے۔(۲)

سونے کا نصاب

سونے کا نصاب بیس مثقال سونا ہے، جو ۸۹ء۲۰۰ گرام کے مساوی ہے۔

چاندی کا نصاب

چاندی کا نصاب دوسو درہم چاندی ہے جو چھ سو چوبیس گرام کے مساوی ہے۔ سال پورا ہونے کے بعد ایک گرام کی قیمت معلوم کر کے ضرب دے لیا جائے۔

سونے اور چاندی کے نصاب کا ثبوت

سونے اور چاندی کا نصاب مقرر کرنے کے سلسلے میں بنیاد وہ حدیث ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اذا کانت لك مئاتا درهم و حال علیها الحول ففیها خمسة

---

(۱) کشف الغمہ، مصنفہ امام شعرانیؒ، ج۱، ص۲۲۹

(۲) فقہ السنہ۔ مرتبہ شیخ سید سابق ج۱، کتاب الزکوٰۃ، ص۳۴۱، ۳۴۲، طبع بیروت

دراھم و لیس علیك شیء، یعنی فی الذھب۔ حتی یکون لك عشرون دیناراً فاذا کانت لك عشرون دیناراً و حال علیھا الحول ففیھا نصف دینار، فما زاد فبحساب ذالك و لیس فی مال زکوٰۃ حتی یحول علیه الحول.

''جب تمہارے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر ایک سال گزر جائے (یعنی پورے سال بھر تمہارے پاس رہیں) تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ ہے، اور تم پر کچھ واجب نہیں۔ یعنی سونے میں۔ حتی کہ تمہارے پاس بیس دینار نہ ہوجائیں پھر جب تمہارے پاس بیس دینار ہوں اور پورا ایک سال تمہارے پاس رہیں تو ان پر نصف دینار زکوٰۃ ہے اور جس قدر زیادہ ہو اس کی زکوٰۃ اسی حساب سے نکالی جائے اور کسی مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی جب تک اس پر ایک سال پورا نہ گزر جائے۔''

(یہ حدیث ابوداؤدؒ اور بیہقی نے روایت کی ہے اور امام بخاریؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے میں قدرے اختلاف ہے جو درج ذیل ہے:

''شیخ محمود خطابؒ نے کتاب ''الدین الخالص'' میں لکھا ہے کہ مثقال اور دینار=۴۴ء۴ گرام کے برابر ہے اور مصر کے بینک الناصر کی زکوٰۃ کمیٹی کی طرف سے جو کتابچہ شائع کیا گیا ہے اس میں مثقال اور دینار کو ۴۶ء گرام کے مساوی قرار دیا گیا ہے اور شیخ سید سابق نے فقہ السنہ میں لکھا ہے کہ بیس دینار اٹھائیس مصری درہم کے برابر ہیں اور جس درہم کا حدیث شریف میں ذکر ہے اس کا وزن ۱۲ء۳ گرام ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ دو سو درہم کا وزن ۶۲۴ گرام ہوا۔

واجب الادا زکوٰۃ کی مقدار

زکوٰۃ کی مقدار نقد سونے چاندی پر اور سونے چاندی کے ایسے زیور پر جو استعمال کے لیے نہ ہو یا جس کا استعمال عورت کے لیے جائز نہ ہو (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ڈھائی

فیصد ہے بشرطیکہ اس پر پورا ایک سال گزر چکا ہو (یعنی جس کے قبضے میں ہے اس کے پاس وہ نقدی یا زیور پورا سال موجود رہا ہو)۔

مستحقین زکوٰۃ

زکوٰۃ ان مصارف میں خرچ کی جائے گی جن کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے:

انما الصدقت للفقراء والمسکین و العلمین علیها والمؤلفة قلوبهم و فی الرقاب والغارمین و فی سبیل الله و ابن السبیل.

(التوبة: ٦٠)

''یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافرنوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔''

ان تمام مصارف کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، ان میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مؤلفۃ القلوب کا مصرف ابتدائے اسلام میں تھا۔ بعد ازاں جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عروج و غلبہ عطا فرما دیا تو یہ مصرف ساقط ہوگیا۔ اس کتاب میں آگے چل کر ہم تفصیل سے اس موضوع پر بات کریں گے کہ آیا عورت اپنے فقیر یا مسکین خاوند کو اپنے مال کی زکوٰۃ دے سکتی ہے یا نہیں؟

عورت کے مہر کی زکوٰۃ

کیا عورت کے مہر پر زکوٰۃ ہے؟ اور اگر ہے تو کب واجب ہوتی ہے؟

اس مسئلے میں علماء کے اختلاف کی نوعیت درج ذیل ہے:

☆ حنفی مسلک: احناف کا استدلال یہ ہے کہ مہر ایک ایسی چیز کا بدل ہے جو مال نہیں ہے لہٰذا اس پر قبضے سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیوں کہ یہ ایک ایسے قرض سے مشابہ

ہے، جس کے وصول ہونے کی توقع کم ہو چناں چہ اس پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب مہر کی اتنی مقدار جو نصابِ زکوٰۃ ہو قبضے میں آجائے اور اسے قبضے میں آئے پورا ایک سال گزر جائے۔ بشرطیکہ اس کے پاس اس مال کے سوا کوئی اور مال بقدر نصاب موجود نہ ہو کیوں کہ اگر اس کے پاس پہلے بھی بقدر نصاب مال موجود ہوگا تو اب مہر کی جو بھی رقم وصول ہوگی، کم ہو یا زیادہ، اس کو پہلے مال میں شامل کر کے پورے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔ اس لیے کہ اس صورت میں مہر کے قرض میں سے جو کچھ وصول ہوگا اس کی مثال اس آمدنی کی سی ہے جو نفع وغیرہ کے طور پر دوران سال حاصل ہوتی ہے اور اس کو اصل پونجی میں شامل کر کے سال کے آخر میں کل موجود مال کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوتا ہے۔

☆ شافعی مسلک: شافعیوں کے نزدیک مہر کی زکوٰۃ عورت پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب اس پر ایک سال پورا ہوجائے اور سال کے آخر میں پورے مہر کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوتا ہے خواہ مہر خلوت صحیحہ سے پہلے ہی وصول ہوگیا ہو اور یہ امکان موجود ہو کہ نکاح فسخ ہوجانے کی صورت میں مہر ساقط ہوجائے گا اور رقم لوٹانا پڑے گی، یا اگر خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق ہوگئی تو مہر نصف رہ جائے گا وغیرہ۔ اس قسم کی کوئی بات وجوب زکوٰۃ پر اثر انداز نہ ہوگی۔

شافعی مسلک کے مطابق قرض دی ہوئی رقم پر زکوٰۃ ادا کرنا اس صورت میں واجب ہوا ہے جب قرض وصول کرنے پر قدرت ہو۔ چناں چہ جب قرض وصول ہوجائے تو اس پر تمام گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

☆ مالکی مسلک: مالکیوں کے نزدیک اگر عورت مہر کی صورت میں کچھ رقم کی مالک بن جاتی ہے لیکن وہ رقم اسے حاصل نہیں ہوتی بلکہ بصورتِ قرض قابل وصول رہتی ہے تو ایسے قرض پر زکوٰۃ صرف اس وقت واجب الادا ہوگی جب وہ قبضہ میں آجائے اور قبضے کے دن سے اس پر پورا ایک سال گزر جائے۔

☆ حنبلی مسلک: حنبلیوں کے نزدیک مہر خاوند کے ذمے بیوی کا قرض ہے اور اس کا حکم وہی ہے جو دوسرے قرضوں کا لہٰذا اگر وہ شخص جس کے ذمے مہر ہے مالدار ہے پھر تو اس

پر زکوٰۃ واجب ہے اور جب مہر کی رقم عورت کے قبضہ میں آئے گی وہ اس کی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گی۔ اگر خاوند تنگ دست ہو یا مہر ادا کرنے سے انکار کرے پھر بھی علامہ خرقیؒ کے نزدیک قول مختار یہی ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور مہر پر وجوب زکوٰۃ کے سلسلے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ابھی خلوت صحیحہ ہوئی ہے یا نہیں۔ لیکن زکوٰۃ ادا کرنا اسی وقت واجب ہوگا جب مہر کی رقم قبضہ میں آئے گی چناں چہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق ہوجانے کی بنا پر اگر آدھا مہر ساقط ہوگیا اور عورت کے قبضہ میں نصف مہر آیا تو وہ صرف اسی رقم پر زکوٰۃ ادا کرے گی جو اس کے قبضہ میں آئی۔ اسی طرح اگر مہر قبضہ میں آنے سے پہلے ہی کسی وجہ سے نکاح فسخ ہوگیا اور مہر ساقط ہوگیا تو عورت پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہ ہوگا۔

ہمارے خیال میں زیادہ صحیح اور قابل عمل مسلک حنفیوں اور مالکیوں کا ہے یعنی عورت پر مہر کی زکوٰۃ ادا کرنا اسی وقت واجب ہے جب مہر کی رقم اس کے قبضے میں آجائے اور قبضے میں آنے کے دن سے اس پر ایک سال پورا ہوجائے۔

مہر کی زکوٰۃ کس حساب سے ادا کی جائے؟

مہر اگر سونے یا چاندی کی شکل میں ہے تو سونے کی زکوٰۃ سونے کے نصاب کے مطابق اور چاندی کی زکوٰۃ چاندی کے نصاب کے مطابق ادا کی جائے۔ سونے اور چاندی کے نصابوں کا بیان پہلے ہوچکا ہے۔ لیکن اگر مہر کی رقم نوٹوں کی شکل میں ہے تو اس کا حساب کیسے کیا جائے؟

اس مسئلہ میں بھی کہ نوٹوں کا حساب سونے کی قیمت سے کیا جائے یا چاندی کی قیمت سے، علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

☆ ایک رائے کے مطابق مہر میں ملنے والے نوٹوں کی مالیت اگر سونے کے نصاب کے برابر ہے تو اس پر زکوٰۃ ادا کی جائے۔

یعنی بازار سے معلوم کیا جائے کہ بیس دینار یعنی ۸۹ء۲۰۰ گرام سونے کی قیمت مروجہ

کرنسی کے حساب سے کتنی ہے؟ اب اگر مہر میں حاصل شدہ نوٹوں کی مالیت نصاب کے برابر ہو یا اس سے زائد ہو یا اگر برابر نہ ہو تو عورت کے پاس جو مال پہلے سے موجود ہے اسے شامل کر کے کل رقم نصاب کے برابر ہو جائے یا اس سے بڑھ جائے تب تو زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، بشرطیکہ کل مال پر عورت کے قبضہ میں ایک سال پورا ہو گیا ہو یعنی حولان حول جو وجوبِ زکوٰۃ کی شرط ہے پوری ہو گئی ہو۔

☆ اور ایک رائے یہ ہے کہ مہر میں ملنے والے نوٹوں کی مالیت کا حساب چاندی سے لگایا جائے۔ یعنی بازار سے معلوم کیا جائے کہ دو سو درہم یعنی ۶۲۴ گرام چاندی کی قیمت مروجہ کرنسی کے حساب سے کیا ہے؟ چناں چہ اگر مہر میں حاصل ہونے والے نوٹوں کی مالیت ۶۲۴ گرام چاندی کی قیمت کے برابر ہو یا اس سے زائد ہو یا عورت کے پاس جو رقم پہلے سے موجود ہے وہ ملا کر نصاب یا نصاب سے زائد ہو جائے تب تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بشرطیکہ اس مال پر عورت کے قبضہ میں آنے کے بعد ایک سال پورا ہو گیا ہو، ورنہ نہیں۔

نوٹوں کا حساب سونے یا چاندی سے لگانے کے سلسلے میں جو اختلاف ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ جو علماء چاندی کے نصاب سے حساب لگانے کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ اس صورت میں غریبوں کا فائدہ ہے اور جو علماء سونے کے نصاب سے حساب لگانے کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ تقویم مالی کی بنیاد سونا ہے اور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں سونے کا ایک مثقال چاندی کے دس درہم کے مساوی تھا۔ لہٰذا چاندی کا نصاب اسی حساب سے دو سو درہم مقرر کیا گیا تھا اور یہ تبدیلیِ حالات اور تغیر زمانہ ہے جس کی وجہ سے سونے کی قیمت چاندی کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن یہ امر طے شدہ ہے کہ قیمت کا حساب سونے ہی سے لگایا جائے گا کیوں کہ تاریخ کے مختلف ادوار کی طرح آج بھی پوری دنیا میں مال کی قیمت کے حساب کا معیار سونا ہے۔

☆ لیکن آخری رائے جس پر ہمارا اطمینان ہے، وہ ہے جو محترم ڈاکٹر موسیٰ شاہین لاشین نے ... جو اصول الدین کالج کے پرنسپل اور جامعہ ازہر کے نائب مدیر ہیں،

مصری ٹیلی ویژن کے پروگرام ''نور علی نور'' کی ایک نشست میں پیش کی تھی۔(۱) اس رائے کے مطابق یہ معاملہ انسان کی اپنی صواب دید پر موقوف ہے لہٰذا جس کا جی چاہے نوٹوں کا حساب سونے میں لگائے اور رخصت پر یعنی دین میں جو آسانی اور وسعت ہے اس کے مطابق عمل کرے اور اس صورت میں اس کے حق میں یہ بات بھی جاتی ہے کہ بعض علماء کے نزدیک سونا ہی قیمتوں کا حساب لگانے کی بنیاد ہے۔

اور اگر چاہے تو نوٹوں کا حساب چاندی میں لگائے اور عزیمت پر عمل کرے۔ واللہ اعلم وھو الموفق الی الخیر۔

سونے کا زیور پہننے سے باز رکھنے کے لیے عورتوں کو خوف دلانا اور اس سلسلے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان پر تحقیقی گفتگو

کتب احادیث میں متعدد ایسی حدیثیں موجود ہیں، جن میں عورتوں کو سونے کا زیور پہننے سے ڈرایا گیا ہے مثلاً:

۱- امام نسائیؒ نے سند صحیح سے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ہند بنت ہبیرہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ انہوں نے ہاتھ میں سونے کا موٹا سا چھلا پہن رکھا تھا جسے دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے ان کے ہاتھ پر ضرب لگائی۔ اس پر ہند بنت ہبیرہؓ سیدۃ النساء حضرت فاطمہؓ کے پاس گئیں اور ان سے شکایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے میرے ہاتھ پر مارا ہے، ان کی بات سن کر حضرت فاطمہؓ نے سونے کی ایک زنجیر جو گردن میں پہن رکھی تھی کھینچ کر اتار دی اور کہا:

''یہ زنجیر بھی مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحفتاً دی ہے۔''

ابھی وہ زنجیر حضرت فاطمہؓ کے ہاتھ میں تھی کہ نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے اور حضرت فاطمہ کے ہاتھ میں سونے کی زنجیر دیکھ کر آپ نے فرمایا:

---

(۱) تفصیل کے لیے ہماری کتاب ''بدایۃ الداعیۃ'' کا مطالعہ کیا جائے، یہ کتاب ہماری انجمن ''سیدنا شباب محمد ﷺ'' کے ان کتابچوں میں شامل ہے، جو انجمن نے دعوت وتبلیغ کے نقطۂ نگاہ سے شائع کیے ہیں۔ (مرتب)

يا فاطمة! أيغرك ان يقول الناس ابنة رسول الله و فى يدك سلسلة من النار.

''اے فاطمہ! کیا تم اس بات پر مغرور ہوگئی ہو کہ لوگ کہتے ہیں کہ فاطمہؓ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی ہے اور اسی وجہ سے تمہارے ہاتھ میں یہ آگ کی زنجیر ہے!''

یہ فرما کر حضورؐ باہر تشریف لے گئے اور حضرت فاطمہؓ کے پاس نہ ٹھہرے۔ حضرت فاطمہؓ نے وہ زنجیر بازار میں فروخت کردی اور اس کی قیمت میں جو رقم حاصل ہوئی تھی اس کا ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا۔ جب اس بات کی خبر نبی کریم ﷺ کو ہوئی تو آپ نے فرمایا:

الحمد لله الذى انجى فاطمة من النار

''شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے فاطمہؓ کو آگ سے بچالیا۔''

۲- ابوداؤد اور نسائی نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ايما امرأة تقلدت قلادة من ذهب قلدت فى عنقها مثلها من النار يوم القيمة، و ايما امرأة جعلت فى اذنها قرطا من ذهب جعل فى اذنها مثلها من النار يوم القيامة.

''جس عورت نے سونے کا گلو بند یا ہار پہنا قیامت کے دن اسی کی مانند آگ کا ہار اس کی گردن میں پہنایا جائے گا اور جو عورت اپنے کانوں میں سونے کی بالیاں پہنے گی قیامت کے دن اسی طرح کی آگ کی بالیاں اس کے کانوں میں پہنائی جائیں گی۔''

۳- ابوداؤد اور نسائی نے ہی ربعی بن حراش سے روایت کیا ہے وہ اپنی بیوی سے اور ان کی بیوی حضرت حذیفہؓ کی بہن سے روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

يا معشر النساء! ما لكن فى الفضة تحلين به، اما انه ليس منكن امرأة تتحلى ذهبا و تظهره الا عذبت به

''اے گروہ خواتین! تم جو چاندی کا زیور پہنتی ہو اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن جو عورت سونے کا زیور پہنے گی اور پھر وہ دوسروں کو دکھاتی پھرے گی اسے ضرور عذاب ہوگا۔''

اس حدیث کی سند میں خذیفہؓ کی جس بہن کا ذکر ہے اس کا نام فاطمہ ہے۔

۴- نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے کہا:

یا رسول الله! سوارین من ذهب؟ (یا رسول اللہ! سونے کے دو کنگن)

آپؐ نے فرمایا:

سوارین من نار (آگ کے دو کنگن!)

اس عورت نے پھر عرض کیا: طوقا من ذهب (سونے کا ایک گلو بند؟)

آپؐ نے ارشاد فرمایا: طوقا من نار (آگ کا ایک گلو بند)

اس نے پھر کہا: قرطان من ذهب؟ (سونے کی دو بالیاں؟)

آپؐ نے ارشاد فرمایا: قرطین من نار (آگ کی دو بالیاں)

اس عورت نے سونے کے دو کنگن پہن رکھے تھے۔ آپ کا ارشاد سن کر اس نے وہ کنگن پھینک دیے اور کہنے لگی: عورت اگر بناؤ سنگھار نہ کرے تو خاوند کی رغبت اس میں کم ہو جاتی ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ما یصنع احداکن ان تصنع قرطین من فضة ثم تصفره بزعفران او قال بعبیر.

''تمہارے لیے اس میں کیا چیز مانع ہے کہ چاندی کی دو بالیاں بنواؤ پھر انہیں زعفران سے زرد رنگوا لو۔ یا آپ نے فرمایا: عنبر کی خوشبو سے رنگوا لو۔''

عبیر ایک مرکب خوشبو ہے جس میں زعفران بھی ہوتا ہے۔

۵- نسائی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ

اپنے اہل خانہ کو سونے کے زیورات اور ریشم پہننے سے منع کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ:

ان کنتم تحبون حلیة الجنة و حریرها فلا تلبسوها فی الدنیا

''اگر تم جنت کے زیور اور ریشم کو محبوب رکھتی ہو تو دنیا میں سونے کا زیور اور ریشم نہ پہنو۔''

۶- نسائی نے ہی روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سونا پہننے سے منع فرمایا ہے الا یہ کہ تھوڑا سا ہو مثلاً عورتوں کے کانوں کی بالی یا انگوٹھی۔

۷- ابوداؤد نے بنانہؒ (عبد الرحمٰن بن حیان انصاری کی لونڈی) سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں ایک لڑکی کے ہمراہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ میرے ساتھ جو لڑکی تھی اس نے پازیب پہن رکھی تھی جس سے آواز پیدا ہوتی تھی تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا: اس کی پازیب کاٹ ڈالو، ورنہ اسے میرے پاس نہ لاؤ اور فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے:

لا تدخل الملئکة بیتا فیه جرس

''فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔''

ایسی احادیث کی توجیہات، جن میں عورتوں کے لیے سونا پہننے پر وعید آئی ہے

المنذرؒ نے ان احادیث پر جن میں عورتوں کو سونا پہننے پر وعید سنائی گئی ہے اپنی کتاب ''الترغیب والترھیب'' میں توضیحی نوٹ میں لکھا ہے اور کہا ہے کہ ان تمام احادیث میں مختلف توجیہات کی گنجائش ہے۔

۱- ایک یہ کہ ایسی تمام احادیث منسوخ ہیں کیوں کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عورتوں کے لیے سونے کا زیور پہننا مباح ہے۔

۲- دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان حدیثوں میں جو وعید ہے وہ ان عورتوں کے متعلق ہے جو زیور کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتیں، اور جو زکوٰۃ ادا کرتی ہیں ان کے ساتھ اس وعید کا کوئی تعلق نہیں۔

۳- تیسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ وعید ان عورتوں کے لیے ہے جو زیب و زینت کر کے اس کی نمائش کرتی ہیں اور یہ بات اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے جو امام نسائی نے ربعی بن حراش کے حوالے سے روایت کی ہے اور جس میں ہے کہ "تم میں سے جو عورت سونے کا زیور پہن کر اس کی نمود و نمائش کرے گی اسے عذاب ہوگا۔"

۴- چوتھی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سونا پہننے سے جن احادیث میں منع فرمایا ہے ان سب کا موقع و محل یہ ہے کہ آپ نے دیکھا کہ عورتوں نے موٹے موٹے اور بھاری زیورات پہن رکھے ہیں، جس سے یہ گمان ہوسکتا ہے کہ پہننے والیوں کو اس پر فخر و غرور ہے جو فی نفسہٖ بری بات ہے۔

اور ہمیں علامہ منذری کی رائے سے اتفاق ہے۔ اس لیے کہ یہ بات ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے بعد اپنی بیٹیوں اور بیویوں کو سونے کا زیور پہنایا کرتے تھے اور اگر نبی کریم ﷺ نے آخری ایام میں عورتوں کو سونا پہنانے سے منع فرما دیا ہوتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ یہ جلیل القدر صحابہ کرامؓ ایسا اقدام کرتے یعنی اپنی عورتوں کو سونا پہنا کر نبی کریم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے۔ چناں چہ امام بیہقیؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا اپنی بیٹیوں کو سونے کا زیور پہنایا کرتی تھیں اور موطا امام مالکؒ میں یہ روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اپنے بھائی کی یتیم بیٹیوں کی ولی اور مربی تھیں، اور ان لڑکیوں کے پاس سونے کا زیور بھی تھا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی بیٹیوں اور لونڈیوں کو سونے کا زیور پہنایا کرتے تھے اور ہر لڑکی کا زیور پارس دینار کا تھا۔

لہٰذا اگر اس سلسلے میں کوئی ممانعت موجود ہے تو وہ صرف اس صورت کے لیے ہے جس میں سونے کا زیور پہننے میں بہت اسراف سے کام لیا جائے اور پہننے والی کے بارے میں یہ گمان ہو کہ اس کا مقصد دولت کی نمود و نمائش اور فخر و غرور ہے۔

☆☆

عورت اور صدقات

خاوند کی اجازت ہو تو عورت کے لیے اس کے مال میں سے صدقہ دینا جائز ہے

اگر عورت کو معلوم ہو کہ خاوند اپنے مال سے اس کا صدقہ دینا پسند کرتا ہے تو عورت کے لیے خاوند کے مال میں سے صدقہ دینا جائز ہے اور اگر خاوند کی رضا معلوم نہ ہو تو خاوند کے مال میں سے صدقہ دینا عورت کے لیے حرام ہے۔

اس موقف کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے۔

۱۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اذا انفقت المرأة من طعام بیتھا، و فی روایة من بیت زوجھا غیر مفسدة کان لھا اجرھا بما انفقت ولزوجھا اجرہ بما کسب وللخازن مثل ذالك لا ینقص بعضھم من اجر بعض. (بخاری و مسلم و مسند ابو یعلی)

”عورت اگر اپنے گھر کے کھانے میں سے اور ایک روایت کے الفاظ ہیں اپنے خاوند کے گھر سے کچھ خرچ کرتی ہے بشرطیکہ اس کی نیت فاسد نہ ہو یعنی خاوند کو نقصان پہنچانا نہ چاہتی ہو تو اسے اس خرچ کرنے پر اجر ملے گا اور اس کے خاوند کو بھی اجر ملے گا اس بنا پر کہ اس نے یہ مال کمایا تھا اور خزانچی کو بھی یعنی اس شخص کو بھی جس کے پاس یہ مال محفوظ رہتا ہے اتنا ہی اجر ملے گا اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے اجر میں کمی کا باعث نہیں بنے گا۔“

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اذا انفقت المرأة من بيت زوجها عن غير امره فلها نصف اجره.

(بخاری و مسلم و ابوداؤد)

”جب عورت اپنے خاوند کے حکم کے بغیر اس کے مال میں سے (صدقہ وخیرات پر) خرچ کرتی ہے تو اسے آدھا ثواب ملتا ہے۔“

امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

”اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ کارندہ یعنی خزانچی یا بیوی یا غلام جو بھی مالک مال کے مال میں سے صدقہ وخیرات کرتا ہے اسے مالک کی طرف سے خرچ کرنے کی اجازت حاصل ہونی ضروری ہے۔ اگر خرچ کرنے کی اجازت نہیں تھی اور اس کے باوجود خرچ کیا تو ان میں سے کسی کو کچھ بھی اجر نہیں ملے گا بلکہ بلا اجازت خرچ کرنے کی بنا پر اس خرچ کو وہ مال کی ذمہ داری خرچ کرنے والے پر ہوگی۔“

البتہ اجازت دو قسم کی ہے:

۱- خرچ کرنے اور صدقہ وغیرہ دینے کی صریح اجازت

۲- وہ اجازت جو عام طور پر روز مرہ کے معمولات کو دیکھتے ہوئے سمجھی جاسکتی ہے مثلاً کسی سائل کو ایک آدھ ٹکڑا دے دینا جو عام طور پر سبھی دیتے ہیں اور عرفاً و عادتاً معلوم ہے کہ خاوند یا مالک کی طرف سے اس قسم کے دینے کی اجازت ہوتی ہے۔ اگرچہ اس نے زبان سے اجازت نہیں دی۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جب روز مرہ کے معمولات کو دیکھتے ہوئے یہ بات معلوم ہوجائے کہ وہ اس قسم کے دینے کو ناپسند نہیں کرتا اور یہ کہ صدقہ دینے کے سلسلے میں اس کا مزاج عام لوگوں کی مانند ہے جو اس طرح کے دینے کو ناپسند نہیں کرتے۔

لیکن اگر معمولات کے بارے میں کچھ پتہ نہ ہو یا اس کی رضا مندی کے بارے میں شک ہو یا مالک انتہائی بخیل اور لالچی ہو اور اس کے حالات ومعمولات کو دیکھتے ہوئے اس کا بخیل ہونا معلوم ہوچکا ہو یا اس کے بخیل ہونے کا شک ہو تو ایسی صورتوں میں عورت، ملازم یا غلام کو خاوند اور مالک کے مال میں سے اس کی باقاعدہ اجازت حاصل کیے بغیر صدقہ و خیرات دینا جائز ہے۔

لہٰذا نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے بارے میں کہ

و ما انفقت من کسبه من غير امره فان نصف اجره له

''عورت خاوند کی کمائی میں سے اس کے حکم کے بغیر جو کچھ خرچ کرے گی اس کا نصف اجر خاوند کو ملے گا۔''

یہ متعین ہوگیا کہ اگر عورت نے خاوند کی صریح اجازت یا عرفی اجازت کے بغیر خرچ کیا ہے تو اسے کوئی اجر نہیں ملے گا بلکہ اس کی ذمے داری اور بوجھ عورت پر ہوگا۔

دوسری بات جو اس سلسلے میں جاننا ضروری ہے، یہ ہے کہ عرف و عادت سے یہ معلوم ہوجانے کے باوجود کہ خاوند یا مالک اس خرچ کو ناپسند نہیں کرتا، خرچ کرنے یعنی صدقہ یا خیرات دینے کی جو اجازت ہے یہ بھی صرف تھوڑی مقدار سے متعلق ہے یعنی اتنی مقدار جو عام لوگ سائل کو دیتے ہیں۔ چناں چہ اگر اس مقدار سے زیادہ خرچ کیا تو ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔ دراصل نبی کریم ﷺ کے ارشاد: اذا انفقت المرأة من طعام بيتها غير مفسدة (کہ اگر عورت اپنے گھر کے کھانے میں سے خرچ کرتی ہے اور اس کی نیت فاسد نہیں ہے یعنی نقصان پہنچانے کی غرض سے ایسا نہیں کرتی تو اسے ثواب ہوگا)۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خرچ اس قدر ہونا چاہیے جس کے بارے میں عرف و عادت سے یہ معلوم ہو کہ اس خرچ پر خاوند راضی ہوگا۔ اور لفظ ''طعام'' (کھانا) سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اتنی قلیل مقدار ہو جو عام طور پر دے دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس درہم و دینار کا دینا اکثر لوگوں کے لیے اور بہت سے حالات میں مشکل ہوتا ہے۔

دوسری حدیثوں میں جو عورت، غلام اور خزانچی کے خرچ کرنے کا ذکر ہے، اس خرچ سے مراد مالک مال کے اہل و عیال، اس کے ملازموں، اس کی ضروریات اور اس کے مہمانوں وغیرہ پر خرچ کرنا ہے۔ اور اس میں ان کا وہ صدقہ و خیرات بھی داخل ہے جس کی مالک نے صراحتاً یا عرفاً اجازت دے رکھی ہو۔'' (۱)

حضرت ابو امامہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع کے سال نبی کریم ﷺ کو

---

(۱) اقتباس از شرح صحیح مسلم للنوویؒ مطبوعہ دار الشعب، ج۲، ص۳۶

خطبہ میں ارشاد فرماتے سنا کہ:

لا تنفق المرأة شيئا من بيت زوجها الا باذن زوجها

''کوئی عورت اپنے خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کرے۔''

عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا کھانا بھی؟ آپ نے فرمایا:

ذلك افضل اموالنا (یہ تو ہمارا بہترین مال ہے)

یہ روایت ترمذی میں ہے اور امام ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا ہے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ زبیرؓ سخت مزاج شخص ہیں اور میرے پاس مانگنے والے مسکین ومحتاج آتے ہیں تو کیا میں زبیر کے گھر سے ان کی اجازت کے بغیر صدقہ دے دیا کروں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ارضخي ولا توعي فيوعي الله عليك

''تھوڑا بہت ضرور خرچ کیا کرو، جس طرح عام طور پر محتاجوں کو دیا جاتا ہے اور سینت سینت کر نہ رکھو۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ بھی تم کو دینا روک لے گا۔''

خاوند کی اجازت کے بغیر عورت اپنا مال خیرات کرسکتی ہے

صحیح مسلم میں ہے: حضرت میمونہ بنت حارثؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی کریمؐ کے زمانے میں ایک لونڈی آزاد کی اور اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا، تو آپ نے فرمایا:

لو اعطيتها اخوالك كان اعظم لاجرك

''اگر تم وہ لونڈی اپنے ماموؤں کو دے دیتیں تو تمہارا اجر وثواب بہت زیادہ ہوتا۔''

بخاری کی روایت میں ''اخوالک'' کی بجائے ''اخواتک'' ہے یعنی اپنی بہنوں کو دے دیتیں۔ اور امام مالکؒ نے مؤطا میں جو روایت نقل کی ہے اس میں ''اختک'' ہے جس کے معنی

یہ ہیں کہ اپنی بہن کو دے دیتیں۔

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ مختلف روایتوں میں الفاظ کے اختلاف سے اصل معانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سب کا مفہوم ایک ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ سب مختلف الفاظ آپؐ نے ہی ارشاد فرمائے ہوں۔ حدیث شریف میں دراصل دو باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے:

۱- ایک یہ کہ ماں کے رشتہ داروں کا خیال رکھنا ضروری ہے کیوں کہ ماں کا حق نہایت محترم ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ماں کے ساتھ زیادہ حسن سلوک کیا جائے۔

۲- دوسری بات اس حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ عورت خاوند کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں سے خیرات اور صدقہ دے سکتی ہے۔

عورت کا اپنے مال میں سے اپنے خاوند اپنی اولاد اور رشتہ داروں کو صدقہ دینا افضل ہے

۱- امام بخاریؒ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت زینبؓ، جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی تھیں، نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے آج صدقہ دینے کا حکم دیا ہے اور میرے پاس کچھ زیور ہے، جو میں بطور صدقہ دینا چاہتی تھی لیکن ابن مسعود نے خیال ظاہر کیا کہ وہ خود اور ان کی اولاد میرے صدقے کی دوسروں سے زیادہ حق دار ہے اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

صدق ابن مسعود، زوجك و ولدك احق من تصدقت به عليهم

''ابن مسعود نے سچ کہا ہے، تمہارا خاوند اور تمہاری اولاد، تمہارے صدقہ کی سب سے زیادہ مستحق ہیں۔''

۲- حضرت زینب رضی اللہ عنہا، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تصدقن يا معشر النساء ولو من حليكن

''اے گروہِ خواتین! صدقہ دیا کرو، خواہ یہ صدقہ اپنے زیورات میں سے ہو۔''

حضرت زینبؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد سن کر میں عبد اللہ بن مسعود کے پاس آئی اور میں نے کہا: نبی کریم ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم صدقہ دیں اور آپ تنگ دست ہیں لہٰذا آپ جا کر نبی کریم ﷺ سے دریافت کریں کہ اگر میں صدقے کا مال آپ کو دے دوں اور وہ میری طرف سے صدقہ شمار ہو تب تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہارے علاوہ کسی دوسرے کو دوں۔ عبد اللہؓ کہنے لگے: تم خود ہی جا کر نبی کریم ﷺ سے یہ بات پوچھ لو۔ چناں چہ میں خود ہی گئی اور دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کے دروازے پر ایک انصاری خاتون اور بھی موجود ہیں اور ان کو بھی وہی مسئلہ درپیش ہے جو مجھے ہے۔ حضرت زینبؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا رعب و جلال آپ کے پاس جانے میں مانع ہوا۔ اسی دوران میں حضرت بلالؓ باہر آئے تو ہم نے ان سے کہا: آپ رسول اللہ ﷺ سے جا کر عرض کریں کہ دو عورتیں باہر دروازے پر موجود ہیں جو یہ دریافت کرنا چاہتی ہیں کہ اگر ہم اپنے مال میں سے اپنے خاوندوں اور اپنے زیر پرورش یتیموں کو صدقہ دیں تو کیا یہ صدقہ شمار ہوگا؟ لیکن حضور کو یہ نہ بتانا کہ پوچھنے والی خواتین کون ہیں؟ چناں چہ حضرت بلالؓ نے جا کر نبی کریم ﷺ سے یہ مسئلہ پوچھا، آپ نے دریافت فرمایا: وہ عورتیں کون ہیں؟ حضرت بلال نے عرض کیا: ایک تو کوئی انصاری عورت ہے اور دوسری زینبؓ ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا: کون سی زینب؟ حضرت بلال نے عرض کیا: عبد اللہ بن مسعود کی بیوی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لهما اجران اجرًا لقرابة و اجرا لصدقة

”ان کو دو اجر ملیں گے، ایک رشتہ داروں سے حسن سلوک کا اور دوسرے صدقے کا۔“

مندرجہ بالا دونوں حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر عورت مال دار ہو اور اس پر زکوٰۃ واجب ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ اپنی زکوٰۃ اپنے خاوند کو دے دے بشرطیکہ وہ واقعی محتاج اور مستحق زکوٰۃ ہو کیوں کہ عورت پر یہ ذمے داری نہیں ہے کہ وہ خاوند کی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے مال خرچ کرے۔ اسی طرح عورت اپنے مال کی زکوٰۃ اپنی اولاد کو بھی دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ زکوٰۃ کے مستحق اور مفلس ہوں لیکن مرد اپنے مال کی زکوٰۃ اپنے باپ،

دادا، اپنی ماں، دادی، پردادی اور اپنے بیٹے بیٹیوں اور پوتے پوتیوں کو نہیں دے سکتا کیوں کہ مرد پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے باپ، دادا پردادا پر (خواہ یہ رشتہ کتنا ہی اوپر تک چلا جائے) خرچ کرے کیوں کہ کسی شخص کے آباء واجداد اور بیٹے بیٹیاں یا پوتے پوتیاں مفلس بھی ہوں تو اس شخص کے مالدار ہونے کی بنا پر اس کے اوپر اور نیچے، یہ سب رشتہ دار غنی ہی شمار ہوں گے لہٰذا اگر یہ ان کو زکوٰۃ دے گا تو گویا غنی کو زکوٰۃ دے گا اور اپنی ذات کو فائدہ پہنچا رہا ہوگا۔ کیوں کہ ان رشتہ داروں پر خرچ کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ اب اگر یہ شخص ان کو زکوٰۃ دیتا ہے تو گویا اپنے آپ کو زکوٰۃ دیتا ہے جب کہ اپنی زکوٰۃ اپنے اوپر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

اسی طرح کوئی شخص اپنے مال کی زکوٰۃ اپنی بیوی کو نہیں دے سکتا۔

المنذریؒ لکھتے ہیں: تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ کوئی مرد اپنے مال کی زکوٰۃ اپنی بیوی کو نہیں دے سکتا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ بیوی کا نان ونفقہ مرد کے ذمہ ہے، جس کی وجہ سے عورت کو زکوٰۃ کی ضرورت نہیں۔ یعنی مرد اگر غنی ہے تو عورت بھی اس کے غنی ہونے کی بنا پر غنی کے حکم میں ہے۔ البتہ اگر عورت مقروض ہو تو خاوند اسے مصارف زکوٰۃ میں سے ادائیگی قرض کے مصرف کے ماتحت اپنے مال کی زکوٰۃ میں سے اس قدر رقم دے سکتا ہے جس سے اس کا قرض ادا ہو جائے۔[1]

زکوٰۃ کی رقم خاوند کو دینے کے سلسلے میں اختلافِ فقہاء

اس سلسلے میں فقہاء کے تین قول ہیں:

☆ ایک قول کے مطابق عورت اپنے خاوند اور اپنی اولاد کو زکوٰۃ کی رقم دے سکتی ہے بشرطیکہ وہ زکوٰۃ لینے کے اہل اور حق دار ہوں۔ بلکہ اس قول کے مطابق خاوند اور اولاد کو زکوٰۃ دینے کا ثواب اجنبی کو دینے کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

یہ مسلک امام شافعیؒ کا ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے دونوں شاگردوں یعنی امام ابو یوسفؒ

---

(۱) فقہ السنہ، ج ۱، ص ۴۰۱

اور امام محمدؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ اور امام احمد بن حنبلؒ سے بھی یہی قول مروی ہے اور امام مالکؒ سے اس سلسلے میں دو قول مروی ہیں، جن میں ایک یہی ہے۔ امام سفیان ثوریؒ اور ابن المنذرؒ کا قول بھی یہی ہے اور اہل ظاہر یعنی ابن حزمؒ اور داؤد ظاہریؒ کی رائے بھی یہی ہے۔(۱)

☆ لیکن امام ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک بیوی اپنے مال کی زکوٰۃ خاوند کو نہیں دے سکتی اور حضرت زینبؓ زوجہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی حدیث جو اوپر بیان ہوئی، جس کے مطابق بیوی خاوند کو صدقہ دے سکتی ہے، اس کے بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ اس حدیث میں صدقہ سے مراد نفلی صدقات ہیں اور زکوٰۃ جو کہ فرض ہے وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عورت اگر اپنی زکوٰۃ خاوند کو دیتی ہے تو بہت ممکن ہے کہ لباس، غذا یا اسی قسم کی کسی اور چیز کی صورت میں وہی زکوٰۃ کی رقم لوٹ کر خود اسی کے پاس آئے۔

☆ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر خاوند زکوٰۃ کا جو مال اپنی بیوی سے لیتا ہے اس سے وہ بیوی کے نان و نفقہ پر خرچ کرتا ہے تب تو خاوند کے لیے بیوی کی زکوٰۃ لینا اور بیوی کے لیے خاوند کو اپنے مال کی زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر خاوند زکوٰۃ کا یہ مال کسی دوسرے مصرف میں لاتا ہے تو بیوی اپنے مال کی زکوٰۃ اسے دے سکتی ہے۔

خلاصۂ بحث: اس مسئلہ میں کہ بیوی اپنے مال کی زکوٰۃ خاوند کو دے سکتی ہے یا نہیں۔ تین اقوال ہیں:

۱- ایک قول کے مطابق بیوی کا اپنے خاوند کو اپنے مال کی زکوٰۃ دینا حرام ہے۔ یہ قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے۔

۲- دوسرے قول کے مطابق جائز ہے، یہ قول امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کا ہے اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی قول ہے۔ علاوہ ازیں مالکیوں میں سے اشہبؒ کا اور سفیان ثوریؒ، ابن المنذرؒ اور اہل ظاہر کا بھی یہی مسلک ہے۔

۳- تیسرے قول کے مطابق عورت کا اپنے خاوند کو زکوٰۃ دینا مکروہ ہے، مالکیوں کے نزدیک یہی قول قابل ترجیح ہے۔

---

(۱) نیل الاوطار، ج ۵، ص ۲۳۴ اور فقہ السنہ ج ۱، ص ۴۰۶

ہمارے خیال میں صحیح یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا خاوند حاجت مند ہے یا مقروض ہے تو عورت کے لیے اپنے مال کی زکوٰۃ اسے دینا جائز ہے۔ بشرطیکہ اس بات کی ضمانت موجود ہو کہ زکوٰۃ کا یہ مال یا اس کا کچھ حصہ زکوٰۃ دینے والی طرف واپس نہ لوٹ آئے گا خواہ وہ خوراک، کپڑے یا اسی قسم کی کسی اور چیز کی صورت میں ہو۔

عورت کا اپنے مال کی زکوٰۃ اپنے بیٹے کو دینا

صحیح بخاریؒ کی یہ حدیث پہلے بیان ہوچکی ہے کہ:

زوجك و ولدك احق من تصدقت عليهم

''تیرا خاوند اور تیری اولاد تیرے صدقہ کی دوسری لوگوں سے زیادہ حق دار ہے۔''

اس کے بارے میں ابن منذر نے لکھا ہے کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ بیٹے کو صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ابن منذرؒ مزید لکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ میں سے کچھ دینا جائز نہیں جس کے اخراجات کی ذمہ داری زکوٰۃ دینے والے پر ہو اور باپ کی موجودگی میں ماں پر اولاد کے اخراجات کی ذمہ داری نہیں ہے۔

لیکن اگر وہ عورت جس پر زکوٰۃ واجب ہے، ایسی ہو کہ اس پر اپنے بیٹے، بیٹی، باپ، دادا یا پرداد وغیرہ میں سے کسی کے اخراجات کی ذمہ داری شرعاً عائد ہوتی ہو تو پھر وہ اپنی زکوٰۃ ان افراد میں سے کسی کو نہیں دے سکتی، جن کے اخراجات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی نابالغ مفلس بچہ ہو جس کا باپ مرگیا ہو اور سوائے ایک خوشحال ماں کے کوئی اور اس کے اخراجات کا کفیل نہ ہو تو اس صورت میں ایسی ماں کے مال کی زکوٰۃ اس نابالغ بچہ کو دینا جائز نہیں ہے۔

باقی یہ مسئلہ کہ عورت پر کن حالات اور کن صورتوں میں اپنے اصول یعنی باپ دادا وغیرہ اور فروع یعنی بیٹے پوتے نواسے وغیرہ کا نفقہ واجب ہوتا ہے، تو یہ تفصیل طلب مسئلہ ہے اور اس میں ائمہ فقہ کے درمیان اختلاف بھی ہے۔ لہٰذا ان تفصیلات کو دیکھنے کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے کیوں کہ اس مختصر کتاب میں سیر حاصل بحث کی گنجائش نہیں ہے۔

محدث اثرؒ نے اپنی سنن میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اگر تمہارا کوئی قریبی رشتہ دار تمہارے زیر کفالت نہ ہو تو تم اس رشتہ دار کو اپنے مال کی زکوٰۃ دے سکتے ہو، لیکن اگر یہ قریبی رشتہ دار تمہارے زیر کفالت ہے تو تم اپنے زیر کفالت رشتہ دار کو اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں دے سکتے کیوں کہ اصول یہ ہے کہ جو افراد کسی کے اہل و عیال میں شامل نہیں ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور جو کسی کے زیر کفالت ہوں ان کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔[1]

عورت اور صدقۂ فطر

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان کی عید الفطر کے دن ہر مسلمان پر خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بڑا، سب پر صدقہ فطر واجب کیا ہے اور اس کی مقدار کھجور یا جو کا ایک صاع مقرر فرمائی ہے۔ (یہ روایت بخاریؒ، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے)۔

یہ حدیث اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ صدقۂ فطر رمضان المبارک ختم ہونے پر واجب ہوتا ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے، خواہ وہ بچہ ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام۔

صدقہ فطر ہر ایسے آزاد مسلمان پر واجب ہے جو اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ایک دن رات کی خوراک سے زائد۔ ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو کا مالک ہو۔

یہ مسلک امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا ہے اور علامہ شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ یہی صحیح اور حق ہے۔

حنفیوں کے نزدیک صدقۃ الفطر واجب ہونے کے لیے صاحب نصاب ہونا شرط ہے۔

''صاع'' چار مد کے برابر ہوتا ہے اور ''مد'' غلے کی وہ مقدار ہے جو ایک معتدل قد و قامت والے شخص کے دونوں کف دست میں آجائے، جو تقریباً ایک پیالی اور پیالی کا تہائی یا دو پیالیوں کے برابر ہے۔

---

(۱) نیل الاوطار، ج ۵، ص ۲۳۵

صدقۂ فطر ہر آزاد مسلمان پر اس کی اپنی ذات کی طرف سے اور ہر اس شخص کی طرف سے ادا کرنا واجب ہے جس کے مصارف کی ذمہ داری اس پر ہو مثلاً بیوی، بیٹے، بیٹیاں اور ایسے تمام خادم جن کے اخراجات اس کے ذمہ ہوں اور جن پر یہ اپنا مال خرچ کرتا ہو۔

اس حدیث سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صدقۂ فطر ہر مسلمان مرد و عورت پر خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، بچہ ہو یا بڑا، سب پر واجب کیا ہے اور یہ بھی کہ یہ سب اپنے مال میں سے یہ صدقہ خود ادا کریں۔

چناں چہ حدیث کے الفاظ سے بظاہر جو بات سمجھ میں آتی ہے یہی ہے کہ عورت پر واجب ہے کہ خواہ اس کا خاوند ہو یا نہ ہو، اپنا صدقہ فطر اپنے مال میں سے خود ادا کرے بشرطیکہ صدقہ واجب ہونے کی باقی شرائط اس میں پائی جاتی ہوں۔ امام داؤد ظاہریؒ نے حدیث کے اسی ظاہری مفہوم کو لیا ہے اور سفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ اور ابن المنذرؒ کا بھی یہی قول ہے۔

لیکن امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، لیثؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک عورت کا صدقۂ فطر اس کے شوہر کے ذمے واجب ہے۔ کیوں کہ عورت کے تمام اخراجات شوہر کے ذمے ہیں اور صدقۂ فطر کا خرچ بھی ان میں شامل ہے۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں یہ یہ بات محل نظر ہے۔ اس لیے کہ علماء نے کہا ہے کہ اگر شوہر تنگ دست ہو اور بیوی آزاد عورت نہ ہو بلکہ کسی کی لونڈی ہو تو ایسی صورت میں اس کا صدقۂ فطر ادا کرنا اس کے آقا پر واجب ہوگا۔ برعکس نفقہ کے جو ہر حال میں شوہر کے ذمے ہے۔ چناں چہ دیگر اخراجاتِ زندگی اور صدقۂ فطر میں فرق ہے۔

اسی بنا پر ہماری رائے یہ ہے کہ صدقۂ فطر عورت اپنے مال سے ادا کرے اگر اس کے پاس مال ہو اور صدقۂ فطر واجب ہونے کی شرائط اس میں پوری طرح موجود ہوں، خواہ اس کے دیگر اخراجات و مصارف شوہر پورے کرتا ہو۔ اور یہی صورت دینی نقطۂ نظر سے بھی زیادہ محتاط طریقہ ہے۔

❀

صوم

(روزہ)

صوم کے لغوی معنی ''رکنا'' ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا (مریم:۲۶) ''میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے۔'' یعنی گفتگو سے رکنے کی نذر مانی ہے۔

اصطلاحِ شرع میں صوم سے مراد یہ ہے کہ پورا دن یعنی طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ایسی تمام باتوں سے رکا جائے جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس سلسلے میں شریعت نے جو کچھ شرائط کی ہیں ان کی پابندی کی جائے۔

روزے کے اقسام

روزے چار قسم کے ہیں:

۱- فرض روزے:

یہ ماہِ رمضان کے روزے ہیں خواہ وقت پر رکھے جائیں یا قضا رکھے جائیں اور کفارے کے روزے اور نذر یعنی منت کا روزہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔

۲- حرام روزے:

عید الفطر کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اسی طرح عید الاضحیٰ کے دن اور اس کے بعد دو دن روزہ رکھنا بھی حرام ہے۔ البتہ حج میں اگر کسی حاجی نے حج تمتع یا حج قران کیا ہو تو وہ عید الاضحیٰ کے فوراً بعد کے دو دنوں میں روزہ رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی تیسرے دن یعنی

عید کا دن شامل کر کے چوتھے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے خاوند کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھنا بھی حرام ہے۔ الاّ یہ کہ خاوند کو عورت کی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً وہ گھر سے غیر حاضر ہو یا حالتِ احرام میں ہو یا اعتکاف میں ہو۔

۳- مستحب روزے:

☆ اس میں ماہ محرم کے روزے شامل ہیں اور اس ماہ میں سب سے افضل نو (۹) اور دس (۱۰) تاریخ کے دو روزے ہیں۔

☆ ہر مہینہ میں تین روز یعنی قمری مہینہ کی تیرہویں چودہویں اور پندرہویں تاریخوں کے روزے رکھنا بھی مستحب ہے۔

☆ نیز ماہ ذی الحجہ کی نو تاریخ۔ یعنی قربانی سے ایک دن پہلے کا روزہ بھی مستحب ہے لیکن ان لوگوں کے لیے جو حج نہ کر رہے ہوں۔

☆ ہر ہفتہ میں پیر اور جمعرات کے دو روزے بھی مستحب ہیں۔

☆ شوال کے مہینہ میں چھ روزے مستحب ہیں اور ان کے سلسلے میں افضل یہ ہے کہ عید الفطر کے اگلے دن سے شروع کر دیے جائیں اور مسلسل رکھے جائیں۔

۴- مکروہ روزے:

(۱) یوم شک کا روزہ یعنی اگر چاند کے نظر آنے میں شک ہو تو اس دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

(۲) محض جمعہ کے دن روزہ رکھنا یا محض ہفتہ کے دن روزہ رکھنا دونوں مکروہ ہیں۔

(۳) نو روز (نئے سال کے پہلے دن) کا روزہ رکھنا یا مہرگان (آتش پرستوں کی عید) کے دن روزہ رکھنا بھی مکروہ ہے۔ یہ دونوں غیر مسلموں کے تہوار ہیں اور لوگوں نے ان دنوں میں جشن منانے کی رسم اپنالی ہے۔

(۴) یہ بھی مکروہ ہے کہ رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ رکھا جائے، البتہ دو سے زیادہ دن پہلے روزہ رکھنا مکروہ نہیں ہے۔

حیض و نفاس والی عورت کے لیے روزہ رکھنا حرام ہے

حیض اور نفاس ایسے عذر ہیں جن کی بنا پر عورت کے لیے افطار یعنی روزہ نہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے لہٰذا اگر روزے دار عورت کو حیض شروع ہو جائے یا نفاس کا خون آ جائے یعنی زچگی ہو جائے تو اس عورت پر روزہ کھول دینا واجب ہے۔ اور ایسی حالت میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ اگر روزہ رکھے گی تو اس کا روزہ باطل ہوگا اور اس دن کی قضا لازم ہوگی۔ اس لیے کہ عورت کے لیے روزہ رکھنے کی شرائط میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ حیض و نفاس سے پاک ہو لہٰذا حیض و نفاس کی حالت میں روزہ رکھنا صحیح نہیں۔ اگرچہ اس پر رمضان کا روزہ فرض ہے لیکن چوں کہ وہ روزہ رکھنے سے شرعاً عاجز ہے اس لیے روزہ نہیں رکھ سکتی البتہ اس پر ان دنوں کے روزوں کی قضا واجب ہے جن میں اس عذرِ شرعی کی بنا پر وہ روزہ نہیں رکھ سکی اور اس مسئلہ پر پوری امت مسلمہ کے علماء کا اجماع ہے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک روزے کی شرائط دو قسم کی ہیں:

ایک شرائط وجوبِ صوم اور دوسری شرائط صحت صوم۔

روزہ واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ انسان جسمانی اور شرعی طور پر روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے یا کسی ایسی بیماری کی وجہ سے جس میں شفایاب ہونے کی توقع نہ ہو، روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ یہ جسمانی ناطاقتی کی صورت ہے اور حیض و نفاس کی وجہ سے روزہ رکھنے سے عاجز ہونا شرعی ناطاقتی ہے۔

اور روزہ درست ہونے کی شرائط میں یہ بھی شامل ہے کہ روزے دار حیض و نفاس اور زچگی سے پاک ہو خواہ خون نہ آئے۔

☆ حنفیوں کے نزدیک روزے کی شرائط تین قسم کی ہیں:

۱- روزہ فرض ہونے کی شرائط۔ ۲- روزہ رکھنا واجب ہونے کی شرائط۔ ۳-صحت روزہ کی شرائط۔

روزہ رکھنا واجب ہونے کی شرائط دو ہیں:

۱- حیض و نفاس سے پاک ہونا روزہ رکھنا واجب ہونے کی شرط ہے چناں چہ اگر کوئی عورت حیض یا نفاس کی حالت میں روزہ رکھے گی تو اس کا روزہ درست نہ ہوگا، اگرچہ اس پر روزہ فرض ہو۔

۲- روزہ رکھنا واجب ہونے کی دوسری شرط نیت ہے۔ چناں چہ روزہ رکھنا بغیر نیت کے درست نہیں تاکہ عادت اور عبادت میں فرق ہو سکے۔ اور نیت کے سلسلے میں صرف اتنا کافی ہے کہ روزہ رکھنے والے کو دل میں معلوم ہو کہ میں روزہ رکھ رہا ہوں البتہ اگر زبان سے بھی نیت کر لے کہ "میں روزہ رکھ رہا ہوں" تو سنت پر بھی عمل ہو جائے گا۔

☆ مالکیوں کے نزدیک بھی روزے کی شرائط تین قسم کی ہیں:

۱- محض روزہ فرض ہونے کی شرائط۔

۲- محض صحتِ روزہ کی شرائط اور

۳- روزہ فرض ہونے اور روزہ درست ہونے کی مشترکہ شرائط

روزہ فرض ہونے اور صحیح ہونے کی مشترکہ شرط یہ ہے کہ روزے دار حیض و نفاس سے پاک ہو چناں چہ حیض و نفاس والی عورت پر نہ تو روزہ رکھنا واجب ہے اور نہ اگر وہ روزہ رکھے تو روزہ صحیح ہوگا لیکن جونہی حیض یا نفاس والی عورت فجر سے پہلے پاک ہوئی اس پر اسی وقت روزہ کی نیت کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ خواہ طلوع فجر سے ایک لحظہ پہلے ہی پاک ہو۔ اسی طرح حیض اور نفاس والی عورت پر ان دنوں کے روزوں کی قضا واجب ہے جن دنوں میں وہ حیض یا نفاس کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکی۔ یعنی حیض و نفاس روزے کے لیے عذر ہے اور اس عذر کے دور ہوتے ہی اس پر روزہ رکھنا لازم ہو جاتا ہے۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک روزے کے شرائط کی تین قسمیں ہیں:

۱- شرائط کا وجوب

۲- شرائط صحت

۳- ایسی شرائط جو روزہ واجب ہونے کے لیے بھی ضروری ہیں اور روزے کی صحت کے لیے بھی ان کا پایا جانا ضروری ہے۔

حنبلیوں کے نزدیک حیض و نفاس کے خون کا ختم ہونا روزہ درست ہونے کی شرط ہے لہٰذا حیض و نفاس کی حالت میں روزہ درست نہیں ہوگا۔ اگرچہ حیض اور نفاس کی حالت میں عورت پر روزہ فرض ہے۔[۱]

کیا اس خیال سے کہ حیض شروع ہونے والا ہے عورت روزہ نہ رکھنے کی نیت کرسکتی ہے؟

رمضان میں اگر کوئی ایسا شخص جس پر روزہ فرض ہو روزہ نہ رکھنے کے لیے کسی ایسے عذر کا سہارا لے جو فی الواقع موجود نہ ہو لیکن اس کے وقوع کا امکان ہو اور یہ بھی ممکن ہو کہ وہ واقع نہ ہو تو ایسی صورت میں مالکیوں کے نزدیک اس شخص پر کفارہ واجب ہوگا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی عورت کو ایک مقررہ تاریخ پر حیض شروع ہونے کی عادت ہو اور وہ اس خیال سے کہ کل حیض شروع ہونے والا ہے اگر رات ہی کو یہ نیت کرلے کہ میں کل روزہ نہیں رکھوں گی۔ اور روزہ دن کو نہ رکھے تو اس پر کفارہ واجب ہوگا خواہ اس دن اسے حیض شروع ہی کیوں نہ ہوجائے اس لیے کہ اس نے حیض شروع ہونے سے پہلے ہی یعنی سبب کے موجود ہونے سے پہلے روزہ نہ رکھنے کی نیت کرلی تھی۔

حائضہ عورت کا خون اگر دن کے وقت بند ہو تو کیا اسے دن بھر روزے دار کی طرح کھانے پینے سے رکے رہنا چاہیے؟

رمضان میں روزے رکھتے ہوئے اگر کسی روزہ دار کا روزہ فاسد ہوجائے مثلاً کسی عورت کو حیض شروع ہوجائے تو اس پر واجب ہے کہ احترامِ رمضان کی بنا پر وہ باقی پورا دن روزے دار کی طرح کھانے پینے سے رکی رہے لیکن اگر رمضان کے علاوہ کسی اور دن روزہ رکھا تھا مثلاً نذر کا روزہ، خواہ یہ نذر بطور خاص اسی دن روزہ رکھنے کی تھی یا عام روزہ رکھنے کی، یا کفارے کا روزہ یا رمضان کے روزے کی قضا کا روزہ یا نفلی روزہ وغیرہ تو ان تمام صورتوں میں

---

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ص ۲۹۶-۲۹۹، مطبع شعب۔

اگر روزہ فاسد ہوگیا تو باقی سارا دن کھانے پینے سے رکنا ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کسی کو ایسا عذر لاحق ہوگیا، جس کی بنا پر اس کے لیے رمضان میں روزہ نہ رکھنا جائز اور مباح ہوگیا اور پھر دن کے وقت وہ عذر دور ہوگیا مثلاً حائضہ کا حیض رمضان میں دن کے وقت بند ہوگیا یا کوئی مسافر تھا اور رمضان میں دن کے وقت سفر ختم کر کے مقیم ہوگیا تو اس پر احترام رمضان میں اسی دن کا باقی ماندہ حصہ روزے دار کی مانند بغیر کھائے پیئے گزارنا ضروری ہے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک ایسی صورت میں کھانے پینے سے رکا رہنا سنت ہے واجب نہیں۔

☆ مالکیوں کے نزدیک ایسی صورت میں کھانے پینے سے رکنا نہ واجب ہے نہ مستحب۔ لیکن اگر عذر اکراہ تھا یعنی کسی نے مجبور کر دیا تھا کہ روزہ نہ رکھے اور پھر یہ عذر دور ہوگیا تو ایسے شخص کے لیے کھانے پینے سے رکا رہنا واجب ہے یعنی مالکیوں کے نزدیک اگر حائضہ کا خون رمضان میں دن کے وقت بند ہوگیا تو اس پر کھانے پینے سے رکنا واجب نہیں ہے بلکہ وہ دن کے باقی ماندی حصہ میں کھا پی سکتی ہے۔

حیض اور نفاس والی عورت پر روزوں کی قضا فرض ہے

امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے کہ معاذہؒ بیان کرتی ہیں کہ میں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے پوچھا: کیا سبب ہے کہ حائضہ پر روزہ کی قضا واجب ہے اور نماز کی قضا واجب نہیں؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کیا تم خارجی ہو؟ معاذہؒ کہتی ہیں کہ میں نے کہا: میں خارجی تو نہیں ہوں، البتہ میں یہ بات پوچھ رہی ہوں۔ ام المومنین نے فرمایا: وجہ کیا ہوگا، نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں جب ہمیں حیض کا خون آتا تھا تو ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔“

چناں چہ یہ فیصلہ متفق علیہ ہے اور تمام فقہی مسالک کے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حیض اور نفاس والی عورت پر حیض و نفاس کے دنوں میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا فرض نہیں

ہے۔ اور اس پر بھی سب کا اجماع ہے کہ حیض و نفاس والی عورت پر نماز کی قضا واجب نہیں ہے اور روزوں کی قضا واجب ہے۔ غالبًا اس کی حکمت یہ ہے کہ نمازیں ایک دن میں پانچ بار فرض ہیں جو حیض و نفاس کے دنوں کی جمع ہو کر تعداد میں بہت زیادہ ہو جاتی ہیں اور ان کی قضا پڑھنے میں مشقت ہے جب کہ روزے سال میں صرف ایک ماہ کے فرض ہیں اور حیض یا نفاس کی وجہ سے قضا روزوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ کیوں کہ حیض بسا اوقات ایک یا دو دن آتا ہے۔ لہٰذا ان کی قضا مشکل نہیں۔

اگر حیض یا نفاس والی عورت طلوعِ فجر سے پہلے پاک ہو جائے تو اس پر اس دن روزہ رکھنا واجب ہے

پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ مالکیوں کے نزدیک اگر حیض اور نفاس والی عورت طلوع فجر سے ایک لمحہ پہلے پاک ہو جائے تو اس پر اسی وقت روزے کی نیت کرنا واجب ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ”حیض یا نفاس والی عورت کا خون اگر رات میں کسی وقت بند ہو جائے اور غسل کرنے سے پہلے فجر طلوع ہو جائے اور وہ روزہ رکھ لے تو اس کا روزہ صحیح ہوگا اور اس پر دن کا روزہ پورا کرنا واجب ہے خواہ طلوعِ فجر سے پہلے غسل اس نے قصداً نہ کیا ہو یا غسل کرنا بھول گئی ہو یا کسی عذر کی بنا پر غسل نہ کر سکی ہو گویا اس حالت میں وہ جنبی کی مانند ہے یعنی جنبی عورت حالتِ جنابت میں غسل کیے بغیر روزہ رکھ سکتا ہے اور اس کا روزہ صحیح ہوگا۔[۱]

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ”ہمارا یعنی شافعیوں کا مسلک بھی یہی ہے اور باقی سب علماء کا مسلک بھی یہی ہے اور بعض صحابہ و تابعین سے جو اس کے خلاف مروی ہے اس کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم کہ آیا یہ روایت ان کے بارے میں صحیح ہے یا نہیں۔[۲]

---

(۱) نوویؒ شرح مسلم

(۲) نووی شرح مسلم

خاوند والی عورت کے لیے نفلی روزے کا حکم

بخاری، مسلم اور دیگر محدثین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا يحل لامرأة ان تصوم و زوجها شاهد الا باذنه ولا تأذن في بيته الا باذنه

''کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ جن دنوں اس کا خاوند اس کے پاس ہو اس کی اجازت کے بغیر روزے رکھے اور کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں کسی کو آنے کی اجازت دے۔''

یہ روایت امام احمد بن حنبلؒ نے بھی نقل کی ہے اور اس میں یہ الفاظ مزید ہیں (الا في رمضان) ''سوائے رمضان کے'' اور ابوداؤد کی بعض روایات میں (غير رمضان) کے الفاظ ہیں۔ یعنی رمضان کے سوا دوسرے دنوں میں خاوند کی اجازت کے بغیر نفلی روزے نہ رکھے۔

ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تصم المرأة و زوجها شاهد يوما غير شهر رمضان الا باذنه

''کوئی عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے سوائے رمضان کے۔''

ان احادیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان ایام میں جب خاوند عورت کے پاس موجود ہو عورت کو اس کی اجازت کے بغیر روزہ رکھنے سے منع فرما دیا ہے۔

اور علماء نے اس ممانعت کو حرمت پر محمول کیا ہے یعنی روزہ رکھنا ایسی صورت میں حرام ہے اور خاوند کو اختیار دیا ہے کہ اگر عورت اس کی اجازت کے بغیر روزہ رکھ لے تو وہ اس روزے کو تڑوا سکتا ہے۔ اس لیے کہ عورت نے اس کے حق پر دست درازی کی ہے لیکن یہ رمضان کے علاوہ نفلی روزوں کے بارے میں ہے جیسا کہ خود حدیث میں مذکور ہے کہ رمضان

کے روزہ کے سلسلے میں خاوند کی اجازت ضروری نہیں ہے۔

خاوند کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ ناجائز ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ خاوند عورت کے پاس موجود ہو یعنی گھر سے باہر سفر وغیرہ پر نہ ہو۔ لیکن اگر خاوند غیر حاضر ہو یعنی کہیں باہر گیا ہوا ہو تو پھر عورت کو نفلی روزے رکھنے کے لیے اس کی اجازت حاصل کرنا ضروری نہیں۔ ایسی صورت میں اس کی اجازت کے بغیر بھی وہ روزے رکھ سکتی ہے۔ لیکن اگر اس اثنا میں خاوند واپس گھر آ جائے تو اسے یہ حق ہے کہ عورت کا نفلی روزہ تڑوا دے۔

علماء نے خاوند کی بیماری اور جماع پر قادر نہ ہونے کو بھی خاوند کی اجازت کے بغیر روزہ رکھنے کے سلسلے میں خاوند کی غیر حاضری کے مانند قرار دیا ہے یعنی ان صورتوں میں بھی عورت خاوند کی اجازت کے بغیر نفلی روزے رکھ سکتی ہے۔[1]

الفقه علی المذاهب الاربعه میں ہے کہ عورت کا شوہر کی اجازت کے بغیر یا یہ جانے بغیر کہ خاوند میرے روزہ رکھنے کو پسند کرتا ہے یا نہیں، نفلی روزہ رکھنا بھی حرام روزوں کی اقسام میں شامل ہے۔ البتہ اگر خاوند کو عورت کی حاجت نہ ہو مثلاً یہ کہ وہ گھر سے غیر حاضر ہو یا احرام کی حالت میں ہو یا اعتکاف میں ہو تو پھر بغیر اجازت نفلی روزہ رکھنا عورت کے لیے حرام نہیں ہے۔

☆ احناف کے نزدیک عورت کا خاوند کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک جن دنوں خاوند گھر میں موجود ہو یعنی سفر پر گیا ہوا نہ ہو، عورت کے لیے اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھنا ناجائز ہے خواہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے خاوند جماع نہ کرسکتا ہو مثلاً حالتِ احرام میں ہو یا اعتکاف میں بیٹھا ہو یا بیمار ہو وغیرہ۔

☆☆

---

(۱) فقہ السنہ، ج ۱، ص ۴۴۸، ۴۴۹

رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت

حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت کے لیے روزہ نہ رکھنے کی رخصت

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (البقرة:۱۸۴)

''اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں ایک روزے کا، فدیہ ایک مسکین کا کھانا۔''

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل احادیث وارد ہیں:

۱- ابوداؤدؒ نے حضرت عکرمہؒ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کریمہ ''و علی الذین یطیقونہ الخ'' کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ رخصت بہت زیادہ بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے ہے کہ اگر وہ کھانا کھلانے کی طاقت رکھتے ہوں تو خود روزہ نہ رکھیں اور ہر ایک دن کے روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو اگر اپنے بچہ کے بارے میں یہ خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے انہیں نقصان پہنچے گا تو وہ بھی روزہ نہ رکھیں اور ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اسے بزارؒ نے بھی روایت کیا ہے اور آخر میں یہ زائد ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنی ایک لونڈی سے جو ان کے بچے کی ماں اور حاملہ تھی یہ کہا کرتے تھے کہ تم ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جو روزے کی طاقت نہیں رکھتے۔ لہٰذا تم پر فدیہ ہے اور روزے کی قضا نہیں ہے (دارقطنیؒ نے اس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے)۔

۲- امام مالکؒ اور بیہقیؒ نے نافع سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما

سے پوچھا گیا کہ اگر حاملہ عورت کو یہ خوف ہو کہ روزے رکھنے سے اس کے بچے کو نقصان پہنچے گا تو وہ کیا کرے؟ آپ نے فرمایا: روزہ نہ رکھے اور ہر روزے کے بدلے کسی مسکین کو ایک مد گندم دے دے۔

۳- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ان الله عزوجل وضع عن المسافر الصوم و شطر الصلوة و عن الحبلى و المرضع الصوم (ترمذی و حسنه)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مسافر پر سے روزہ اور نماز کا نصف حصہ ساقط کر دیا ہے اور حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت پر سے روزے ساقط کر دیے ہیں۔"

اور بعض دیگر روایات کے الفاظ یہ ہیں: (و عن الحامل و المرضع) "اور حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت ہے۔"

چناں چہ اس مسئلہ میں علماء کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے کہ حاملہ عورت کو اگر یہ خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے بچے کو نقصان پہنچے گا تو اس کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔

اسی طرح اگر دودھ پلانے والی عورت کو یہ خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے بچے کو نقصان پہنچے گا تو اسے بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ خوف سے مراد یہ نہیں ہے کہ محض اسے یہ گمان ہو کہ بچے کو نقصان پہنچے گا بلکہ نقصان پہنچنے کا ظن غالب ہونا ضروری ہے اور یہ ظن غالب یا تو علامات دیکھ کر ہوسکتا ہے یا تجربہ سے یا کسی ماہر طبیب کے بتانے سے۔

بعض علماء کا جن میں امام ابن حزمؒ بھی شامل ہیں، خیال یہ ہے کہ جب بچے کو نقصان پہنچنے کا خوف ہو تو روزہ نہ رکھنا واجب ہے کیوں کہ ایسی حالت میں حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی) سے روزہ ساقط ہو جاتا ہے۔

اس مسئلے کے سلسلے میں فقہ کے چاروں مسالک میں کوئی کچھ باتیں ہیں جنہیں تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے۔

☆ احناف کے نزدیک اگر حاملہ یا مرضعہ کو روزے سے نقصان کا خوف ہو تو اس

کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے، خواہ یہ خوف اپنی جان اور بچے دونوں کو نقصان پہنچنے کا ہو یا صرف اپنے آپ کو یا صرف بچے کو، ہر حالت میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور جب اسے روزہ رکھنے کی قدرت ہو تو اس پر ان روزوں کی قضا واجب ہے اور فدیہ دینا ضروری نہیں ہے اور نہ روزوں کی قضا میں یہ ضروری ہے کہ لگاتار روزے رکھے اور اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مرضعہ جس بچہ کو دودھ پلا رہی ہے وہ اس کا اپنا بچہ ہے یا اجرت پر دودھ پلا رہی ہے اور اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسے دودھ پلانے کے لیے مقرر کیا گیا ہے یا از خود پلا رہی ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ بچے کی ماں ہے تب تو اس کے لیے دودھ پلانا شرعی طور پر واجب ہے اور اگر اجرت پر دودھ پلا رہی ہے تو معاہدہ کی بنا پر دودھ پلانا واجب ہے اور وہ کسی طرح اس سے گریز اختیار نہیں کر سکتی۔

☆ مالکیوں کے نزدیک بھی حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے اگر اسے بیمار ہو جانے پر مرض میں اضافہ کا ڈر ہو اور یہ ڈر خواہ اپنے اور بچے دونوں کے بیمار ہونے کا ہو یا صرف اپنے بیمار ہونے کا ہو یا صرف بچے کو نقصان پہنچنے کا ہو اور خواہ دودھ پلانے والی ماں ہو یا اجرت پر پلا رہی ہو۔

البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ حاملہ پر فدیہ نہیں ہے محض قضا ہے اور دودھ پلانے والی پر قضا بھی ہے اور فدیہ بھی۔

اور اگر حاملہ یا مرضعہ کو روزے سے خود کو یا بچے کو سخت نقصان پہنچنے یا اپنے یا بچے کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو ان پر روزہ نہ رکھنا واجب ہے۔

دودھ پلانے والی کے لیے روزہ نہ رکھنا اس صورت میں جائز ہے جب اسے دودھ پلانے کے لیے مقرر کیا گیا ہو اور اس کے سوا کوئی دوسری دودھ پلانے والی میسر نہ ہو۔ یا دوسری دودھ پلانے والی میسر تو ہو لیکن اس کو بچے نے قبول نہ کیا ہو چناں چہ اگر دوسری دودھ پلانے والی میسر آ جائے اور بچہ اس کے دودھ کو قبول بھی کر لے تو پھر اس پر روزہ رکھنا واجب ہے اور کسی حالت میں روزہ چھوڑنا جائز نہیں۔

اور اگر نئی دودھ پلانے والی کو جسے بچہ نے قبول کر لیا ہے اجرت دینا ضروری ہو تو اگر

بچے کے پاس مال ہے تو اس کے مال میں سے اجرت دی جائے اور اگر بچے کے پاس مال نہ ہو تو بچے کا باپ اجرت ادا کرے کیوں کہ دودھ پلانے کی اجرت نان ونفقہ کا حصہ ہے اور نان و نفقہ باپ کے ذمہ ہے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے اگر روزے سے ناقابل برداشت نقصان پہنچنے کا خوف ہو۔ یہ نقصان خواہ ماں اور بچے دونوں کو پہنچ سکتا ہو یا صرف حاملہ اور مرضعہ کی ذات کو یا صرف بچے کو۔ اور تینوں صورتوں میں حاملہ اور مرضعہ پر روزے کی قضا واجب ہے لیکن آخری صورت میں یعنی جب صرف بچے کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو روزے کی قضا کے علاوہ حاملہ اور مرضعہ پر فدیہ ادا کرنا بھی ضروری ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دودھ پلانے والی بچہ کی ماں ہے یا اجرت پر دودھ پلا رہی ہے۔

مندرجہ بالا تمام صورتوں میں دودھ پلانے والی عورت پر روزہ نہ رکھنا اس صورت میں واجب ہے جب اسے دودھ پلانے کے لیے مقرر کیا گیا ہو یعنی اس کے سوا کوئی ایسی عورت دستیاب نہ ہو جو روزہ کے باوجود دودھ پلا سکتی ہو اور اسے روزے سے نقصان نہ پہنچتا ہو۔ لیکن اگر اسے دودھ پلانے کے لیے مقرر نہ کیا گیا ہو تو پھر اسے اختیار ہے چاہے تو دودھ پلائے اور روزہ نہ رکھے اور چاہے تو روزے رکھے اور دودھ نہ پلائے۔ یعنی اس صورت میں اس پر دودھ پلانا اور روزے نہ رکھنا واجب نہیں ہے۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک حاملہ اور مرضعہ کو روزے سے اپنی ذات کو اور بچے کو یا صرف اپنی ذات کو نقصان پہنچنے کا خوف ہو تو ان کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور ان دونوں صورتوں میں ان پر روزے کی قضا واجب ہے، فدیہ نہیں ہے۔

لیکن اگر صرف بچے کو نقصان پہنچنے کا خوف ہو تو پھر ان پر فدیہ ہے اور قضا بھی۔ اور مرضعہ کے سلسلے میں یہ بھی ہے کہ اگر بچہ دوسری عورت کا دودھ قبول کرلے اور ماں اس کو دودھ پلانے کی اجرت ادا کرنے پر قادر ہو یا بچے کے پاس مال ہو جس میں سے دودھ پلانے کی اجرت ادا کی جا سکتی ہو تو پھر اسے چاہیے کہ دوسری دودھ پلانے والی اجرت پر مقرر کرلے اور روزے نہ چھوڑے۔

جس عورت کو اجرت پر دودھ پلانے کے لیے مقرر کیا گیا ہو وہ اس سلسلے میں ماں کی مانند ہے یعنی جو حکم ماں کا ہے وہی اجرت پر پلانے والی کا ہے۔

آنکھوں میں سرمہ لگانے یا پانی اور دوا کا قطرہ ڈالنے کا حکم

روزہ دار کے سرمہ لگانے یا آنکھ میں پانی یا دوا ڈالنے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:

۱- عبد الرحمٰن بن نعمان بن معبد بن ھوذہ اپنے باپ نعمان سے اور نعمان معبد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سوتے وقت مشک ملا سرمہ لگانے کا حکم دیا اور فرمایا: ''روزہ دار اس سے بچے''، یہ روایت ابوداؤد میں ہے اور امام بخاریؒ نے بھی اسے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے۔ بعض محدثین کا قول ہے کہ اس کی سند میں کلام ہے۔ ابن معینؒ نے لکھا ہے کہ راویِ حدیث عبد الرحمٰن ضعیف ہے اور ابو حاتم الرازیؒ کہتے ہیں کہ یہ راوی (عبد الرحمٰن) صدوق یعنی سچا ہے۔

۲- ابن ماجہؒ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان میں سرمہ لگایا جب کہ آپ روزے سے تھے۔

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں نبی کریم ﷺ سے جتنی روایتیں ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔

پہلی حدیث کو ابن شبرمہؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ نے اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ سرمہ سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سرمہ لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

☆ حنفی مسلک:

علامہ کاشانی نے ''بدائع الصنائع'' میں لکھا ہے کہ روزہ دار اگر سرمہ لگالے تو اکثر علماء کے نزدیک اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا خواہ وہ سرمہ کا ذائقہ اپنے حلق میں محسوس کرے لیکن ابن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ اس صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیوں کہ جب اسے سرمہ کا ذائقہ حلق میں محسوس ہوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سرمہ اس کے پیٹ تک پہنچ گیا۔ اور ہماری دلیل حضرت

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ حضرت عبد اللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رمضان میں نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اس حالت میں کہ آپ کی دونوں آنکھوں میں خوب سرمہ لگا ہوا تھا جو ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے لگایا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرمہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیوں کہ جو سرمہ کا ذائقہ محسوس ہونے لگتا ہے وہ محض اس کا اثر ہوتا ہے سرمہ خود حلق میں نہیں پہنچتا لہٰذا اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا جیسے غبار اور دھوئیں کا ذائقہ اگر حلق میں محسوس ہو تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔(۱)

☆ مالکی مسلک:

مالکیوں کے نزدیک اگر روزہ دار نے دن کے وقت سرمہ لگایا اور اس کا ذائقہ حلق میں محسوس ہوا تو روز ٹوٹ گیا اور اس پر قضا واجب ہوگی۔ لیکن اگر سرمہ رات کے وقت لگایا اور اس کا ذائقہ دن میں محسوس کیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر روزے دار کو اچھی طرح معلوم ہو کہ سرمہ لگانے سے سرمہ حلق تک پہنچ جائے گا تو اس کے لیے سرمہ لگانا حرام ہے اور اگر لگائے گا تو اس پر روزے کی قضا واجب ہوگی اور اگر اس سرمے کے حلق تک پہنچنے میں شک ہو تو اس کے لیے سرمہ لگانا مکروہ ہے۔

امام مالکؒ کے مسلک کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی چیز آنکھ، کان، ناک، یا بالوں کے مساموں کے ذریعے سے حلق تک پہنچ جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ البتہ اگر سرمہ یا تیل وغیرہ رات کو استعمال کیا جائے اور وہ حلق تک دن کے وقت پہنچے تو کوئی حرج نہیں یعنی روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

☆ شافعی مسلک:

شیخ شہاب الدینؒ قلیوبی نے لکھا ہے کہ سرمہ لگانے سے روزے کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا یعنی مکروہ بھی نہیں ہے خواہ دن میں لگایا جائے اور خواہ اس کا ذائقہ حلق میں محسوس ہو۔ حتی

---

(۱) بدائع الصنائع، ج ۲، ص ۹۳

کہ اگر اس کا رنگ تھوک یا ناک کے فضلے میں محسوس ہو تب بھی روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن ایسی صورت میں سرمے کا استعمال خلاف اولیٰ ہے یعنی بہتر یہ ہے کہ اگر سرمے کے رنگ کا تھوک یا ناک کے فضلے تک پہنچنا یقینی ہو تو روزہ دار دن میں سرمہ نہ لگائے۔

☆ حنبلی مسلک:

حنبلیوں کے نزدیک اگر سرمے کا ذائقہ روزہ دار کے حلق تک پہنچ جائے تو اس پر قضا واجب ہے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کے بارے میں تین مختلف آراء ہیں:

۱- امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک روزہ دار کے لیے سرمہ لگانا مکروہ نہیں ہے۔

۲- امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اگر روزہ دار سرمے کا ذائقہ حلق میں محسوس کرے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

۳- ابن ابی لیلیٰؒ اور ابن شبرمہؒ کے نزدیک سرمہ لگانے سے روزہ بہر حال ٹوٹ جائے گا خواہ ذائقہ حلق میں محسوس ہو یا نہ ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ پہلی رائے میں سہولت ہے، دوسری میں شدت ہے، تیسری میں بہت زیادہ شدت ہے۔

پانی یا دوا کا قطرہ بھی سرمے کے حکم میں ہے

مجھے ایک ماہر ڈاکٹر نے بتایا کہ آنکھ سے پیٹ تک پہنچنے کا راستہ ہے لہٰذا اگر روزہ دار دن کے وقت آنکھ میں کسی چیز کا قطرہ ڈالے گا تو اس پر روزے کی قضا لازم ہو گی۔

لیکن ایک دوسرے ڈاکٹر نے کہا کہ قطرہ جو آنکھ میں ڈالا جاتا ہے اس میں سے بہت ہی کم مقدار تقریباً ایک یا دو قسطوں کے برابر چیز آگے جاتی ہے، کچھ حصہ بخار بن کر اڑ جاتا ہے اور کچھ ناک میں چلا جاتا ہے اور حلق تک اس میں سے کچھ بھی نہیں پہنچتا یا اگر کبھی

کچھ پہنچتا بھی ہے تو اس کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنا کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے کا ہوتا ہے۔

روزے میں کھانے کا ذائقہ چکھنا

رمضان کے دنوں میں روزہ دار عورت کو جن مسائل سے دو چار ہونا پڑتا ہے ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسے اپنے خاوند اور اہل خانہ کے لیے کھانا تیار کرنا ہوتا ہے لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا عورت کھانے کا نمک وغیرہ چکھ سکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کے سلسلے میں مختلف مسالکِ فقہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

☆ حنفیوں کے نزدیک روزہ دار کے لیے خواہ فرض روزہ ہو یا نفلی کوئی ایسی چیز چکھنا جس سے کچھ حل ہوکر پیٹ تک نہ پہنچے مکروہ ہے، البتہ اگر ضرورت کی مجبوری ہو تو جائز ہے مثلاً عورت کا خاوند اگر تندمزاج ہو تو اس کے لیے کھانے کا نمک چکھنا جائز ہے۔

☆ مالکیوں کے نزدیک روزہ دار کے لیے کھانا چکھنا بہرحال مکروہ ہے خواہ وہ خود ہی کھانا تیار کر رہا ہو اور اگر چکھ لیا تو اس پر لازم ہے کہ اسے فوراً تھوک دے تاکہ اس کا کوئی ذرہ حلق تک نہ پہنچ پائے اور اگر بچنے کی کوشش کے باوجود حلق تک کچھ پہنچ گیا تو اس پر روزے کی قضا واجب ہوگی اور اگر رمضان کے روزے میں اسے قصداً حلق تک پہنچائے گا تو پھر اس پر قضا کے علاوہ کفارہ بھی واجب ہوگا۔

☆ شافعیوں کے نزدیک روزہ دار کے لیے کھانا چکھنا مکروہ ہے الا یہ کہ مجبوری ہو مثلاً روزہ دار باورچی ہو تو پھر کھانا چکھنا مکروہ نہیں ہے۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک بغیر ضروت کے کھانا چکھنا مکروہ ہے لیکن مجبوری ہو تو پھر جائز ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ کھانا چکھنے سے اجتناب کیا جائے لیکن اگر چکھ لیا جائے تو روزے کو نقصان نہیں پہنچتا، اور ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں چکھنے میں کوئی حرج نہیں

مثلاً سرکہ یا کوئی اور چیز جو خریدنا چاہتا ہو اس کو چکھ سکتا ہے۔

☆ المغنی میں ہے کہ حسن بصریؒ اپنے پوتے کو روزے کی حالت میں اخروٹ چبا کر دیا کرتے تھے اور ابراہیم نخعیؒ کے نزدیک بھی ایسا کرنا جائز ہے۔

☆ ابن عقیلؒ نے لکھا ہے کہ کھانا چکھنا یا کوئی چیز چبانا اگر ضرورت کے ماتحت ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن بلا ضرورت مکروہ ہے۔ اگر کسی نے کھانا چکھا اور اس کا ذائقہ حلق میں محسوس کیا تو روزہ ٹوٹ گیا اور اگر ذائقہ حلق تک نہیں پہنچا تو روزہ نہیں ٹوٹا۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ تمام مسالک فقہ کے مطابق روزے کی حالت میں کھانا چکھنا مکروہ ہے الا یہ کہ مجبوری ہو تو جائز ہے بشرطیکہ کھانا پیٹ یا حلق تک نہ پہنچے۔

روزے کی حالت میں بوسہ لینا

اس بارے میں درج ذیل حدیثیں وارد ہوئی ہیں:

۱- ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ روزے کی حالت میں بوسہ لے لیا کرتے تھے۔ (متفق علیہ)

۲- ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ روزے کی حالت میں بوسہ بھی لے لیا کرتے تھے اور روزے کی حالت میں جسم سے جسم بھی ملا لیا کرتے تھے لیکن آپ کو اپنی خواہشات پر تم سب سے زیادہ ضبط واختیار حاصل تھا (اس روایت کو امام نسائی کے سوا صحاحِ ستہ کے باقی محدثین نے نقل کیا ہے)۔

۳- حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ روزہ دار بوسہ لے سکتا ہے؟ تو آپ نے ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ان سے پوچھو! چناں چہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ ایسا کیا کرتے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیے ہیں۔ میری اس بات کے جواب میں آپ نے

فرمایا: کیا یہ درست نہیں کہ میں تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار اور تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں؟ (یہ روایت صحیح مسلمؒ میں ہے)۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ بعض ایسے امور کے سوا جو آپ کی خصوصیات ہیں اور جن کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے آپ کے باقی تمام اعمال و افعال امت کے لیے حجت اور دلیل ہیں۔

۴- ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرا بوسہ لینے کے لیے جھکے تو میں نے کہا: میں روزے سے ہوں، اس پر آپ نے فرمایا: میرا بھی روزہ ہے اور یہ فرمانے کے بعد آپ نے میرا بوسہ لیا۔ اور حضرت عائشہؓ اس وقت جوان تھیں۔

(مسند احمد بن حنبلؒ)

۵- عبد الرزاقؒ نے اپنی المصنف میں سند صحیح سے روایت کیا ہے کہ انصار میں سے ایک شخص نے اس حالت میں کہ وہ روزے سے تھا، اپنی بیوی کا بوسہ لے لیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ جا کر نبی کریم ﷺ سے اس کے بارے میں مسئلہ پوچھے۔ چناں چہ اس عورت نے جب اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

انی افعل ذلک (میں بھی ایسا کرتا ہوں)

یہ جواب سن کر اس عورت کے شوہر نے کہا: نبی کریم ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ نے بعض باتوں کی اجازت عطا فرما رکھی ہے۔ چناں چہ وہ عورت پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ نے ارشاد فرمایا:

انا اعلمکم بحدود اللہ و اتقاکم

”میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں اور تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں۔“

۶- حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا روزے کی حالت میں جسم سے جسم ملانا جائز ہے؟ تو آپ نے اجازت دے دی۔

ایک دوسرے شخص نے آپ سے یہی سوال کیا تو آپ نے اسے منع فرما دیا۔ چناں چہ جس شخص کو آپ نے اجازت دی تھی وہ بوڑھا تھا اور جسے منع فرمایا تھا وہ جوان تھا۔ (ابوداؤد)

۷۔ حکیم بن عقالؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا: روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے کیا کچھ حرام ہے؟ آپ نے جواب دیا: صرف اس کی شرم گاہ۔ (بخاری)

۸۔ مسروق نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا: روزہ دار کے لیے اپنی بیوی سے کیا کچھ حلال ہے؟ آپ نے جواب دیا: جماع کے سوا سب کچھ جائز ہے۔

مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ روزے دار کے لیے اپنی بیوی کا بوسہ لینا، معانقہ کرنا، جسم کے ساتھ جسم ملانا اور خوش فعلیاں کرنا سب جائز ہے بشرطیکہ ان کے نتیجے میں انزال نہ ہو اور اگر انزال ہوگیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ ایک دوسری حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بوسے کو کلی کرنے سے تشبیہ دی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح کلی کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا الا یہ کہ پانی پیٹ میں چلا جائے اسی طرح بوسہ سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا جب تک انزال نہ ہو۔ چناں چہ سنن ابی داؤد میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لے لیا۔ پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا: میں نے آج بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے، میں روزے سے تھا کہ میں نے اپنی بیوی کا بوسہ لے لیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> أرأيت لو تمضمضت بماء و انت صائم؟
>
> ”تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تم روزے کی حالت میں پانی سے کلی کرلو تو کیا روزہ ٹوٹ جائے گا؟“

میں نے عرض کیا اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ آپ نے فرمایا (ففيم؟) پھر بوسے میں کیا حرج ہے؟“

اس مسئلہ میں فقہی آراء

المازریؒ نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں بوسہ لینے والے کے حال کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اگر وہ ایسا شخص ہے کہ بوسے کی وجہ سے اس کی شہوت میں اس قدر تحریک پیدا ہوجاتی ہے کہ انزال ہوجائے تب تو اس کے لیے روزے میں بوسہ لینا حرام ہے کیوں کہ روزے میں انزال منع ہے، لہٰذا جو چیز انزال تک پہنچائے وہ بھی منع ہے اور اگر وہ شخص اتنے صبر و ضبط کا مالک ہے کہ اس پر بوسے کا اثر نہیں ہوتا تو پھر منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ کہا جائے کہ چوں کہ بوسہ انزال کا سبب اور ذریعہ بن سکتا ہے اور انزال روزے میں منع ہے اور جو چیز منع ہو اس کے ذریعے کے اختیار کرنے کا بھی وہی حکم ہے، جو خود اس چیز کا۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ جس شخص کی شہوت میں بوسے کی وجہ سے تحریک نہ پیدا ہوتی ہو اس کے لیے روزے کی حالت میں بوسہ لینا حرام نہیں ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ اس سے پرہیز کیا جائے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ روزے کی حالت میں بوسہ لینا مکروہ ہے۔ علماء نے یہ ضرور کہا ہے کہ ایسا کرنا خلاف اولیٰ ہے۔ حالاں کہ یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ روزے میں بوسہ لیا کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے سلسلے میں یہ اطمینان تھا کہ آپ بوسے کی حد سے تجاوز نہیں فرمائیں گے۔ لیکن دوسرے لوگوں کے بارے میں یہ خطرہ ہوسکتا ہے کہ وہ حد سے آگے بڑھ جائیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ روزے میں اس سے بچا جائے۔

امام نوویؒ نے جو یہ کہا ہے کہ اس کا نہ کرنا بہتر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں ایسے فعل میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے جو حرام ہے۔ بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے:

من حام حول الحمٰی اوشك ان يقع فيه

''جو شخص باڑھ کے گرد منڈلائے گا بہت ممکن ہے کہ وہ اس کے اندر جا پڑے۔''

لہٰذا صحیح یہی ہے کہ جس کی شہوت میں بوسہ لینے سے تحریک پیدا ہوتی ہو اس کے

لیے روزے کی حالت میں بوسہ لینا حرام ہے۔

علامہ قسطلانیؒ نے لکھا ہے کہ امام بیہقیؒ نے سند صحیح سے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بوڑھے شخص کو روزے کی حالت میں بوسے کی اجازت دے دی تھی اور جوان کو منع فرمایا دیا تھا اور فرمایا: ''بوڑھا اپنی شہوت پر قابو پاسکتا ہے، جب کہ جوان کے سلسلے میں روزہ ٹوٹنے کا امکان زیادہ ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے بوڑھے کے لیے اجازت دی اور جوان کو اس سے منع فرمایا تو اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ روزے کی حالت میں بوسے کا جواز وعدم جواز شہوت کی تحریک سے وابستہ ہے اور بوڑھے اور جوان سے دراصل مراد یہی ہے کہ بوڑھوں کی شہوت بالعموم کمزور ہوتی ہے اور جوانوں پر اکثر و بیشتر شہوت کا ہیجان و غلبہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر صورتِ حال اس سے مختلف ہو تو حکم بھی بدل جائے گا یعنی اگر کسی بوڑھے پر شہوت کا غلبہ ہو اور اس کی شہوت میں ہیجان پیدا ہو تو اس کے لیے بوسہ ممنوع ہے۔ اس کے برعکس کسی جوان کے سلسلے میں اگر یہ اطمینان ہو کہ بوسے سے اس کی شہوت میں تحریک پیدا نہیں ہوگی تو اس کے لیے روزے کی حالت میں بوسہ لینا جائز ہے۔

ابن قدامہؒ نے جو حنبلی المسلک ہیں اپنی کتاب ''المغنی'' میں لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے روزے کی حالت میں بوسہ لیا اور اسے انزال ہوگیا تو اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔ اس مسئلہ پر سب کا اتفاق ہے۔

اور ابن شبرمہؒ نے جو یہ کہا ہے کہ بوسے سے ہر حال میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے، انزال ہو یا نہ ہو، یہ بات قابل اعتناء نہیں ہے۔ جس طرح ابن حزمؒ کا یہ قول قابل اعتناء نہیں ہے کہ بوسے سے اگر انزال بھی ہوجائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

اس بارے میں مختلف فقہی احکام

مسالک اربعہ:

☆ حنفیوں کے نزدیک روزہ دار کے لیے اپنی بیوی کا بوسہ لینا مکروہ ہے خواہ بوسہ

ہلکا ہو یا شدید اور ہیجان آفریں۔ مثلاً یہ کہ بوسے کے ساتھ ہونٹ بھی چوسے جائیں۔ اسی طرح جسم کو جسم سے ملانا بھی مکروہ ہے اگر اپنی شرم گاہ عورت کی شرم گاہ پر اس طرح رکھ دے کہ درمیان میں کوئی کپڑا وغیرہ بھی حائل نہ ہو لیکن یہ کراہت اس صورت میں ہے جب روزہ دار کو بوسے یا مباشرت کے نتیجہ میں انزال ہو جانے یا جماع کر بیٹھنے کا اندیشہ ہو۔

☆ مالکیوں کے نزدیک روزہ دار کے لیے تمام وہ باتیں مکروہ ہیں جو جماع کی طرف لے جانے والی ہوں مثلاً بوس و کنار اور شہوت انگیز مناظر دیکھنا یا ایسی باتیں سوچنا جن سے شہوت کو تحریک ملے خواہ روزہ دار کو یہ اطمینان ہو کہ ان باتوں کے ارتکاب سے نہ انزال ہو گا نہ مذی خارج ہو گی۔

مالکیوں کا مشہور مذہب یہ ہے کہ یہ کراہت، کراہت تنزیہی ہے، تحریمی نہیں ہے اور کراہت تنزیہی اباحت کے منافی نہیں ہے جیسا کہ یہ بات کتب فقہ میں واضح طور پر مذکور ہے۔ لیکن اگر روزہ دار کو انزال وغیرہ سے محفوظ رہنے کے بارے میں شک ہو یا اسے معلوم ہو کہ انزال سے محفوظ نہیں رہ سکے گا تو اس کے لیے بوسہ وغیرہ حرام ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اگر ان حرکات کا ارتکاب کر بیٹھا اور نہ انزال ہوا نہ مذی خارج ہوئی تو اس کا روزہ صحیح ہوگا۔ اور اگر مذی خارج ہوئی تو اس پر روزے کی قضا واجب ہوگی البتہ کسی شہوت آفریں منظر کو محض بلا ارادہ دیکھنے یا کسی ایسی ہی بات کو بلا تسلسل سوچنے کے نتیجے میں اگر مذی خارج ہوگئی تو اس پر قضا نہیں ہے لیکن اگر بوسے یا اسی قسم کی دیگر حرکات کے نتیجے میں انزال ہوگیا اور منی خارج ہوئی اور روزہ ماہ رمضان کا تھا تو اس پر قضا بھی ہے اور کفارہ بھی۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ روزہ دار کو یہ معلوم تھا کہ بوس و کنار کے نتیجے میں وہ انزال سے محفوظ نہیں رہ سکے گا یا اسے انزال سے محفوظ رہنے کے بارے میں شک تھا اور اس بنا پر ایسی حرکات جو مقدمات جماع بن سکتی ہیں اس کے لیے حرام تھیں تاہم اس کے باوجود اگر اس نے ان حرکات کا یعنی بوس و کنار وغیرہ کا ارتکاب کیا تو اس پر قضا بھی ہے اور کفارہ بھی۔ لیکن اگر اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ بوس و کنار کے باوجود انزال و جماع سے محفوظ رہے گا اور اس بنا پر اس کے لیے ان حرکتوں کا ارتکاب صرف مکروہ تھا پھر اس نے بوس و کنار کیا اور اسے انزال

ہوگیا تو اس پر صرف قضا ہے، کفارہ نہیں۔ البتہ اس صورت میں بھی وہ اگر ان افعال کے ارتکاب میں حد سے بڑھ گیا اور نتیجتاً اسے انزال ہوگیا تو پھر اس پر قضا بھی ہے اور کفارہ بھی۔

☆ شافعیوں کے نزدیک روزہ دار کے لیے بوس و کنار اور لپٹنا وغیرہ مکروہ ہے بشرطیکہ اس کی شہوت میں تحریک و ہیجان پیدا ہوتا ہو ورنہ مکروہ نہیں۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ روزے میں ان باتوں سے احتراز کرے۔

اور اگر بوسے لینے، لپٹنے یا چھونے سے انزال ہوجائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور صرف قضاء واجب ہوتی ہے، کفارہ نہیں۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک روزہ دار کے لیے بوسہ اور دوسرے محرکات جماع مثلاً معانقہ کرنا، چھونا اور شہوت آفریں مناظر کو بار بار دیکھنا مکروہ ہے اگر ان افعال کے نتیجہ میں شہوت میں ہیجان پیدا ہوتا ہو، ورنہ مکروہ نہیں۔ اور اگر اسے یہ گمان ہو کہ بوسے اور ایسی دیگر حرکات کے نتیجہ میں اسے انزال ہوجائے گا تو یہ حرکات اس کے لیے حرام ہیں۔

ہم یہاں دو باتوں کی وضاحت کریں گے:

۱- ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے جو روزہ کی حالت میں اپنی ازواجِ مطہرات کا بوسہ لیا یہ بوسہ یا معانقہ شہوت کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد قانون شریعت بیان کرنا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ ایسا کرنے کی اجازت ہے اور یہ چیزیں فطرت انسانی کو پسند ہیں اور اکثر و بیشتر ان میں مبتلا ہونے کا امکان ہے۔ اس لیے ان میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر آپ نے ایسا کیا تھا کیوں کہ آپ مومنوں پر نہایت مہربان اور شفقت فرمانے والے ہیں اور آپ نے اس بات کی وضاحت بھی فرما دی کہ یہ رخصت و اجازت سب کے لیے ہے۔ چناں چہ جب عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے اس عمل کی یہ تاویل کی تھی کہ ایسا کرنا آپ کی ذات کے ساتھ خاص ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیے ہیں تو آپ نے اس پر ارشاد فرمایا تھا: واللہ انی لاتقاکم و اخشاکم" (خدا کی قسم! میں تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں) تو آپ کے اس ارشاد کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگوں کو واضح طور پر معلوم ہوجائے کہ یہ رخصت صرف آپ کی ذات کے

ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ سب مسلمانوں کے لیے عام ہے اور ان افعال کا ارتکاب تقویٰ اور خشیت اللہ کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ روزے دار کو اپنی ذات پر قابو ہو اور اپنی شہوت پر ضبط و اختیار حاصل ہو۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ اس حکم میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں جیسا کہ حدیث نمبر۴ میں گزر چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہؓ کا بوسہ لینے کی غرض سے جھکے تو حضرت عائشہؓ نے کہا: میں روزے سے ہوں تو آپ نے فرمایا: میرا بھی روزہ ہے، اس کے بعد آپ نے بوسہ لیا اور حضرت عائشہؓ اس وقت جوان تھیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو حضرت عائشہؓ کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ بوسہ لینے سے ان کو شہوت میں تحریک پیدا نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر شہوت میں تحریک کا خوف ہو تو پھر عورت کے لیے بھی بوسہ منع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں حکم ہے۔

ﷺ ﷺ

روزے کے چند متفرق مسائل

روزے دار کا جنابت کی حالت میں صبح کرنا

اس سلسلے میں درج ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:

۱-عبدالملک بن ابی بکر بن عبدالرحمٰنؒ اپنے والد ابوبکر سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنی روایتوں میں کہتے سنا: "من ادرکه الفجر جنبا فلا یصم" (جس کی صبح اس طرح ہو کہ وہ حالت جنابت میں ہو وہ روزہ نہ رکھے)۔

ابوبکر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی اس بات کا ذکر اپنے باپ عبدالرحمٰن سے کیا تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ پھر عبدالرحمٰن اور میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عبدالرحمٰنؒ نے ان دونوں سے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو دونوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ (بارہا) صبح کے وقت بغیر احتلام کے یعنی جماع کی بنا پر جنابت کی حالت میں ہوتے اور اس کے بعد روزہ رکھ لیا کرتے تھے۔

ابوبکر کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں مروان کے پاس گئے اور عبدالرحمٰنؒ نے ساری بات اسے سنائی تو مروان نے کہا: "میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ تم ابو ہریرہ کے پاس جاؤ اور انہیں ان کی بات کا جواب دے دو، پھر ہم حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس گئے۔ ابو بکرؒ کہتے ہیں کہ میں اس سارے معاملے میں حاضر اور شریک تھا۔ چناں چہ عبدالرحمٰن نے حضرت ابو ہریرہؓ کو ساری بات

بتائی تو حضرت ابو ہریرہؓ نے پوچھا: ''کیا ان دونوں (ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ام المومنین حضرت سلمہؓ) نے تم سے یہ کہا ہے؟ عبد الرحمٰن نے کہا: ہاں، تو حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا: وہ دونوں دوسرے لوگوں سے زیادہ جانتی ہیں۔ پھر حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنی اس بات کو حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا اور کہا کہ یہ بات میں نے حضرت فضل بن عباسؓ سے سنی ہے اور نبی کریم ﷺ سے نہیں سنی۔ پھر حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنی بات سے جو وہ اس سلسلے میں کہا کرتے تھے رجوع کرلیا۔ (مسلم)

۲- ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رمضان میں (کئی بار) اس طرح صبح کرتے تھے کہ آپ بغیر احتلام کے یعنی جماع کی بنا پر جنابت کی حالت میں ہوتے تھے۔ پھر آپ غسل فرماتے (یعنی طلوع فجر کے بعد) اور روزہ رکھتے۔ (مسلم)

۳- حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ صبح کے وقت جنابت کی حالت میں ہوتے اور یہ جنابت جماع کے سبب ہوتی نہ کہ احتلام کی وجہ سے، اس کے باوجود آپ نہ روزہ چھوڑتے اور نہ اس روزے کی قضا رکھتے۔ (مسلم)

۴- ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ سے مسئلہ دریافت کرنے آیا میں اس وقت دروازے کے پیچھے سے سن رہی تھی۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ اگر صبح کی نماز کا وقت ہوجائے اور میں جنابت کی حالت میں ہوں تو کیا میں روزہ رکھ لوں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

و انا تدرکنی الصلوٰۃ و انا جنب فاصوم

''میں بھی صبح کی نماز کے وقت جنابت کی حالت میں ہوتا ہوں اور روزہ رکھ لیتا ہوں۔''

اس پر اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! آپ ہماری طرح نہیں ہیں۔ آپ کے تو اللہ نے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

و اللہ انی لارجو ان اکون اخشاکم للہ و اعلمکم بما اتقی

''بخدا! میں امید رکھتا ہوں کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور میں تم سب سے زیادہ ان باتوں کو جانتا ہوں، جن سے بچنا ضروری ہے۔'' (مسلم، مسند احمد وسنن ابی داؤد)

مندرجہ بالا احادیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جو شخص صبح کے وقت جنابت کی حالت میں ہو اس کا روزہ درست ہے اور اس پر روزے کی قضا نہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ جنابت جماع کی وجہ سے ہو یا احتلام کی وجہ سے۔ جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں: ہمارے علاقے کے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جنبی کا روزہ درست ہے خواہ یہ جنابت احتلام کی وجہ سے ہو یا جماع کی وجہ سے۔ صحابہؓ وتابعین میں سے جمہور کا قول بھی یہی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا خیال یہ تھا کہ جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کرے اس کا روزہ باطل ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک روایت میں جو اوپر بیان ہوئی اس کا ذکر ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے اس خیال سے بعد میں رجوع کر لیا تھا جیسا کہ صحیح مسلمؒ میں اس کی صراحت موجود ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کرتا ہے اس کے روزے کی صحت کے بارے میں علماء کے درمیان جو اختلاف تھا وہ بعد میں دور ہو گیا اور کہا جاتا ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہو گیا ہے کہ ایسے شخص کا روزہ جو جنابت کی حالت میں صبح کرتا ہے، صحیح ہے۔ البتہ ایسے اجماع کی صحت کے سلسلے میں جو اختلاف کے بعد منعقد ہو، اہل اصول کا اختلاف مشہور ہے، لیکن ام المومنین حضرت عائشہ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی حدیث ہر مخالف کے خلاف حجت کی حیثیت رکھتی ہے۔ واللہ اعلم

ابن دقیق العیدؒ نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ پر علماء کا اجماع ہے یا اس سلسلے میں علماء کا جو اتفاق ہے اسے کم از کم اجماع کے مثل ضرور قرار دیا جائے۔ ابن دقیقؒ نے اس رائے کا قوی ہونا اس طرح ثابت کیا ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ: أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ

(البقرۃ:۱۸۷) ''تمہارے لیے رمضان کے مہینے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے) اس سے رمضان کی راتوں میں جماع کی اباحت ثابت ہوتی ہے اور یہ اباحت اس وقت کے لیے بھی ہے، جو طلوعِ فجر سے متصل ہے۔ اب ظاہر ہے جو شخص ایسے وقت جماع کرتا ہے جو فجر سے متصل ہے تو وہ جنبی ہوگا اور جنبی ہونے سے اس کا روزہ فاسد نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن بہتر یہ ہے کہ جنبی شخص طلوعِ فجر سے پہلے غسل کرلے لیکن اگر ایسا نہ کرے تب بھی جائز ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی شخص یہ اعتراض اٹھائے کہ فجر سے پہلے غسل کرنا افضل کیوں کر ہوا جب کہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ صبح جنابت کی حالت میں کرتے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے ایسا صرف اس غرض سے کیا تھا تا کہ یہ ظاہر ہو سکے کہ ایسا کرنا جائز ہے اور بلاشبہ آپ کے حق میں ایسا کرنا ہی افضل تھا کیوں کہ آپ کا منصب یہ تھا کہ لوگوں کو ہر بات واضح طور پر بتائیں۔

اگر حیض یا نفاس کا خون منقطع ہو جائے

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ حیض یا نفاس والی عورت کا خون اگر طلوع فجر سے پہلے رک جائے تو اس پر لازم ہے کہ رات ہی کو روزے کی نیت کرلے اور ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ حیض اور نفاس والی عورت کا خون اگر رات کے وقت طلوع فجر سے پہلے رک جائے اور غسل کرنے سے پہلے فجر طلوع ہو جائے تو ان کا روزہ درست ہوگا اور اس روزے کو پورا کرنا ان پر واجب ہے خواہ غسل جان بوجھ کر نہ کیا ہو یا بھولے سے رہ گیا ہو۔ غسل کرنے کے لیے کوئی عذر ہو یا نہ ہو، گویا حیض و نفاس والی عورت اس معاملہ میں ہر لحاظ سے جنبی کے حکم میں ہے اور جنبی کے احکام پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

ماہِ رمضان میں دن کے وقت جماع کرنا

اس بارے میں درج ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:

۱- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں ہلاک ہوگیا، آپ نے دریافت کیا "وما اھلکك؟" (تمہیں کس چیز نے ہلاک کردیا؟) اس نے کہا: میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کرلیا۔ آپ نے فرمایا: "هل تجد ما تعتق رقبة" (کیا تم ایک غلام یا لونڈی آزاد کرسکتے ہو؟) اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: "هل تستطيع ان تصوم شهرين متتابعين" (کیا تم دو ماہ کے مسلسل روزے رکھ سکتے ہو؟) اس نے کہا: نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: فهل تجد ما تطعم ستين مسكينا؟ (کیا تم ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟) اس نے کہا: نہیں۔ راوی بیان کرتے ہیں پھر وہ بیٹھا رہا حتی کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کھجوروں کا ایک ٹوکرا کہیں سے آیا۔ آپ نے وہ ٹوکرا اسے دے کر فرمایا: تصدق بهذا (یہ لے جاؤ اور صدقہ کردو) وہ کہنے لگا: کیا اپنے سے زیادہ مسکینوں پر؟ واقعہ یہ ہے کہ اس شہر کا کوئی گھرانہ ہم سے زیادہ محتاج نہیں ہے۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ کو ہنسی آ گئی۔ حتی کہ آپ کی کچلیاں نمایاں ہوگئیں اور آپ نے فرمایا: "اذهب فاطعمه اهلك" (اچھا یہ لے جاؤ اور اپنے گھر والوں کو کھلاؤ (کتب ستہ میں یہ روایت موجود ہے)۔

حدیث میں جس ٹوکرے کا ذکر ہے اس میں پندرہ صاع کھجور سماتی ہے۔ گویا ساٹھ مد کھجوریں جو ساٹھ مسکیوں کو فی مسکین ایک مد کے حساب سے کھلائی جاسکتی ہیں۔

اس مسئلے میں جمہور اور احناف کا مسلک یہ ہے کہ روزہ توڑنے کی صورت میں کفارہ اور قضاء کے واجب ہونے میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ بشرطیکہ دونوں نے جان بوجھ کر اپنے ارادے اور اختیار سے رمضان کے دن میں اور روزے کی نیت کرنے کے بعد جماع کیا ہو۔

لہٰذا اگر بھول کر جماع کر بیٹھے یا اپنے اختیار سے نہیں کیا بلکہ مجبور تھے یا اس دن روازے کی نیت نہیں کی تھی تو پھر دونوں میں سے کسی پر کفارہ نہیں ہے۔

اور اگر عورت کے ساتھ مرد نے زبردستی جماع کیا یا عورت کسی عذر کی بنا پر روزہ دار نہ تھی تو صرف مرد پر کفارہ واجب ہوگا عورت پر نہیں۔ اور اگر کسی شخص نے رمضان کی قضا کا روزہ یا نذر کا روزہ رکھا تھا اور جماع سے اسے توڑ دیا تو اس پر کفارہ نہیں ہے اس لیے کہ نفلی روزہ رکھنے والا اپنی ذات کا مختار ہے۔ لیکن بعض فقہاء کے نزدیک ایسے شخص کے لیے جو نفلی روزہ توڑ دے مستحب یہ ہے کہ اس کی قضا رکھے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک عورت پر کفارہ نہیں ہے خواہ اس نے اپنے اختیار سے جماع کیا اور روزہ توڑا ہو یا اسے مجبور کیا گیا ہو البتہ اس پر روزہ کی قضا واجب ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ اگر ارادتاً جماع کیا اور روزہ توڑا تو صرف ایک کفارہ واجب ہے اور وہ بھی محض مرد کی طرف سے اور عورت پر کچھ نہیں۔ عورت پر کفارہ واجب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کفارہ مال کا حق ہے جو جماع کی صورت میں واجب ہوتا ہے لہٰذا وہ مرد کے ساتھ خاص ہے عورت پر نہیں، جس طرح مہر مرد ادا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں امام داؤد ظاہریؒ کی رائے بھی وہی ہے جو شافعیوں کی ہے۔

ابوداؤدؒ نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص رمضان میں روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کرے تو کیا بیوی پر بھی کفارہ واجب ہے؟ امام احمدؒ نے جواب دیا کہ ہم نے کسی سے نہیں سنا کہ عورت پر کفارہ ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلے میں دو قول مروی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے جو اوپر بیان ہوا۔

ابن قدامہؒ نے المغنی میں امام احمدؒ کے اس قول کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ حدیث مذکورہ بالا میں نبی کریم ﷺ نے جماع کا ارتکاب کرنے والے مرد کو صرف ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا تھا اور عورت کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا۔ حالاں کہ آپ کو معلوم تھا کہ عورت بھی اس فعل میں شریک تھی۔

ہمارے نزدیک جمہور کی رائے قابل ترجیح ہے کیوں کہ اس حدیث کی روایات میں سے ایک روایت میں (جو دارقطنی میں ہے) یہ الفاظ ہیں: اس شخص نے کہا! ھلکت و اھلکم

فقال: ما اھلکك؟ قال وقعت علی اھلی) میں خود بھی ہلاک ہوگیا اور میں نے ہلاک کر دیا (یعنی اپنی بیوی کو) آپ نے دریافت کیا: تم کو کس نے ہلاک کر دیا؟ اس نے کہا: میں نے اپنی بیوی سے جماع کرلیا (یعنی رمضان میں روزے کی حالت میں) اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت مجبور تھی اس کے قصد و ارادے کو اس میں دخل نہ تھا لہٰذا آپ نے اس پر کفارہ عائد نہیں کیا۔

اس کے علاوہ یہ بات واضح ہے کہ عبادات کے معاملہ میں مرد اور عورت کی حیثیت مساوی ہے اور روزہ بھی عبادت ہے اس لیے اگر عورت نے روزے کو اپنے ارادے اور مرضی سے توڑا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا اور اگر وہ مجبور تھی اور فعل جماع میں اس کے اختیار کو دخل نہیں تھا تو اس پر صرف قضا ہوگی کفارہ نہیں۔

کفارہ کیا ہے؟

کفارہ کی تین صورتیں ہیں:

الف: مسلمان غلام یا لونڈی آزاد کرنا جس کے لیے یہ شرط ہے کہ ہر قسم کے عیب سے پاک ہو مثلاً اندھا، گونگا اور مجنون نہ ہو، البتہ حنفیوں کے نزدیک کافر غلام یا لونڈی بھی کفارے میں آزاد کرنا جائز ہے۔

ب: اگر غلام یا لونڈی میسر نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے چناں چہ اگر ہجری مہینوں کی پہلی تاریخ کو روزہ رکھنا شروع کیا تو چاند کے اعتبار سے اس مہینہ کو پورا کرے (خواہ تیس دن ہوں یا انتیس ۲۹) اور اس کے بعد کے مہینہ میں بھی پورا مہینہ روزے رکھے (یہ بھی تیس دن ہوں یا انتیس ۲۹) اور اگر مہینے کے درمیان میں روزے رکھنا شروع کیا تو مہینہ کے جتنے دن باقی ہیں ان میں بھی روزے رکھے اور اگلے مہینہ میں پورا مہینہ روزے رکھے۔ (مہینے دن جتنے بھی ہوں یعنی تیس یا انتیس) اور پہلے مہینے کے باقی ماندہ روزے تیسرے ماہ میں رکھے لیکن ان کو پہلے ماہ کے روزوں کے ساتھ ملا کر تیس پورے کرے۔ اس کے علاوہ جو روزہ توڑا تھا اس کی قضا کا روزہ الگ رکھے اور اسے کفارے کے روزوں میں شمار نہ کرے۔

ان دو ماہ کے روزوں کا مسلسل ہونا ضروری ہے یعنی روزوں کے درمیان اگر ایک دن کا روزہ بھی چھوڑ دیا خواہ کسی عذر شرعی مثلاً سفر یا بیماری کی وجہ سے ہی چھوڑا ہو تو جتنے روزے اب تک رکھ چکا ہے وہ کفارے میں شمار نہ ہوں گے اور کفارے کے روزے دوبارہ نئے سرے سے رکھنا شروع کرے، کیوں کہ ان روزوں کا مسلسل بغیر انقطاع کے ہونا ضروری ہے اور چوں کہ یہ تسلسل ٹوٹ گیا لہٰذا نئے سرے سے رکھنا شروع کرے۔

لیکن حنبلیوں کے نزدیک اگر کسی عذر شرعی کی وجہ سے درمیان میں روزہ چھوٹ گیا تو اس سے تسلسل نہیں ٹوٹے گا اور ان کی یہ رائے قابل قبول ہے کیوں کہ اگر کفارہ ادا کرنے والی عورت ہو اور حیض یا نفاس کی وجہ سے درمیان میں روزے نہ رکھ سکے تو اس کا تسلسل اس طرح قائم رہے گا کہ عذر دور ہوتے ہی پھر روزے رکھنا شروع کردے۔

ج: اگر مسلسل دو ماہ کے روزے نہ رکھ سکتا ہو کیوں کہ اس میں بہت مشقت ہے یا کسی اور وجہ سے نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے گویا کفارے کے ہر ایک دن کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کفارہ میں مذکورہ بالا ترتیب ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟ جمہور علماء کے نزدیک حدیث میں مذکور ترتیب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے یعنی کفارے میں پہلی چیز غلام آزاد کرنا ہے۔ لیکن اگر غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ ہو تو پھر دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو ایسا کھانا کھلائے جو معیار میں اپنے اور اپنے اہل خانہ کے کھانے کے لحاظ سے اوسط درجہ کا ہو۔ جمہور کا مسلک ہی احناف کا مسلک ہے۔

اور پہلی صورت کو چھوڑ کر دوسری اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری صورت اختیار کرنا جائز نہیں ہے جب تک کہ پہلی اور دوسری صورت پر عمل کرنے سے عاجز نہ ہو۔ جمہور کی دلیل یہ ہے کہ اعرابی والی مذکورہ بالا حدیث سے بظاہر یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ترتیب ضروری ہے کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے اس کی استطاعت کے بارے میں اسی ترتیب سے دریافت فرمایا ہے۔

لیکن مالکیوں کے نزدیک اور امام احمدؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے کہ کفارہ ادا

کرنے والے کو تینوں میں سے کسی ایک صورت پر عمل کرنے کا اختیار ہے اور جو بھی کرلے گا کفارہ ادا ہوجائے گا۔ ان کی دلیل حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے جسے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو جس نے رمضان میں روزہ توڑ دیا تھا حکم دیا کہ وہ ایک غلام آزاد کرے یا دو ماہ کے روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اس روایت میں حرف "او" ہے جس کے معنی "یا" ہیں اور اس سے مراد دو یا دو سے زیادہ باتوں کے درمیان اختیار دینا ہوتا ہے یعنی ان میں سے کوئی ایک کرلی جائے۔

دوسرے، چوں کہ کفارہ کسی حکم کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں ادا کرنا لازم آتا ہے لہٰذا اس میں یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ تینوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرلے جیسا کہ قسم کے کفارہ میں ہے۔

لیکن ہمارے خیال سے جمہور کی رائے زیادہ صحیح ہے یعنی یہ کہ تینوں صورتوں میں ترتیب ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور پہلی سے عاجز ہونے پر دوسری اور دوسری سے بھی عاجز ہونے پر تیسری صورت اختیار کرے۔

روزہ دار کو اگر دن کے وقت احتلام ہوجائے

مالکیوں کے نزدیک روزے کی حالت میں اگر احتلام ہوجائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ترمذی اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ثلاث لا یفطرن، القیء والحجامة والاحتلام

"تین باتیں ایسی ہیں کہ ان کے باوجود روزہ نہیں ٹوٹتا: قے کرنا، پچھنے لگوانا اور احتلام ہوجانا۔"

بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور ابو حاتمؒ اور ابوزرعہؒ نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ یہ بات زیادہ صحیح اور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور امام بیہقیؒ نے ان دونوں یعنی ابو حاتمؒ اور ابوزرعہؒ کی تائید کی ہے۔

روزے کی قضا اور فدیہ

قضاء کیا ہے؟

قضا سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص جو کسی وجہ سے رمضان میں کوئی روزہ نہیں رکھ سکا چھوٹے ہوئے روزے کے بدلے میں رمضان کے علاوہ کسی ایسے دن روزہ رکھے جس میں نفلی روزہ رکھنا مباح ہو، چناں چہ ایسے دن جس میں روزہ رکھنا منع ہے مثلاً ایام عید کے یا وہ دن جو فرض روزے کے لیے مخصوص ہیں، جیسے رمضان کا مہینہ یا وہ دن جن میں بطور خاص روزہ رکھنے کی نذر مانی ہو، ایسے تمام دنوں میں رمضان کے روزے کی قضا کا روزہ نہیں رکھا جاسکتا۔

رمضان کے چھوٹے ہوئے روزے کے بدلے میں قضاء روزہ فوراً ہی رکھنا واجب نہیں ہے بلکہ اس کے وجوب میں یہ وسعت ہے کہ کسی وقت بھی رکھا جاسکتا ہے۔ چناں چہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے بہ سند صحیح مروی ہے کہ آپ رمضان کے روزوں کی قضاء شعبان میں کیا کرتی تھیں۔ یعنی قضاء پر قدرت ہوتے ہی فوراً نہیں رکھا کرتی تھیں۔

روزوں کی قضاء میں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ مسلسل رکھے جائیں کیوں کہ اس سلسلے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

و من کان مریضا او علی سفر فعدة من ایام اخر (البقرة:۱۸۵)

''اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔''

اس آیت کریمہ میں دوسرے دنوں میں روزے رکھنے کو عام رکھا گیا ہے کہ جب ممکن ہو رکھ لے، مسلسل رکھے جائیں یا غیر مسلسل سب درست ہے، کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی۔

دار قطنیؒ نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان کے روزوں کی قضاء کے سلسلے میں فرمایا:

ان شاء الله فرق و ان شاء تابع

''چاہے مسلسل رکھے اور چاہے وقفوں کے ساتھ۔''

روزوں کی قضاء میں اگر اس قدر تاخیر ہو جائے کہ دوسرا رمضان آ جائے

☆ احناف اور امام حسن بصریؒ کے نزدیک اگر دوسرا رمضان شروع ہو گیا تو پہلے موجودہ رمضان کے روزے رکھے، اس کے بعد ان روزوں کی قضا رکھے جو اس کے ذمے باقی ہیں۔ اور تاخیر سے اس پر کوئی فدیہ نہیں ہے۔ خواہ تاخیر کسی عذر کی بنا پر ہوئی ہو یا بغیر عذر کے۔

☆ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق راہویہؒ کے نزدیک اگر تاخیر بغیر کسی عذر کے واقع ہوئی ہے تو وہ پہلے موجودہ رمضان کے روزے رکھے اس کے بعد ان روزوں کی قضا کرے جو گزشتہ رمضان کے اس کے ذمے باقی تھے اور ہر روزے پر ایک مد گندم فدیہ بھی ادا کرے۔

بظاہر احناف کا مسلک اس سلسلے میں صحیح ہے اور ان کے علاوہ دوسرے علماء جنھوں نے بلاعذر تاخیر کی بنا پر فدیہ ضروری قرار دیا ہے ان کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو بطور حجت پیش کی جائے اور ظاہر ہے شریعت میں نصِ صحیح کے بغیر کوئی بات قابل قبول نہیں۔

فدیہ اور اس کی مقدار

فدیہ سے مراد یہ ہے کہ جو شخص رمضان کے جتنے روزے نہ رکھ سکا ہو اور وہ ان میں سے ہر روزے پر ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ البتہ فدیہ کی مقدار کے بارے میں مختلف مکاتب

فقہ کے درمیان اختلاف ہے۔

☆ احناف کے نزدیک محض ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے، جس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں۔

۱- ایک دن میں صبح اور شام دونوں وقت کسی مسکین کو ایسا کھانا کھلا دے جس سے وہ سیر ہوجائے یا صبح کے دو کھانے یا شام کے دو کھانے یا افطار وسحری کے وقت کسی مسکین کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے۔

۲- یا کسی فقیر کو نصف صاع [۱] گندم یا اس کی قیمت دے دے۔

۳- یا کسی مسکین کو جو یا کھجور یا کشمش کا ایک صاع دے دے۔

فدیہ کے سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے شخص کو نہ دیا جائے، جس کا نفقہ فدیہ دینے والے کے ذمہ ہو مثلاً باپ، دادا، پردادا وغیرہ کی، یا بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی یا نواسہ، نواسی اور بیوی کو۔

☆ مالکیوں کے نزدیک فدیہ ادا کرنے میں ضروری ہے کہ کسی مسکین کو ایسے کھانے کے ایک مد کا مالک بنا دیا جائے، جو عام طور پر فدیہ دینے والے کے شہر میں کھایا جاتا ہے۔ مثلاً گندم وغیرہ یا جس چیز کا زیادہ رواج ہو۔ اور مد سے مراد نبی کریم ﷺ کا مد ہے جو دو ایسے کفِ دست کے برابر ہے جو نہ زیادہ بند اور نہ زیادہ کھلے ہوں اور مالکیوں کے قابل اعتماد قول کے مطابق اس کے بدلے میں صبح یا شام کا کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

اور پیمائش کے لحاظ سے مد کی مقدار مصری پیمانے ''قدح'' کا ایک تہائی ہے اور وزن کے حساب سے ایک رطل اور رطل کا تیسرا حصہ بنتا ہے اور رطل مکی درہم کے حساب سے ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) درہم کے برابر ہوتا ہے (تقریباً ساڑھے دس چھٹانک)۔

جن کو فدیہ دیا جائے وہ فقراء اور مساکین ہوں اور کسی ایسے شخص کو نہیں دیا جاسکتا، جس کی کفالت فدیہ دینے والے کے ذمہ ہو مثلاً ماں، باپ، بیوی اور نابالغ اولاد۔ البتہ وہ رشتہ دار جن کے نان ونفقہ کی ذمے داری فدیہ ادا کرنے والے پر نہ ہو ان کو فدیہ دینے میں

---

(۱) صاع تقریباً آٹھ مد کے برابر ہوتا ہے اور مد سوا رطل تقریباً ساڑھے دس چھٹانک کا ہوتا ہے۔ (مترجم)

کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ یہ مسکین اور فقیر ہوں مثلاً بھائی، بہن اور نانا، دادا وغیرہ۔

☆ شافعی مسلک کے مطابق روزے کے فدیہ میں کھانے کی وہ تمام چیزیں دی جاسکتی ہیں جو صدقۂ فطر میں دی جاتی ہے۔ مثلاً گندم، جو وغیرہ لیکن ان اجناس کا آٹا یا ستو دینا صحیح نہیں ہے۔ اور فدیہ کی مقدار ایک مد ہے اور مد نصف مصری قدح (پیالہ) کے برابر ہوتا ہے۔ گویا مروجہ مصری پیمانے کا آٹھواں حصہ۔

یہ بھی ضروری ہے کہ جس مسکین کو فدیہ دیا جائے وہ ایسا شخص نہ ہو جس کا نان ونفقہ فدیہ ادا کرنے والے کے ذمے ہو اور اگر کفارہ روزہ توڑنے والے کے علاوہ اس کی طرف سے کوئی دوسرا شخص ادا کر رہا ہو تو اس صورت میں روزہ توڑنے والے کے اہل وعیال کو بھی مساکین میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک روزے کے فدیے میں مسکین کو ایک مد گندم یا نصف صاع کھجور یا جو یا کشمش یا پنیر دیے جاسکتے ہیں اور اگر ان اشیاء کا حصول ممکن ہو تو ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز فدیہ میں دینا صحیح نہیں اور صاع حنبلیوں کے نزدیک مصری پیمانہ کے حساب سے دو پیالوں کے برابر ہے۔

نیز گندم اور جو کا آٹا یا ستو بھی دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر آٹا یا ستو دیے جائیں تو ان کا وزن گندم اور جو کے دانوں کے برابر ہونا چاہیے۔ پیمائش سے حساب نہ کیا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ آٹا یا ستو بے چھنا دے دیا جائے۔ اسی طرح دانے بھی صاف کیے بغیر دینا جائز ہے۔

فدیہ میں یہ صحیح نہیں ہے کہ کسی مسکین کو روٹی کھلا دی جائے یا ناقص غلہ دیا جائے مثلاً کرم خوردہ، یا ایسی گندم دی جائے جو پانی میں بھیگی ہوئی یا پرانی ہو، جس کا ذائقہ بگڑ چکا ہو۔

فدیہ کے سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ جسے فدیہ دیا جائے وہ دینے والے کے اصول یعنی باپ، دادا، پردادا وغیرہ اور دینے والے کے فروع مثلاً بیٹا، بیٹی اور پوتا، پوتی یا نواسا، نواسی وغیرہ میں سے نہ ہو۔ خواہ اس کے نفقے کی ذمہ داری اس پر ہو یا نہ ہو اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کفارہ دینے والا یہ کفارہ اپنی طرف سے ادا کر رہا ہے یا کسی دوسری کی

طرف سے۔ دونوں صورتوں میں ایک ہی حکم ہے۔

ہمارے نزدیک اس سلسلے میں احناف کی رائے سب سے بہتر اور دورِ حاضر میں زیادہ قابلِ عمل ہے اور آج کل بالعموم فتویٰ اسی کے مطابق دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ امام شعرانیؒ نے اپنی کتاب ''کشف الغمہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ جس سال میرے والد کی وفات ہوئی اور انہیں معلوم ہوگیا کہ اب وہ روزوں کی قضاء نہ رکھ سکیں گے تو ہم نے روٹی اور گوشت کا ایک بڑا لگن تیار کرایا اور متعدد لوگوں کو جو تیس سے بھی زیادہ تھے کھلایا۔ گویا ایک دن کے روزے کے بدلے میں ایک شخص کو کھانا کھلایا۔(۱)

اسی طرح مفسر قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت انسؓ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ ایک سال کمزوری کی وجہ سے روزے رکھنے پر قادر نہ ہوسکے تو آپ نے کھانے کا ایک بڑا لگن تیار کرایا اور تیس مسکینوں کو بلا کر انہیں شکم سیر کھانا کھلا دیا۔(۲)

روزے میں غیبت، فحش کلامی اور جھوٹ کی ممانعت

اس بارے میں درج ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:

۱- نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت عبیدؓ بیان کرتے ہیں کہ دو عورتوں نے روزہ رکھا یعنی ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے ذکر کیا کہ دو عورتوں نے روزہ رکھا ہے اور وہ پیاس کی وجہ سے مرنے کے قریب ہیں۔ آپ نے اس کی یہ بات سن کر منہ پھیر لیا یا آپ خاموش رہے۔ اس شخص نے دوبارہ یہی بات دہرائی اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ بخدا وہ مر رہی ہیں یا مرنے کے قریب ہیں۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا انہیں بلاؤ! راوی بیان کرتے ہیں کہ وہ دونوں آئیں اور ایک پیالہ منگوایا گیا اور ان میں سے ایک سے کہا گیا کہ قے کرو چناں چہ اس نے قے کی جس میں پیپ، خون، کچ لہو اور گوشت کی بوٹیاں تھیں اور اس کی قے سے آدھا پیالہ بھر گیا۔ پھر دوسری سے کہا گیا کہ تم بھی قے کرو! اس نے بھی قے کی تو

---

(۱) کشف الغمہ للشعرانی، ج ۱، ص ۲۶۰

(۲) الجامع لاحکام القرآن، ج ۲، ص ۲۸۹

اس میں پیپ، خون، کچ لہو اور گوشت کے لوتھڑے تھے اور یہ پیالہ پورا بھر گیا، اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ان هاتين صامتا عما احل الله لهما و افطرتا على ما حرم الله عليها، جلست احداهما الى الاخرى فجعلتا تاكلان لحوم الناس.

"ان دونوں عورتوں نے روزہ رکھا تو تھا ایسی چیزیں کھا کر جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حلال کی ہیں اور افطار کیا ایسی چیزوں سے جو اللہ نے ان پر حرام کردی ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئیں اور لوگوں کا گوشت کھانے لگیں۔یعنی غیبت کرتی رہیں۔"

یہ حدیث امام احمد بن حنبلؒ، ابن ابی الدنیاؒ، ابو یعلیٰؒ، ابوداؤد طیالسیؒ اور بیہقیؒ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

۲۔حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

رب صائم ليس له من صيامه الا الجوع و رب قائم ليس له من قيامه الا السهر.

"کئی روزے دار ایسے ہیں جن کے حصے میں روزے میں سے صرف بھوک آتی ہے اور کئی راتوں کو اٹھ کر قیام کرنے والے ایسے ہیں جن کے حصے میں سوائے رت جگے کے اور کچھ نہیں آتا۔"

یہ روایت ابن ماجہ، نسائی اور صحیح ابن خزیمہ میں ہے اور حاکم نے اسے دوسرے الفاظ میں روایت کیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ روزہ دار کے لیے غیبت، غلط بیانی، فحش کلامی اور جھوٹی باتوں سے بچنا کس قدر ضروری ہے۔ ان حدیثوں کی غرض و غایت یہ ہے کہ جو روزہ دار مرد یا عورت اس قسم کے خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرے گا اسے نہ تو روزے کا ثواب ملے گا اور نہ اللہ تعالیٰ اس کا روزہ قبول فرمائے گا بلکہ اس کا روزہ

اس کے منہ پر مار دیا جائے گا۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اگر روزہ دار مذکورہ بالا باتوں میں سے کسی بات کا مرتکب ہو تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا بلکہ ان حدیثوں کا مقصد ایسی تمام برائیوں اور گناہوں سے بچنے کی تنبیہ کرنا ہے کیوں کہ ان سے روزے کا ثواب باطل ہوسکتا ہے اور ان کا روزہ اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر مقبول قرار پاسکتا ہے۔

اعتکاف

اس ضمن میں مندرجہ ذیل حدیثیں ملاحظہ ہوں:

ا- امام مسلمؒ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ماہِ رمضان کے آخری عشرے میں ہر سال اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ (آپ کا یہی معمول رہا) حتی کہ آپ نے وفات پائی۔ پھر آپ کے بعد آپ کی ازواجِ مطہرات اعتکاف کیا کرتی تھیں۔

۲- مسلمؒ ہی میں ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کرنے کا ارادہ فرماتے تو فجر کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد اپنی اعتکاف گاہ میں داخل ہو جایا کرتے تھے اور نبی کریم اپنے لیے اعتکاف کا خیمہ لگانے کا حکم دیتے جو لگا دیا جاتا۔ ایک بار رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں آپ نے اعتکاف کا ارادہ فرمایا تو ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی اپنا خیمہ لگانے کا حکم دیا اور ان کا خیمہ بھی تیار کر دیا گیا۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ نے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد جب نظر ڈالی اور کئی خیمے نظر آئے تو آپ نے فرمایا: کیا تم نیکی کا ارادہ رکھتی ہو؟ پھر آپ نے حکم دیا اور آپ کا خیمہ اکھاڑ دیا گیا اور اس مرتبہ آپ نے رمضان میں اعتکاف نہیں کیا اور شوال کے پہلے عشرے میں اعتکاف کیا۔

اعتکاف کے لغوی معنیٰ

اعتکاف کے لغوی معنی ہیں رکنا اور کسی ایک جگہ ٹھہرے رہنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عٰکفون (الانبیاء:۵۲)

''یہ کیسی مورتیں ہیں جن پر تم مجاور بنے بیٹھے ہو۔''

یعنی ان کے پاس ٹھہر کر ان کی عبادت کرتے ہو۔

اصطلاح شرع میں اعتکاف سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص مخصوص طریقہ پر مسجد میں ٹھہرا رہے یعنی ثواب اور قربِ الٰہی کے حصول کی خاطر مسجد میں ہی رہے اور اس سے باہر نہ نکلے۔

اعتکاف کی شرعی حیثیت

اعتکاف کا جواز نبی کریم ﷺ کی عملی سنت سے ثابت ہے جیسا کہ مذکورہ بالا دونوں حدیثوں سے واضح ہوتا ہے اس کے علاوہ امت مسلمہ کے علماء کا اجماع ہے کہ اعتکاف کارِ ثواب ہے۔

ارکانِ اعتکاف

اعتکاف کے تین ارکان ہیں:

(۱) مسجد میں ٹھہرنا (۲) مسجد (۳) اعتکاف میں بیٹھنے والا شخص۔

مالکیوں اور شافعیوں کے نزدیک ایک چوتھا رکن بھی ہے اور وہ ہے نیت۔ گویا مالکیوں اور شافعیوں کے نزدیک نیت شرط نہیں بلکہ رکن ہے۔

اعتکاف کی مسجد

اعتکاف کے لیے ضروری ہے کہ مسجد میں ہو کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولا تباشروھن و انتم عٰکفون فی المساجد (البقرۃ:۱۸۷)

''اور جب تم مسجد میں معتکف ہو، تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔''

اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا ضروری ہے۔

اس لیے کہ اگر اعتکاف مسجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھی کیا جاسکتا تو قرآن مجید میں مباشرت سے منع ہونے کے سلسلے میں مسجد کا بطور خاص ذکر نہ کیا جاتا۔ کیوں کہ مباشرت تو حالت اعتکاف میں جائز ہی نہیں ہے۔ لہٰذا مسجد کے ذکر سے یہی مراد ہے کہ اعتکاف صرف مسجد میں کیا جاسکتا ہے۔

اس مسجد کے بارے میں جس میں اعتکاف کیا جاسکتا ہے علماء کے درمیان اختلاف ہے

☆ مالکی مسلک

مالکیوں کے نزدیک جس مسجد میں اعتکاف کیا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی ہو کہ اس میں سب لوگ آجاسکیں۔ لہٰذا گھر کی مسجد میں جو اہل خانہ کے لیے مخصوص ہو اعتکاف صحیح نہیں ہے خواہ معتکف عورت ہی کیوں نہ ہو اور کعبہ مکرمہ میں یا کسی ولی کی طرف منسوب مقام اور مسجد کی چھت پر بھی اعتکاف صحیح نہیں۔ اسی طرح مسجد کی محراب میں جہاں امام کھڑا ہو کر خطبہ دیتا ہے اور مسجد کے وہ مقامات جہاں پانی رکھا جاتا ہے یا جہاں قندیل جلائی جاتی ہے ایسے مقامات میں بھی اعتکاف صحیح نہیں۔ کیوں کہ ان تمام مقامات کو مسجد سے علیحدہ بنایا جاتا ہے۔

☆ حنفی مسلک

حنفیوں کے نزدیک مسجد اعتکاف کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ ایسی ہو جس میں نماز باجماعت ہوتی ہو اور اس کے لیے امام اور موذن مقرر ہوں خواہ اس میں نماز باجماعت پانچوں وقت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔ اور ایسی مسجد کی شرط مرد معتکف کے لیے ہے۔ عورت اپنے گھر کی اس مسجد میں اعتکاف کرسکتی ہے جو اس نے گھر میں نماز پڑھنے کے لیے جگہ مخصوص کر رکھی ہے۔ یعنی اگر کسی عورت نے اپنے گھر میں نماز کے لیے جگہ مقرر کر رکھی ہے خواہ اسے مسجد قرار دیا ہو یا صرف نماز پڑھنے کے لیے مخصوص کر رکھا ہو تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اس جگہ کے

علاوہ کسی اور جگہ اعتکاف کرے مثلاً سونے کا کمرہ یا کھانے کا کمرہ وغیرہ ان میں اعتکاف کرنا جائز نہیں۔ کیوں کہ انہیں نماز کے لیے مخصوص نہیں کیا گیا۔

حنفیوں کے نزدیک عورت کے لیے ایسی مسجد میں اعتکاف کرنا مکروہ تنزیہی ہے جس میں باجماعت نماز ہوتی ہے۔

☆ شافعی مسلک

شافعیوں کے نزدیک ایسی مسجد میں اعتکاف جائز ہے جس کے بارے میں معتکف کا خیال ہو کہ یہ جگہ ان امور کے لیے وقف ہے جو مسجد میں کیے جاتے ہیں اور وہ ایسی جگہ نہ ہو جس میں متفرق کام کیے جاتے ہوں مثلاً چوپال وغیرہ، خواہ اس مسجد میں باجماعت نماز نہ ہوتی ہو اور خواہ اس میں سب لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو، ایسی مسجد میں مرد اور عورت دونوں کے لیے اعتکاف کرنا جائز ہے۔

☆ حنبلی مسلک

حنبلیوں کے نزدیک ہر قسم کی مسجد میں مرد اور عورت دونوں کے لیے اعتکاف کرنا جائز ہے اور ان کے نزدیک مسجد کے لیے کسی خاص قسم کی شرط نہیں ہے الا یہ کہ اعتکاف کرنے والا اتنی مدت اعتکاف کرنا چاہتا ہو جس کے دوران میں کوئی ایسا فرض آتا ہو جس میں جماعت واجب ہے تو ایسی صورت میں اعتکاف صرف اس مسجد میں صحیح ہوگا، جس میں نماز باجماعت ہو سکے خواہ یہ جماعت ان لوگوں کی ہو جو یہاں اعتکاف کر رہے ہوں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جمہور فقہاء کے نزدیک عورت کا اعتکاف گھر کی مسجد میں صحیح نہیں کیوں کہ گھر کی مسجد کو مسجد نہیں کہا جاتا اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ ایسے گھر کو جس میں مسجد ہو فروخت کرنا جائز ہے۔

پھر یہ بات احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات مسجد نبویؐ میں اعتکاف فرماتی تھیں۔

عورت کے اعتکاف کے سلسلے میں ہماری رائے

ہمارے نزدیک عورت کے اعتکاف کے سلسلے میں احناف کی رائے زیادہ صحیح ہے۔ یعنی یہ کہ اگر عورت نے اپنے گھر میں نماز اور عبادت کے لیے کوئی جگہ مخصوص کر رکھی ہے تو پھر وہ اپنے گھر کی مسجد میں یعنی اسی مخصوص جگہ میں اعتکاف کرے۔

ہمارے خیال میں اس دور میں عورت عام مسجدوں میں اعتکاف نہیں کرسکتی کیوں کہ ایسے حالات میسر نہیں ہیں کہ فتنے سے محفوظ رہا جاسکے۔

پھر جب عورت کے سلسلے میں یہ ارشادِ نبویؐ موجود ہے کہ ''عورت کی نماز گھر میں اس نماز سے بہتر ہے جو وہ محلّہ کی مسجد میں ادا کرتی ہے اور محلّہ کی مسجد میں نماز عورت کے لیے اس نماز سے بہتر ہے جو وہ جامع مسجد میں ادا کرتی ہے'' تو ظاہر ہے کہ اعتکاف بھی جو گھنٹوں بلکہ کئی دنوں کا بھی ہوسکتا ہے عورت کے لیے مسجد کے مقابلہ میں گھر میں بدرجہ اولیٰ بہتر ہونا چاہیے۔

علاوہ ازیں جن علماء نے عورت کے لیے مسجد میں اعتکاف کرنا جائز قرار دیا ہے ان میں سے بھی اکثر علماء کے نزدیک عورت کے لیے مسجد جامع میں اعتکاف صرف اس صورت میں جائز ہے کہ اعتکاف کرنے والی عورت حسین وجمیل نہ ہو اور کسی قسم کا فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ نہ ہو۔(۱)

یہ شرط کہ اعتکاف کرنے والی حسین وجمیل نہ ہو، قابل قبول نہیں ہے اس لیے کہ ایک محاورہ ہے ''ہر گری پڑی چیز کا کوئی نہ کوئی اٹھانے والا ہوتا ہے'' اس لیے عورت کو مسجد میں اعتکاف سے روکنے کے لیے صرف یہ شرط کافی ہے کہ ''فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ نہ ہو'' اور اس شرط کا پورا ہونا آج کل ممکن نہیں جب کہ اس شرط کا پایا جانا تمام مسالک فقہ کے لحاظ سے ضروری ہے۔ پھر جب حج جو فرض ہے اس کے سفر کے لیے یہ شرط ہے کہ عورت شوہر یا محرم یا قابل اعتماد عورتوں کی جماعت کے ساتھ جائے اور وہ بھی اس صورت میں کہ فتنہ سے امن ہو تو ظاہر ہے کہ اعتکاف میں جو فرض نہیں ہے یہ شرط بدرجۂ اولیٰ ضروری ہونی چاہیے۔

---

(۱) الفقہ الواضح، محمد بکر اسماعیل، ج ٦، ص ۱۴

نیت

اعتکاف میں نیت، خواہ اسے شرط قرار دیا جائے یا رکن، بہرحال واجب ضرور ہے کیوں کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

و ما امروا الا لیعبدوا الله مخلصین له الدین (البینة:۵)

''اور ان لوگوں کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے۔''

نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرئ ما نوی (بخاری ومسلمؒ)

''اعمال کا دار و مدار صرف نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی کچھ ملتا ہے جو حاصل کرنے کی وہ نیت کرتا ہے۔''

اعتکاف کرنے والے کے لیے شرائط

اعتکاف کرنے والے کے لیے شرط ہے کہ وہ مسلمان اور صاحبِ شعور ہو اور جنابت، حیض اور نفاس سے پاک ہو۔ لہٰذا کار، ناسمجھ بچہ، بے عقل، جنبی اور حیض و نفاس والی عورت کا اعتکاف صحیح نہیں ہے۔

☆ احناف کے نزدیک جنابت سے پاک ہونا اعتکاف کے حلال ہونے کے لیے شرط ہے۔ صحیح ہونے کے لیے نہیں۔ لہٰذا اگر کسی نے جنابت کی حالت میں اعتکاف کیا تو اعتکاف صحیح ہوگیا، اگرچہ اس کا بحالت جنابت اعتکاف کرنا حرام ہے۔ لیکن حیض و نفاس سے پاک ہونا اعتکافِ واجب کی صحت کے لیے شرط ہے۔ ''اعتکافِ واجب'' سے مراد وہ اعتکاف ہے، جس کے کرنے کی کسی نے نذر مانی ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے اعتکاف کروں گا۔ چناں چہ اگر کسی عورت نے حیض یا نفاس کی حالت میں اعتکاف کیا تو اس کا اعتکاف صحیح نہیں ہوگا کیوں کہ اعتکاف واجب کے لیے روزہ بھی شرط ہے اور حیض و نفاس کی حالت میں

روزہ نہیں رکھا جاسکتا اور روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا حیض یا نفاس کی حالت میں جو اعتکاف کیا جائے گا وہ صحیح نہیں ہوگا۔

لیکن اعتکاف مسنون کی صحت کے لیے حیض و نفاس سے پاک ہونا شرط نہیں ہے لہٰذا حیض و نفاس کی حالت میں اعتکاف مسنون صحیح ہوجائے گا۔

☆ مالکیوں کے نزدیک جنابت سے پاک ہونا اعتکاف کی صحت کی شرط نہیں ہے بلکہ وہ مسجد میں ٹھہرنے کے جواز کی شرط ہے چناں چہ اگر اعتکاف کی حالت میں معتکف کسی ایسے سبب سے جنبی ہوگیا جو اعتکاف کو باطل کرنے والا نہ ہو مثلاً احتلام ہوجائے اور مسجد میں پانی نہ ہو تو اس پر واجب ہے کہ غسل کے لیے مسجد سے باہر جائے اور پھر جلد واپس لوٹ آئے۔ اور اگر معتکف غسل کے بعد مسجد میں واپس آنے میں دیر لگائے گا تو اس کا اعتکاف باطل ہوجائے گا۔ البتہ یہ تاخیر کسی ضرورت کی بنا پر ہو مثلاً ناخن تراشنا یا مونچھیں بنانا تو اعتکاف باطل نہیں ہوگا۔

لیکن حیض و نفاس سے پاک ہونا اعتکاف کی صحت کے لیے شرط ہے، خواہ کسی قسم کا اعتکاف ہو یعنی اعتکافِ مسنون ہو یا اعتکافِ نذر ہو یا کسی اور قسم کا اعتکاف ہو۔

کیوں کہ مالکیوں کے نزدیک روزہ صحتِ اعتکاف کی شرائط میں سے ہے اور حیض و نفاس کی حالت میں روزہ نہیں رکھا جاسکتا لہٰذا اگر اعتکاف کرنے والی عورت کو اعتکاف کے دوران میں حیض یا نفاس شروع ہوجائے تو اس پر مسجد سے باہر نکل جانا واجب ہے اور پھر جب حیض یا نفاس شروع ہوجائے تو دوبارہ مسجد میں لوٹ آئے اور اس اعتکاف کو مکمل کرے، جس کی اس نے مسجد میں داخل ہوتے وقت ابتداء میں نذر مانی تھی یا نیت کی تھی اور نذر کی صورت میں جتنے دن اعتکاف کی نذر مانی تھی اس کے باقی ماندہ دن اعتکاف میں گزارے اور جن دنوں میں عذر کی وجہ سے مسجد میں نہیں ٹھہر سکی ان دنوں کے بدلے میں اتنے ہی دن مزید اعتکاف کرے۔ لیکن نفلی اعتکاف کی صورت میں صرف ان دنوں کو پورا کرے، جن میں اس نے اعتکاف کرنے کی نیت کی تھی اور عذر کی وجہ سے جو دن اعتکاف میں نہیں گزار سکی ان کے بدلے میں اعتکاف کرنا ضروری نہیں۔

کیا اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہے؟

مالکیوں کے نزدیک ہر قسم کے اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہے خواہ نذر کا اعتکاف ہو یا نفلی۔ لیکن حنفیوں کے نزدیک اعتکافِ واجب یعنی جس کی نذر مانی ہو اس کے لیے تو روزہ شرط ہے لیکن نفلی اعتکاف کے لیے روزہ شرط نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک قابل ترجیح رائے یہ ہے کہ معتکف اگر روزہ رکھے تو بہتر ہے۔ لیکن اگر نہ رکھے تو کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس نے یہ نذر مانی ہو کہ روزہ رکھ کر اعتکاف کرے گا۔

سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسہلؒ سے روایت کیا ہے، ابوسہلؒ بیان کرتے ہیں کہ میرے خاندان کی ایک عورت کے ذمہ اعتکاف تھا یعنی اس نے اعتکاف کی نذر مانی تھی لہٰذا میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: اس پر روزے رکھنا واجب نہیں ہیں۔ البتہ اگر اس نے روزوں کی نذر بھی مانی ہے تو پھر رکھنے ہوں گے۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہوتا۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ بات نبی کریم ﷺ نے فرمائی ہے؟ زہری نے کہا: نہیں، پھر پوچھا، تو کیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا ہے؟ زہری نے کہا: نہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پوچھا، کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے؟ امام زہریؒ نے کہا: نہیں۔ راوی کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے امام زہریؒ سے پوچھا: تو کیا یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا ہے؟ زہریؒ نے کہا: نہیں۔ ابوسہلؒ کہتے ہیں کہ پھر میں اس مجلس سے باہر آ گیا اور امام عطاؒ اور امام طاؤسؒ سے ملا اور ان سے اس بارے میں پوچھا تو طاؤسؒ نے کہا کہ: فلاں عالم کا خیال ہے کہ ایسی عورت پر جس نے اعتکاف کی نذر مانی ہو روزہ واجب نہیں ہے الاّ یہ کہ اس نے روزے کی بھی نذر مان رکھی ہو۔ اور عطاؒ نے بھی یہی کہا کہ: اس پر روزہ نہیں ہے الاّ یہ کہ وہ اپنے روزے کی بھی نذر مانے۔

عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اعتکاف نہ کرے

شوہر کی اجازت کے بغیر عورت کا اعتکاف کرنا صحیح نہیں، خواہ یہ ایسا اعتکاف ہو جس کی اس نے نذر مانی ہو۔ حنفی مسلک بھی یہی ہے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک اگر عورت شوہر کی اجازت کے بغیر اعتکاف کرے گی تو اس کا اعتکاف تو صحیح ہو جائے گا لیکن وہ گناہ گار ہوگی۔ اسی طرح اگر شوہر اجازت دے دے اور عورت حسین و جمیل ہو تو اس کا اعتکاف کرنا مکروہ ہے۔

☆ مالکیوں کے نزدیک عورت کے لیے جائز نہیں کہ شوہر کی اجازت کے بغیر اعتکاف کی نذر مانے یا نفلی اعتکاف کرے اگر اسے معلوم ہو یا اس کا گمان ہو کہ خاوند کو اس کی ضرورت ہوگی یعنی وہ اس سے جماع کا طالب ہوگا۔ لیکن اگر اجازت کے بغیر اعتکاف کرے گی تو اعتکاف صحیح ہو جائے گا۔ البتہ شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ اس سے جماع کرنا چاہے تو اس کا اعتکاف ختم کرادے۔ لیکن جماع کے علاوہ کسی اور غرض سے وہ اعتکاف توڑنے کا حکم نہیں دے سکتا اور اگر عورت نے اپنا اعتکاف توڑ دیا تو اس پر اس کی قضا واجب ہے خواہ یہ نفلی اعتکاف ہو کیوں کہ اس نے شوہر سے اجازت نہ لے کر ایک زیادتی کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن ایسے اعتکاف کی قضاء میں جلدی نہ کرے اور پھر جب اس کا اعتکاف کی قضاء کرنا چاہے تو شوہر سے اجازت طلب کرے۔

نبی کریمؐ نے اپنا خیمۂ اعتکاف کیوں اکھڑوا دیا تھا؟

ایک حدیث میں جو اس باب کے شروع میں بیان ہو چکی ہے، یہ مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کا ارادہ فرمایا اور خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا جب آپ کا خیمہ نصب ہو گیا تو ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی اپنا خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا اور وہ بھی نصب کر دیا گیا پھر کچھ اور ازواج مطہرات نے بھی اپنے خیمے نصب کرنے کا حکم دیا اور وہ بھی نصب کر دیے گئے۔ پھر جب نبی کریم ﷺ نے نمازِ فجر ادا کی

اور یہ تمام خیمے لگے ہوئے دیکھے تو ارشاد فرمایا: "البر تردن" (کیا تم سب نیکی کا ارادہ رکھتی ہو؟) پھر آپ نے حکم دیا اور آپ کا خیمہ اکھاڑ دیا گیا اور آپ نے اس رمضان میں اعتکاف نہ کیا اور پھر شوال کے پہلے عشرے میں اعتکاف فرمایا:

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ قاضی عیاضؒ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس موقعے پر جو کچھ ارشاد فرمایا وہ ان ازواجِ مطہرات کے خیمے نصب کرانے پر اظہار ناپسندیدگی تھا، البتہ بعض ازواج کو آپ نے اعتکاف کی اجازت دے دی تھی جیسا کہ بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ اور آپ کے اظہار ناپسندیدگی کا سبب یہ تھا کہ آپ کو یہ خوف ہوا کہ کہیں یہ سب اعتکاف کے بارے میں غیر مخلص ہوں اور ان کا مقصد اس سے باہمی رشک وحسد کی بنا پر نبی کریم ﷺ کا قرب حاصل کرنا ہو۔ لہٰذا آپ نے ان کا مسجد میں ٹھہرنا پسند نہ فرمایا۔ کیوں کہ مسجد میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور آپ کی خدمت میں بدو اور منافقین سبھی حاضر ہوتے ہیں اور امہات المومنین جب اعتکاف میں بیٹھیں گی تو ان کو اپنی ضروریات کے لیے خیموں سے باہر آنا جانا ہوگا اور اس طرح نامناسب صورتِ حال پیدا ہوگی۔

یا آپ نے ان کا اعتکاف کرنا اس لیے ناپسند فرمایا کہ آپ خود اعتکاف فرما رہے تھے لہٰذا آپ مسجد میں ٹھہریں گے اور ازواجِ مطہرات بھی مسجد میں ہوں گی تو گھر کا سا سماں پیدا ہوجائے گا اور اعتکاف کا جو حقیقی مقصد ہے یعنی اہل خانہ اور دنیا والے سب سے کنارہ کشی ہوکر اللہ کے گھر میں بیٹھنا، وہ فوت ہوجائے گا۔

یا اس ناپسندیدگی کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اتنے خیمے لگ جانے کی وجہ سے مسجد میں جگہ تنگ ہوگئی تھی۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کا اعتکاف کرنا درست ہے کیوں کہ آپ نے ازواجِ مطہرات کو اعتکاف کی اجازت دے دی تھی اور بعد میں جو منع فرمایا تھا اس کا ایک خاص سبب تھا اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بلا اجازت اعتکاف سے منع کردے اور یہی سب علماء کی رائے ہے۔ البتہ اگر مرد ایک مرتبہ عورت کو اعتکاف کی اجازت دے دے تو کیا اس کے بعد اسے منع کرنا کا حق

ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور داؤد ظاہریؒ کے نزدیک مرد اپنی بیوی اور غلام کو اجازت دینے کے بعد بھی منع کرسکتا ہے اور نفلی اعتکاف سے باہر نکال سکتا ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک اجازت دینے کے بعد منع کرنا جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک غلام کا اعتکاف ختم کراسکتا ہے لیکن بیوی کو اجازت دینے کے بعد منع نہیں کرسکتا۔

اعتکاف کی مدت

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اعتکافِ مستحب کے لیے کوئی مدت متعین نہیں ہے۔ یہ فقط مسجد میں بہ نیت اعتکاف ٹھہرنے سے ہو جاتا ہے کم وقت کے لیے ٹھہرا جائے یا زیادہ وقت ٹھہرا جائے۔ چناں چہ معتکف کے لیے جائز ہے کہ ایک گھنٹے کا اعتکاف کرنے کی نیت کرے۔

یعلیٰ بن امیہؒ کہتے ہیں کہ میں جب بھی مسجد میں خواہ ایک گھنٹہ کے لیے ٹھہروں ضرور اعتکاف کی نیت کرلیتا ہوں۔

نفلی اعتکاف کرنے والے کو یہ اجازت ہے کہ جب چاہے اپنے اعتکاف کو ختم کردے یعنی جتنی مدت اعتکاف کرنے کی نیت تھی اس کو پورا ہونے سے پہلے بھی ختم کرسکتا ہے۔

البتہ اعتکافِ واجب یعنی وہ اعتکاف جس کی نذر مانی ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ جتنی مدت کا اعتکاف کرنے کی نذر مانی ہے اس مدت کو پورا کیا جائے۔

مفسداتِ اعتکاف

(وہ امور جن سے اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے)

۱۔ جماع یعنی مرد و عورت کا جنسی فعل خواہ بغیر انزال کے ہو اور خواہ عمداً ہو یا بھول کر

دن کو ہو یا رات کو، اعتکاف کو باطل کر دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

و لا تباشروھن و انتم عاکفون فی المساجد تلک حدود الله فلا تقربوھا (البقرۃ:۱۸۷)

''اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو عورتوں سے مباشرت نہ کرو، یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ پھٹکنا۔''

البتہ شافعیوں کے نزدیک بھول کر جماع کرنے سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔

۲- محرکات جماع کا ارتکاب مثلاً شہوت کے ساتھ بوس و کنار اور لپٹنا چمٹنا وغیرہ ان امور سے جب تک انزال نہ ہو اعتکاف باطل نہیں ہوتا لیکن معتکف کے لیے شہوت کے ساتھ ایسی باتیں کرنا جو محرک جماع ہیں، حرام ہے۔

ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اعتکاف میں تھے، میں رات کے وقت آپ کے پاس گئی اور آپ کے ساتھ باتیں کرتی رہی، پھر واپس جانے کے لیے اٹھی تو نبی کریم ﷺ بھی میرے ساتھ اٹھے تاکہ بوسہ لے کر مجھے رخصت کریں۔ اس اثناء میں دو انصاری قریب سے گزرے اور نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر تیزی سے جانے لگے تو آپؐ نے ان سے فرمایا: ٹھہر جاؤ! یہ صفیہ بن حُیَّ ہیں۔ وہ دونوں کہنے لگے: یا رسول اللہ! سبحان اللہ (آپؐ کو اس وضاحت کی کیا ضرورت تھی) آپ نے فرمایا:

ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم فخشیت ان یقذف فی قلوبکما شیئا. یا آپ نے فرمایا: شرا. (بخاری و ابوداؤد)

''بے شک شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے لہٰذا مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ تمہارے دلوں میں کوئی غلط فہمی یا آپ نے فرمایا: کوئی شر ڈال دے۔''

شہوت کے بغیر معمول کے انداز میں ہاتھ لگانے اور چھونے سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اعتکاف کی حالت

میں اپنا سر مبارک میرے قریب کر دیا کرتے تھے اور میں اس میں کنگھی کر دیتی تھی۔ (بخاری، مسلم)

☆ مالکیوں کے نزدیک منہ کا بوسہ جماع کے حکم میں ہے لہٰذا اس سے اعتکاف باطل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بوسہ لینے کی غرض سے حصول لذت ہو، نہ لذت حاصل ہو اور نہ انزال ہو۔ لیکن چھونا اور جسم سے جسم ملانا اگر حصولِ لذت کے لیے ہو یا اس سے لذت حاصل ہو تب تو اعتکاف باطل ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

☆ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اعتکاف کی حالت میں شہوت کے ساتھ بوسہ لینا یا چھونا حرام ہے لیکن جب تک انزال نہ ہو ان باتوں سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔

☆ امام شافعیؒ سے اس سلسلے میں دو قول مروی ہیں۔

اس مسئلہ میں علماء کے درمیان اختلاف کا سبب یہ ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ''ولا تباشروھن الخ''، میں لفظ مباشرت وارد ہوا ہے اس کا اطلاق جماع پر بھی ہوتا ہے اور جماع سے کم پر بھی، لہٰذا بعض علماء نے اس سے فقط جماع مراد لیا ہے جس میں انزال بھی داخل ہے لہٰذا ان کے نزدیک جماع سے اعتکاف باطل ہو جاتا ہے۔

اور بعض علماء نے اس سے جماع اور جماع سے کم وہ تمام باتیں جو شہوت رانی کے دائرے میں آتی ہیں وہ سب مراد لی ہیں لہٰذا ان کے نزدیک شہوت کے ساتھ بوسہ لینے اور چھونے سے بھی اعتکاف باطل ہو جاتا ہے۔

۳- اگر دیکھنے یا شہوت انگیز باتیں سوچنے کے نتیجے میں انزال ہو جائے تو جمہور علماء کے نزدیک اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔ اسی طرح احتلام سے بھی اعتکاف باطل نہیں ہوتا لیکن مالکیوں کے نزدیک اگر دیکھنے اور سوچنے کے نتیجہ میں دن کو یا رات کو انزال ہو جائے خواہ یہ قصداً کیا جائے یا بھول کر تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔

☆ شافعیوں کے نزدیک اگر دیکھنے اور سوچنے سے معتکف کو انزال ہو جانے کی عادت ہو اور دیکھنے یا سوچنے سے اسے انزال ہو جائے تب تو اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

۴- اعتکاف کے شرائط میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ حیض و نفاس سے اعتکاف باطل ہو جاتا ہے۔

عورتوں سے متعلق احکامِ اعتکاف بیان کر دیے گئے ہیں، باقی مسائل کے لیے کتب فقہ کا مطالعہ کیا جائے۔

حج

حج کے لغوی اور اصطلاحی معنی

حج کے لفظی معنی ہیں: کسی عظمت والی جگہ کا قصد و ارادہ کرنا۔

اصطلاحِ شرع میں حج سے مراد چند مخصوص اعمال کا وہ مجموعہ ہے جو خاص طریقہ سے، خاص دنوں میں، ایک خاص جگہ پر ادا کیے جاتے ہیں اور ان اعمال سے مراد وہ عبادت ہے جو طواف، سعی اور وقوفِ عرفہ کی صورت میں اور باقی تمام مناسکِ حج کی صورت میں ہم نے رسولِ اکرم حضرت محمد ﷺ سے سیکھے ہیں اور جن کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری اور اس کی رضا جوئی ہے۔

اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن حج ہے اور ان فرائض میں شامل ہے جو ضروریاتِ دین ہیں۔

عمرہ سے مراد ہے: کعبۃ اللہ کی زیارت اور طواف کرنا۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا اور سر منڈانا یا بال کٹانا۔

فرضیتِ حج کے دلائل

حج کا فرض ہونا قرآن مجید سے، سنت رسول اللہ ﷺ سے اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

قرآنی دلیل۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً ط وَ مَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران:۹۷)

"اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

اور سنت نبویؐ سے حج کی فرضیت کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

بنی الاسلام علٰی خمس شهادة ان لا اله الا اللّٰه و ان محمدا رسول اللّٰه و اقام الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة و حج البیت و صوم رمضان (بخاری و مسلم)

بے شک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔"

حج کی فرضیت پر امت محمدیہ علی صاحبها الصلوٰۃ والسلام کا اجماع ہے اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ جو شخص حج کے فرض ہونے کا انکار کرے وہ کافر ہے۔

حج ہر مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیا۔ ان میں فرمایا: یایها الناس کتب علیکم الحج "اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے" یہ سن کر اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لو قلتها لوجبت، و لو وجبت لم تعملوا بها ولم تستطیعوا الحج مرة واحدة فمن زاد فهو تطوع (احمد والنسائی)

"اگر میں جواب میں کہہ دیتا کہ ہاں! تو ہر سال حج کرنا واجب ہو جاتا اور ہر سال واجب ہو جاتا تو اس پر عمل نہ کر سکتے۔ حج پوری زندگی میں ایک بار واجب ہے۔ اگر کوئی شخص کئی حج کرتا ہے تو یہ اس کے لیے نفلی عبادت ہے جو باعث ثواب ہے۔"

عمرہ کا بیان

عمرہ کا جواز بھی قرآن مجید، سنت نبوی ﷺ اور اجماع سے ثابت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

و اتموا الحج والعمرة لله (البقرة:١٩٦)

''اور اللہ کی خوش نودی کے لیے جب حج اور عمرے کی نیت کرو تو اسے پورا کرو۔''

اور امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

عمرة فی رمضان تعدل حجة

''رمضان میں جو عمرہ کیا جائے اس کا ثواب حج کے برابر ہے۔''

امام شافعیؒ اور امام احمد کے نزدیک عمرہ فرض ہے کیوں کہ ارشادِ باری تعالیٰ: و اتموا الحج والعمرة لِلہ میں ''اتموا'' امر کا صیغہ ہے اور امر کے صیغے میں حکم دیا جائے تو وہ فرض ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عمرہ فرض ہے۔ اس کے علاوہ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ ابوزرین عقیلی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے والد اس قدر بوڑھے اور ضعیف ہیں کہ نہ حج و عمرہ کر سکتے ہیں اور نہ سفر۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

احجج عن ابیك و اعتمر

''تم اپنے والد کی طرف سے حج اور عمرہ کرلو۔''

امام مالکؒ کے نزدیک عمرہ سنت موکدہ ہے اور احناف کے نزدیک بھی یہی صحیح ہے کہ عمرہ سنت مؤکدہ ہے۔

عورت کا جہاد، حج مبرور ہے

مردوں کے لیے جب حج کا یہ مقام اور اہمیت ہے تو عورتوں کے سلسلے میں بھی حج

کی فضیلت و اہمیت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ عورت کے لیے حج کا وہی ثواب ہے
مردوں کو جہاد پر ملتا ہے۔

امام بخاریؒ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ تمام اعمال سے افضل ہے تو ہم کیوں نہ جہاد کیا کریں؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لكن افضل الجهاد حج مبرور

''تمہارے لیے سب سے افضل وہ حج ہے جس میں کوئی نازیبا حرکت نہ کی جائے۔''

اور ابن خزیمہؒ نے اپنی کتاب ''الصحیح'' میں روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا عورتوں پر بھی جہاد فرض ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

عليهن جهاد لا قتال فيه ..... الحج و العمرة

''عورتوں پر ایسا جہاد فرض ہے جس میں لڑائی نہیں ہے یعنی حج اور عمرہ۔''

اور نسائی نے سندِ حسن سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

جهاد الكبير و الضعيف و المرأة ..... الحج و العمرة

''بوڑھے، کمزور اور عورت کے لیے حج اور عمرہ ہی جہاد ہے۔''

اور ترمذیؒ نے ام معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کیا تو ہمارے پاس ایک اونٹ تھا جو ابو معقلؓ نے اللہ کی راہ میں دے دیا تھا۔ اور ہمارے ہاں بیماری پھیلی جس میں ابو معقلؓ وفات پا گئے۔ پھر جب نبی کریم ﷺ اپنے حج سے واپس تشریف لائے تو آپ نے فرمایا:

يا ام معقل! ما منعك ان تخرجي معنا؟

''اے ام معقلؓ تمہیں ہمارے ساتھ حج پر جانے سے کس نے روک دیا؟''

ام معقل کہتی ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم نے تیاری کرلی تھی کہ ابو معقل کا انتقال ہوگیا اور ہمارے پاس ایک ہی اونٹ تھا جس پر ابو معقل حج کرتے لیکن اس کے متعلق ابو معقلؓ نے وصیت کردی تھی کہ اسے اللہ کی راہ میں دے دیا جائے۔ اس پر نبی کریمؐ نے فرمایا:

فهلا خرجت عليه فان الحج فی سبیل الله؟ فاما اذا فاتتك هذه الحجة فاعتمری فی رمضان فانها كحجة

''تو تم اس پر سوار ہوکر حج کے لیے کیوں نہ گئیں کہ حج بھی تو فی سبیل اللہ ہے۔ بہرحال اب جب کہ تمہارا یہ حج فوت ہوگیا ہے تو تم رمضان میں عمرہ کرلینا کیوں کہ رمضان میں عمرہ کا ثواب حج کے برابر ہے۔''

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن اور غریب ہے۔

عورت کا حج کے سلسلے میں شوہر سے اجازت لینا

عورت پر واجب ہے کہ حج اور دوسرے نیک کاموں کے لیے جانے سے پہلے اپنے شوہر سے اجازت طلب کرے۔

اور خاوند کے لیے مستحب یہ ہے کہ اسے اجازت دے دے۔

بعض علماء کے نزدیک شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ بیوی کو حج پر جانے کی اجازت نہ دے کیوں کہ حج کرنا فوراً واجب نہیں ہے بلکہ زندگی میں کسی وقت بھی کیا جاسکتا ہے۔

حنفیوں کے نزدیک مرد اپنی بیوی کو حج سے نہیں روک سکتا، یہی قول امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ کا ہے کیوں کہ حج از روئے اسلام فرض ہے اور فرائض سے روکنے کا کسی کو حق نہیں۔

اگر خاوند حج کی اجازت نہ دے

اگر عورت شوہر سے حج پر جانے کی اجازت طلب کرے اور وہ اجازت نہ دے تو

عورت کو حق ہے کہ بلا اجازت روانہ ہوجائے کیوں کہ حج فرض ہے اور فرض کا ترک کرنا گناہ ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق (مجمع الزوائد)

''اللہ تعالیٰ کی نافرمانی یعنی گناہ کے کام میں کسی کی اطاعت نہیں ہے۔''

لیکن اس طرح بغیر اجازت جانے کا حق صرف اس صورت میں ہے جب عورت کے ساتھ جانے کے لیے کوئی محرم موجود ہو، راستہ پرامن ہو اور جس مال سے وہ حج کر رہی ہے وہ اس کا ذاتی ہو، شوہر کا نہ ہو۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ حالات ایسے ہوں کہ شوہر کو فی الحال اس کی خدمت کی ضرورت و احتیاط نہ ہو۔

چناں چہ اگر عورت کے پاس اپنا مال نہ ہو، جس سے حج کر سکے اور خاوند نے حج کے اخراجات دینے سے انکار کر دیا ہو تو پھر عورت پر حج فرض نہیں ہے کیوں کہ حج کی فرضیت کے لیے استطاعت شرط ہے اور خاوند اس بات کا مکلّف نہیں ہے کہ اس کو حج کے اخراجات بھی مہیا کرے کیوں کہ خاوند پر صرف ان اخراجات کی ذمہ داری ہے جو ضروریاتِ زندگی میں داخل ہیں مثلاً کھانا، کپڑا، رہائش اور علاج وغیرہ۔

اسی طرح اگر خاوند کو بیوی کی ضرورت ہو مثلاً وہ بیمار ہو یا بچے چھوٹے ہوں، جن کی دیکھ بھال ضروری ہو اور بیوی کی غیر حاضری میں وہ ان کی دیکھ بھال نہ کر سکتا ہو اور کوئی دوسرا شخص بھی موجود نہ ہو جو بیوی کی غیر حاضری میں ان تمام امور کو سر انجام دے سکتا ہو۔ ایسے حالات میں عورت پر حج اس وقت تک فرض نہیں ہے جب تک خاوند کو اس کی ضرورت رہتی ہے کیوں کہ ایسے حالات میں عورت کو فریضۂ حج ادا کرنے سے حکماً عاجز سمجھا جائے گا۔ دوسرے اکثر علماء کے نزدیک حج ایک ایسی عبادت ہے جس کو فوراً کرنا فرض نہیں ہے بلکہ اسے ملتوی کیا جاسکتا ہے لہٰذا اگر عورت کا حج ایک سال رہ گیا تو وہ آئندہ کسی سال کر سکتی ہے۔[1]

لیکن نفلی حج کے سلسلے میں تما علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو حج سے منع کر سکتا ہے۔ البتہ اگر عورت نے نفلی حج کرنے کی نذر مانی ہو تو پھر شوہر اسے منع کر سکتا

کیوں کہ نذر ماننے سے نفلی حج واجب ہو جاتا ہے اور واجب ہونے کی بنا پر یہ اس حج سے مشابہ ہوگیا جو اسلام کا رکن ہے۔

شافعیوں کے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ شوہر بیوی کو فرض حج سے بھی روک سکتا ہے کیوں کہ ایک تو اگر حج فرض ہے تو اس فرضیت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ فوراً حج کیا جائے بلکہ اس کی ادائیگی میں تاخیر جائز ہے اور دوسرے حضرت نافعؒ کی حدیث ہے جو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ایسی عورت کے بارے میں جو شادی شدہ اور صاحب مال ہو اور خاوند اسے حج کی اجازت نہ دیتا ہو، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لیس لها ان تنطلق الا باذن زوجها (دار قطنی)

''اسے حج پر نہیں جانا چاہیے الا یہ کہ اس کا شوہر اسے اجازت دے۔''

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی محمدؒ بن مجاشع ہے جو مجھول الحال ہے لہٰذا اس حدیث سے استناد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جمہور نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس حدیث میں جو حج کے لیے شوہر کی اجازت کو ضروری قرار دیا گیا ہے اس سے نفلی حج مراد ہے اور اس طرح تمام دلائل میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی فرض حج کی صورت میں اگر شوہر منع کرے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے بلکہ عورت کو اس کی اجازت کے بغیر ہی حج پر روانہ ہو جانا چاہیے کیوں کہ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق ''خالق کی نافرمانی کے کام میں کسی مخلوق کی فرماں برداری جائز نہیں''....اور نفلی حج کے لیے حدیث نافع کے مطابق شوہر کی اجازت کے بغیر جانا منع ہے۔

عورت کے سفر کے لیے محرم کی شرط

اکثر فقہاء نے عورت پر حج ہونے کی ایک شرط یہ بیان کی ہے کہ سفر میں اس کے ساتھ خاوند یا محرم ہو تو پر اس پر حج فرض ہے ورنہ نہیں۔ لیکن یہ شرط عورت کے سلسلے میں محض

---

(۱) الفقه الواضح للاستاذ محمدؒ بکر بن اسماعیل، ج ا

سفر حج کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت کے ہر ایسے سفر کے لیے ہے جو ایک مخصوص مسافت اور مخصوص وقت سے زائد ہو۔

اور اس شرط کے سلسلے میں علماء نے مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے:

۱- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے سنا ہے۔

لا يخلون رجل بإمرأة الا و معها ذو محرم ولا تسافر المرأة الا مع ذي محرم.

''کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ ملے مگر یہ کہ عورت کے ساتھ اس کا محرم ہو اور کوئی عورت سفر نہ کرے مگر یہ کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی محرم ہو۔''

یہ سن کر ایک شخص اٹھا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری بیوی حج کے لیے روانہ ہوگئی ہے اور میرا نام فلاں غزوہ میں جانے کے لیے درج ہو چکا ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

فانطلق فحج مع امرأتك (متفق عليه)

''یہ بات ہے تو تم جاؤ اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔''

۲- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تسافر المرأة ثلاثة الا و معها ذو محرم (متفق عليه)

''کوئی عورت تین دن کی مسافت کا سفر نہ کرے مگر یہ کہ اس کے ساتھ کوئی محرم ہو۔''

۳- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ:

نهى ان تسافر المرأة ثلاثة الا و معها ذو محرم

''عورت تین دن کی مسافت کا سفر کرے مگر یہ اس کے ہمراہ اس کا محرم ہو۔''

اس حدیث کو بخاری اور نسائی کے سوا باقی چاروں محدثین نے روایت کیا ہے۔

۴۔حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا یحل لامرأة تسافر مسیرة یوم و لیلة الا مع ذی محرم علیها.

(متفق علیه)

''کسی عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ ایک دن رات کی مسافت کا سفر کرے مگر یہ کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا شخص ہو جو اس کا محرم ہو۔''

ایک روایت میں: 'مسیرة یوم' (ایک دن کی مسافت) کا ذکر ہے اور ایک دوسری روایت میں 'مسیرة لیلۃ' (ایک رات کی مسافت) کے الفاظ ہیں اور ایک اور روایت میں ہے:

لا تسافر امرأة مسیرة ثلاثة ایام الا مع ذی محرم

''نہ کرے کوئی عورت تین دن کی مسافت کا سفر مگر اس صورت میں کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی محرم ہو۔''

یہ سب روایتیں مسند احمدؒ میں ہیں۔

اور ابوداؤدؒ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

لا تسافر بریدا (یعنی آدھے دن کا سفر نہ کرے)

تین دن رات کی مسافت سے مراد اوسط رفتار سے تین دن رات کی مسافت ہے۔ یعنی ایک ایسا اونٹ جس پر بوجھ لدا ہوا ہو اور دوران سفر جس طرح رک رک کر اور پڑاؤ کرتے ہوئے چلا جاتا ہے اسی انداز سے چل کر تین دن رات میں جتنی مسافت طے ہوتی ہے یہ مسافت بغیر محرم کے طے نہ کرے اور اس کا اندازہ تقریباً پچاسی کلو میٹر بنتا ہے۔ خواہ یہ مسافت گاڑی یا جہاز یا موٹر کار سے طے کی جائے۔

مدتِ سفر کے سلسلے میں اختلافِ احادیث کا سبب

علماء نے لکھا ہے کہ احادیث میں مدت سفر کے سلسلے میں جو مختلف الفاظ وارد ہوئے

ہیں اس کا سبب سوال کرنے والے اشخاص اور ان کے علاقوں کا اختلاف ہے۔ نیز جس حدیث میں تین دن رات مسافت کے سفر کی ممانعت آئی ہے اس میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ ایک دن رات کا یا نصف دن کا سفر بغیر محرم کے مباح ہے۔

امام بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ایک موقع پر سوال کیا گیا کہ کیا عورت بغیر محرم کے تین دن رات کی مسافت کا سفر کرسکتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ پھر کسی موقع پر کسی دوسرے شخص نے دریافت کیا کہ کیا عورت دو دن بغیر محرم کے سفر کرسکتی ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر کسی شخص نے دریافت کیا: کیا عورت بغیر محرم کے ایک دن سفر کرسکتی ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ اسی طرح نصف دن کے بارے میں پوچھا گیا ہوگا اور آپ نے فرمایا ہوگا: نہیں' چناں چہ ہر پوچھنے والے نے جو جواب سنا وہ دوسروں کو بتایا اور مختلف روایتوں میں جو ایک دوسرے سے مختلف مدت اور مسافت بیان ہوئی ہے اس کا سبب یہی اختلاف مواقع ہے چناں چہ کسی نے ایک مدت روایت کی اور کسی نے دوسری جب کہ فی الواقع یہ تمام روایات صحیح ہیں اور ان میں سے کسی روایت میں مدت یعنی کم از کم مدت کی تحدید نہیں کی گئی ہے اور نہ نبی کریم ﷺ کا مقصد اپنے ان اشارات میں مدتِ سفر کی تعیین کرنا تھا۔ لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر وہ مسافت جس پر لفظ سفر کا اطلاق ہوسکتا ہو عورت کے لیے بغیر شوہر یا محرم کے طے کرنا منع ہے خواہ وہ تین دن رات ہوں یا دو دن یا ایک دن ہو یا نصف دن یا کوئی اور مدت یا مسافت ہو۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تسافر امرأة الا مع ذی محرم

''عورت سفر نہ کرے مگر کسی محرم کے ہمراہ۔''

اس روایت میں مدت یا مسافت کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ سفر ہی سے منع کیا گیا ہے اور یہ روایت صحیح مسلمؒ میں باقی سب روایات کے آخر میں درج ہے اور اس میں محرم کے بغیر ہر ایسے سفر کی ممانعت کردی گئی ہے جس پر لفظ سفر کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

عورت کے ساتھ سفر میں شوہر یا محرم لازم ہونے کی شرط پر اختلافِ فقہاء

مذکورہ بالا احادیث اس بارے میں بالکل صریح ہیں کہ عورت کے لیے بغیر محرم کے سفر کرنا منع ہے، اس کے باوجود اس مسئلہ پر فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اور اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا مطلب و مفہوم متعین کرنے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

☆ حنفی مسلک:

احناف کے نزدیک یہ شرط تین دن یا تین دن سے زیادہ مسافت کے سفر کے لیے ہے، کیوں کہ جن احادیث میں تین کا عدد مذکور ہے وہ اپنے معنی میں متعین اور واضح ہیں اور باقی روایات غیر واضح اور مبہم ہیں لہٰذا جو متعین اور واضح ہے اس سے استناد کیا جائے گا۔

دوسرے، احناف کے نزدیک عورت تین دن کی مسافت کا سفر صرف شوہر یا محرم کے ساتھ کرسکتی ہے۔ کسی اور کے ساتھ مثلاً کسی ایک عورت یا ایک سے زائد عورتوں کے ساتھ یا قابل اعتماد ساتھیوں کے ہمراہ سفر کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ احادیث میں شوہر اور محرم کی شرط موجود ہے۔

☆ حنبلی مسلک:

حنبلیوں کے نزدیک اگر محرم موجود نہ ہو تو عورت پر حج فرض نہیں ہے اور ان کے نزدیک عورت کو دوسری عورت یا عورتوں یا قابل اعتماد ساتھیوں کے ساتھ حج کے لیے جانا جائز نہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کی سند وہ حدیث ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تحجن امرأة الا و معها ذو محرم (دار قطنی)

”کوئی عورت حج کے لیے ہرگز نہ جائے جب تک اس کے ساتھ محرم نہ ہو۔“

امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ اگر سفر حج کے دوران میں عورت کا محرم مرجائے اور وہ گھر

سے دور جاچکی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ تنہا روانہ ہوجائے اور حج کرلے کیوں کہ اس صورت میں اسے محرم کے بغیر سفر تو بہرحال کرنا پڑے گا لہٰذا اس کا حج کے لیے جانا بہتر ہے بشرطیکہ یہ حج فرض ہو، لیکن اگر یہ حج نفلی ہو تو اس صورت میں اس کا کسی شہر میں ٹھہرنا محرم کے بغیر سفر کرنے سے بہتر ہے بشرطیکہ ٹھہرنا ممکن ہو۔

لیکن امام احمدؒ سے ایک دوسری روایت یہ ہے کہ فرض حج کے سفر میں عورت کے لیے نہ محرم کی شرط ہے نہ شوہر کی یعنی وہ دوسری قابل اعتماد عورتوں کے ساتھ جاسکتی ہے۔(۱)

☆ امام نخعی، امام حسن بصری، امام سفیان ثوری، امام اسحٰق اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ کے اصحاب کے نزدیک عورت کے لیے محرم کا ہونا ''استطاعتِ حج'' میں داخل ہے، چناں چہ ان سب کے نزدیک کسی دوسری عورت کے ہمراہ یا قابل اعتماد ساتھیوں کے ہمراہ عورت کے حج پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

☆ شافعی مسلک:

شافعیوں کے نزدیک عورت کے حج کے لیے محرم کی موجودگی کسی صورت میں شرط نہیں ہے۔ عورت حج کے لیے کسی قابل اعتماد مسلمان آزاد عورت کے ساتھ جاسکتی ہے۔ چناں چہ شافعیوں کے نزدیک حج کے لیے عورت کو اگر شوہر یا محرم کی ہم سفری میسر نہ آسکے تو اس کے لیے جائز ہے کہ قابل اعتماد عورتوں کی جماعت یا کسی ایک ایسی عورت کے ہمراہ حج پر چلی جائے جس پر اسے اپنی ذات کے بارے میں مکمل اعتماد ہو۔ یہی قول امام شافعی علیہ الرحمہ کا ہے۔ لیکن یہ اجازت صرف فرض حج کے سلسلے میں ہے یعنی اس حج کے سلسلے میں جو دین اسلام کا رکن ہے۔ اور نفلی حج میں محرم یا خاوند کے بغیر جانے کی اجازت نہیں ہے اور شافعیوں کے مسلک میں اسی قول کو ترجیح حاصل ہے۔

امام نوویؒ نے شرح مسلمؒ میں لکھا ہے کہ عطاءؒ، سعید بن جبیرؒ، ابن سیرینؒ مالک بن انسؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک اور شافعیؒ کے قولِ مشہور کے مطابق حج کے سلسلے میں عورت کے

---

(۱) فتاویٰ شرعیہ: للشیخ حسین مخلوف

لیے محرم کا موجود ہونا شرط نہیں ہے بلکہ شرط یہ ہے کہ عورت کو اپنی ذات کے بارے میں حفاظت کی پوری تسلی ہو۔

امام نوویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمارے بعض علماء یعنی شافعی علماء، نے لکھا ہے کہ عورت قافلے کے ساتھ اکیلی بھی جاسکتی ہے بشرطیکہ اسے اپنی حفاظت کا اطمینان ہو۔

☆ مالکی مسلک:

مالکیوں کے نزدیک قابل اعتماد ساتھیوں کے ساتھ عورت حج کے لیے جاسکتی ہے اگر اس کے شہر اور مکہ کے درمیان ایک دن رات کی مسافت ہو۔ اور امام مالکؒ کا قول ہے کہ عورت حج کے لیے عورتوں کی جماعت کے ساتھ جاسکتی ہے۔

اور اگر عورت کو حج کے لیے ان صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بھی میسر نہ آئے تو پھر عورت پر حج فرض نہیں ہے۔

اسی طرح اگر حج کے سفر کا انتظام چھوٹی کشتی کے ذریعے سے ہو جس میں عورت کے لیے نہ پردہ ممکن ہو اور نہ ذاتی حفاظت کا اہتمام ممکن ہو تو ایسی صورت میں اس پر حج فرض نہیں ہے۔

لیکن اگر سفر بڑی کشتی کے ذریعہ ہو، جس میں علیحدہ حصہ ہو اور عورت محفوظ رہ سکتی ہو تو اگر عورت نے اسی راستے سے سفر کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو یہ سفر اس پر واجب ہوگا اور حج ساقط نہیں ہوگا۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ کے ایک قول کے مطابق جسے کرابیسیؒ نے نقل کیا ہے اگر راستہ محفوظ ہو تو عورت حج کے لیے تنہا بھی سفر کرسکتی ہے بشرطیکہ حج یا عمرہ واجب ہو یعنی نفلی نہ ہو۔

امام ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ عورت کے لیے سفر حج میں شوہر یا محرم کا ساتھ ہونا واجب نہیں ہے لہٰذا اگر شوہر یا محرم دونوں میں سے ایک بھی میسر نہ آئے تو وہ تنہا سفر کرسکتی ہے اور اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

بڑی عمر کی عورت کا سفر حج

بعض فقہاء نے جوان اور بوڑھی عورت میں سفر حج کے سلسلے میں فرق کیا ہے اور جوان عورت کے لیے سفر میں شوہر یا محرم ساتھ ہونے کی شرط لگائی ہے جب کہ بوڑھی عورت کے لیے یہ شرط نہیں ہے۔

لیکن جمہور علماء کے نزدیک اس سلسلے میں بوڑھی اور جوان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی مسلک احناف کا ہے۔

"سبل السلام" میں ہے کہ بوڑھی عورت کے لیے بغیر محرم کے سفر کرنا جائز ہے اور اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ بوڑھی عورت عام طور پر پرکشش نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ شوہر اور محرم کے بغیر جیسے چاہے سفر کرسکتی ہے لیکن جمہور نے اس دلیل کو رد کردیا ہے۔ کیوں کہ عورت خواہ بڑی عمر کی ہو اس کی طرف رغبت و شہوت کا امکان بہرحال باقی رہتا ہے اور ان کا قول ہے کہ "ہر گری پڑی چیز کا کوئی نہ کوئی اٹھانے والا ہوتا ہے۔"

امام مالکؒ کا قول بھی یہی ہے کہ بڑی عمر کی عورت ہر قسم کا سفر شوہر اور محرم کے بغیر کرسکتی ہے اور ابن دقیق العیدؒ کا قول بھی یہی ہے اور انھوں نے یہ دلیل دی ہے کہ حدیث میں جو سفر کی ممانعت ہے اس کا حکم عام ہے لیکن اس عام حکم کی تخصیص اس کے معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی گئی ہے یعنی خوفِ فتنہ جو ممانعت کی اصل علت ہے، لہٰذا جس صورت میں خوفِ فتنہ نہ ہو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہوگی۔

امام مالکؒ نے اپنی رائے کی تائید میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث: "لا صرورۃ فی الاسلام" (ابوداؤد) کو پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ "صرورۃ" سے مراد ایسی عورت ہے جس نے اس وجہ سے حج نہ کیا ہو کہ اس کے ساتھ حج پر جانے والا کوئی محرم نہ ہو۔ چناں چہ حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام میں عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ محرم نہ ہونے کی بنا پر وہ حج سے محروم رہے بلکہ اسے چاہیے کہ عورتوں کی جماعت کے ساتھ حج کے لیے چلی جائے۔ لیکن المنذریؒ نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی عمر بن ابی الخوار ہے جسے بہت سے ائمہ حدیث نے ضعیف کہا ہے۔

نفلی حج کے لیے سفر کا حکم

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ ہمارے علماء یعنی شافعیوں کے درمیان اس مسئلہ پر اختلاف ہے کہ کیا نفلی حج یا زیارت وتجارت جیسے غیر واجب سفر کے لیے عورت بغیر محرم کی جاسکتی ہے، چناں چہ بعض کا خیال ہے کہ جس طرح فرض حج کے سفر پر قابل اعتماد عورتوں کی جماعت کے ساتھ جانے کی اجازت ہے، اسی طرح نفلی حج اور زیارت وتجارت کا سفر بھی قابل اعتماد عورتوں کی جماعت کے ساتھ کرسکتی ہے۔ لیکن علماء کی اکثریت کا خیال ہے کہ نفلی حج اور تجارت وزیارت کا سفر محرم کے بغیر اور عورتوں کی جماعت کے ساتھ جائز نہیں۔

جو لوگ قابلِ اعتماد رفقاء کے ساتھ اور راستے کے پر امن ہونے کی صورت میں عورت کے لیے بغیر شوہر اور محرم کے سفر جائز قرار دیتے ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱- امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے: حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے آپ سے فاقے کی شکایت کی، پھر ایک شخص آیا اور اس نے آپ سے راستے میں راہزنوں کے موجود ہونے کی شکایت کی، اس پر نبی کریم ﷺ نے عدی بن حاتمؓ نے دریافت فرمایا:

> " یا عدی هل رأیت الحیرة" (اے عدی! تم نے مقام حیرہ دیکھا ہے؟)
>
> عدیؒ کہتے ہیں، میں نے کہا: میں نے حیرہ دیکھا تو نہیں البتہ مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:
>
> فان طالت بك الحیاة لترین الظعینة ترتحل من الحیرة حتی تطوف بالکعبة و لا تخاف الا الله.
>
> "اگر تمہاری زندگی طویل ہوئی تو تم ضرور دیکھوگے کہ ایک ہودج حیرہ[۱] سے سفر کرتا ہوا پہنچتا ہے اور اس میں سفر کرنے والی عورت بیت اللہ کا طواف کرتی ہے اور اسے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا خوف نہیں ہوتا۔"

---

(۱) حیرہ کوفہ کے قریب ایک قصبہ کا نام ہے۔

اور ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: "تؤم البیت لاجوار معها" (اس میں بیٹھی ہوئی عورت بیت اللہ کے حج کا قصد کرے گی اس طرح کہ اس کے ساتھ کوئی نہ ہوگا۔ یعنی تنہا سفر کرے گی)۔

اس حدیث سے علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دین اسلام کی تعریف کرتے ہوئے اور اسلام کی روشنی پھیلنے کا ذکر فرماتے ہوئے یہ خبر دی ہے کہ اس دور میں اس قدر امن ہوگا کہ ایک عورت تنہا ''حیرہ'' سے حج کے لیے روانہ ہوگی۔ تو گویا عورت کا تنہا سفر حج پر روانہ ہونا جائز ہے۔

۲- ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ (آل عمران:۹۷)

''لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔''

اس آیت کریمہ میں لفظ ''الناس'' وارد ہوا ہے جس کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے اور استطاعت سواری اور زادِ راہ کے مہیا ہونے سے حاصل ہو جاتی ہے، لہٰذا عورت پر زاد و راحلہ کی موجودگی میں حج فرض ہے۔ علاوہ ازیں محرم یا شوہر کے ساتھ ہونے کی غرض یہ ہے کہ عورت فتنے سے محفوظ رہے اور عورتوں کی جماعت کی ہمراہی قابل اعتماد ساتھیوں کے ساتھ ہونے سے یہ غرض حاصل ہو جاتی ہے۔

اس دلیل کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آیت کریمہ میں جو حکم ہے اس کا اطلاق عورت پر اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک عورت کے ساتھ شوہر یا محرم نہ ہو۔

محرم اور شوہر کے بغیر سفر حج پر جانے کے جواز میں یہ بھی دلیل دی گئی ہے کہ ازواجِ مطہرات نے حضرت رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت عمر کی اجازت سے جو آخری حج کیا اس میں ان کے ہمراہ کوئی محرم نہیں تھا اور حضرت عمرؓ نے حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کو ازواجِ مطہرات کے ہمراہ بھیجا تھا اور حضرت عثمان یہ منادی کرتے جاتے تھے کہ خبردار! کوئی شخص امہات المومنین کے قریب نہ جائے اور نہ ان کی طرف

دیکھے اور اس سفر حج میں امہات المومنین ھودج میں سوار تھیں جو اونٹ پر کسا ہوا تھا اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن کا یہ حج نفلی تھا کیوں کہ فرض حج سب امہات المومنین سوائے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نبی کریم ﷺ کے ساتھ کرچکی تھیں۔

ان علماء کی اس دلیل کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عثمان بن عفان اور عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما امہات المومنین کے محرم تھے کیوں کہ امہات المومنین مومنوں پر حرام کردی گئی ہیں یعنی وہ سب مومنوں کی مائیں ہیں۔

۴- ابن حزمؒ نے اپنے اس مسلک کے لیے کہ "عورت کو محرم اور شوہر کے بغیر حج کا سفر کرنا جائز ہے بشرطیکہ قابل اعتماد ساتھی میسر ہوں اور راستہ پرامن ہو" اس حدیث کو دلیل بنایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے جس نے اپنا نام کسی غزوے میں لکھوا دیا تھا لیکن پھر جب اس نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میری بیوی حج پر جا رہی ہے تو آپ نے اس سے فرمایا: فانطلق فحج مع امرأتك "جاؤ تم اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو" کیوں کہ اس موقع پر جب اس شخص نے آپ سے عرض کیا کہ میری بیوی حج پر جا رہی ہے تو آپ نے اس کی بیوی کے تنہا حج پر جانے کو ناپسند نہیں فرمایا تھا۔

لیکن اس بات کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ محرم یا شوہر کا ساتھ ہونا اگر عورت کے حج کے لیے شرط نہ ہوتا تو آپ اس کے شوہر کو یہ حکم نہ دیتے کہ جاؤ جا کر اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو اور جہاد کو جس میں تم نے نام لکھا رکھا ہے چھوڑ دو۔

۵- امام شافعیؒ نے کتاب "الام" میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس سلسلے میں جو احادیث مروی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ "استطاعتِ سبیل" سے مراد زادِ سفر اور سواری ہے لہٰذا اگر کسی عورت کو یہ دونوں چیزیں میسر ہوں اور راستہ پرامن اور محفوظ ہو اور اسے قابل اعتماد عورتوں کی جماعت کی ہمراہی میسر ہو تو میرے نزدیک اس پر حج فرض ہے خواہ اس کے ہمراہ کوئی محرم نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے حج فرض ہونے کے سلسلے میں صرف اس شخص کو مستثنیٰ کیا ہے جسے زاد سفر اور سواری میسر نہ آئے۔ البتہ اگر ساتھ جانے کے لیے قابل اعتماد آزاد مسلم ان عورت یا عورتوں کی جماعت میسر نہ ہو تو پھر ایسے مردوں کی ہمراہی

میں سفر حج نہ کرے، جن کے ساتھ نہ کوئی عورت ہو اور نہ ان میں کوئی مرد اس عورت کا محرم ہو۔

امام شافعیؒ نے کتاب "الام" میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہمیں ام المومنین حضرت عائشہ حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے بھی ایسی روایات پہنچی ہیں جن سے ہمارے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ عورت کو سفر حج کے لیے محرم میسر نہ آئے تب بھی وہ دوسری عورتوں کے ساتھ سفر کرسکتی ہے۔ مسلم بن جریج نے ہمیں بتایا کہ عطاءؒ سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی عورت کے ساتھ محرم یا شوہر نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ایسے خادم لڑکے اور خادمائیں ہوں جو دورانِ سفر اس کے قیام و طعام اور اترنے چڑھنے اور حفاظت کا انتظام کرسکتے ہوں تو کیا وہ حج کے لیے جاسکتی ہے؟ عطاءؒ نے کہا: ہاں، اسے حج کرنا چاہیے۔

مذکورہ بالا اقوال کا خلاصہ

اب تک جو کچھ بیان ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت حج کے لیے اپنے شوہر یا محرم کے ساتھ جاسکتی ہے لیکن اگر شوہر یا محرم میسر نہ ہوں تو قابل اعتماد عورتوں کی جماعت کے ساتھ سفر کرسکتی ہے اور اگر عورتوں کی جماعت بھی میسر نہ ہو تو ایک قابل اعتماد عورت کے ساتھ سفر کرسکتی ہے اور اگر ایک بھی ثقہ عورت میسر نہ ہو تو ایسے مرد ہمراہیوں کے ساتھ حج پر جاسکتی ہے جن کی موجودگی میں فتنے سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو۔

بعض علماء کے نزدیک صرف راستہ کا پرامن ہونا اور ایسے ساتھیوں کی موجودگی کافی ہے جن کے ساتھ ہوتے ہوئے فتنہ سے محفوظ رہ سکے خواہ یہ حج نفلی ہو یا سفر زیارت ہو یا سفر تجارت۔

لیکن پہلی رائے پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ اگر عورت کو حفظِ ذات کا اطمینان نہ ہو تو پھر اس کے لیے سفر کرنا جائز نہیں ہے، یہ سفر طویل مسافت کا ہو یا مختصر ہو۔

اگر کوئی عورت بغیر محرم کے حج کرلے؟

جو لوگ شوہر یا محرم کا ہمراہ ہونا عورت کے حج کے لیے شرط قرار دیتے ہیں ان کے

نزدیک اگر کوئی عورت اس شرط کی خلاف ورزی کرے اور بغیر شوہر یا محرم کے حج کر لے تو اس کے حج کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا حج ہو جائے گا۔

امام ابن تیمیہؒ نے ''سبل السلام'' میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر استطاعت کے یا کوئی عورت بغیر محرم کے حج کرے تو ان دونوں کا حج صحیح ہوگا۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جس پر عدم استطاعت کی وجہ سے حج فرض نہیں تھا، مثلاً مریض یا نادار یا محتاج جس کے پاس سفر کا زاد و راحلہ نہ ہو، یا جس کا راستہ رہزنوں سے محفوظ نہ ہو، یا جسے سفر حج پر جانے کے لیے محرم یا شوہر میسر نہ ہو، اگر یہ کسی طرح مکہ مکرمہ پہنچ جائیں اور حج کر لیں تو ان کا حج صحیح ہوگا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ان حالات میں حج کرنے والوں میں وہ لوگ جو زائد مشقت برداشت کر کے یعنی پیدل چل کر حج کے لیے جائیں گے ان کا ثواب زیادہ ہوگا اور جو راستے سے مانگتے ہوئے اور دستِ سوال دراز کرتے ہوئے حج کے لیے پہنچیں گے وہ ایک برے کام کا ارتکاب کریں گے اور گناہ گار ہوں گے۔

اسی طرح عورت اگر بغیر محرم کے حج کے لیے جائے گی تو گناہگار ہوگی۔ ان کا حج صحیح تو اس لیے ہو جائے گا کہ پہنچ جانے کے بعد یہ پوری طرح حج کرنے کے اہل ہیں اور جس گناہ کا ارتکاب انہوں نے کیا ہے اس کا تعلق راستے سے ہے نہ کہ اصل حج سے۔

''المغنی'' میں ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جسے حج کی استطاعت نہ ہو زائد مشقت برداشت کر کے سواری اور زادِ راہ کے بغیر حج کے لیے روانہ ہو جائے تو اس کا حج صحیح ہوگا اور اسے اس کا اجر ملے گا۔

محرم کون ہے؟

عورت کا ایسا محرم جس کے لیے عورت کو دیکھنا اور اس کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا اور سفر کرنا جائز ہے، ہر وہ شخص ہے جس سے اس عورت کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے لیکن یہ حرمتِ نکاح کسی جائز سبب کی وجہ سے ہو اور عورت کے احترام کی بنا پر ہو (سزا وغیرہ کی بنا

پر نہ ہو)۔

ا- ابدی حرمت سے مراد وہ حرمت ہے جو نسب کی بنا پر یا رضاعت کی بنا پر یا مصاہرت (دامادی کے رشتے) کی بنا پر ہو۔

نسب کی بنا پر حرمت: مثلاً باپ، بیٹا، بھائی، بھتیجا اور بھانجا۔

رضاعت کی بنا پر حرمت: مثلاً رضاعی بھائی یا رضاعی بھائی کا بیٹا یا رضاعی بہن کا بیٹا وغیرہ۔

حرمتِ مصاہرت: مثلاً شوہر کا باپ یا شوہر کا بیٹا۔

ابدی حرمت کی قید سے بہنوئی، پھوپھا اور خالو محرم نہیں رہے کیوں کہ ان کی حرمت ابدی نہیں ہے بلکہ یہ اگر اپنی موجودہ بیویوں کو طلاق دے دیں تو اس عورت سے نکاح کر سکتے ہیں، جس کے یہ پہلے بہنوئی، پھوپھا اور خالو تھے۔ لہٰذا یہ محرم نہیں ہیں۔

امام مالکؒ محرم کے سلسلے میں اس ساری بات سے اتفاق کرتے ہیں سوائے خاوند کے بیٹے کے، ان کے نزدیک خاوند کے بیٹے کے ساتھ سفر کرنا مکروہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قرنِ اول کے بعد لوگوں کے مزاج میں فساد پیدا ہوگیا ہے اور بہت سے لوگ باپ کی بیوی سے اس قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتے جیسی کراہت وہ محرم عورتوں سے محسوس کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں عورت باعثِ فتنہ ہے لہٰذا سوائے ان محرم عورتوں کے جن کے لیے نسبی طور پر اللہ تعالیٰ نے دلوں میں کراہت پیدا کردی ہے باقی عورتوں کی وجہ سے دلوں میں فساد پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔

لیکن کتاب وسنت کے نصوص امام مالکؒ کی بات کی تائید نہیں کرتے واللہ اعلم۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کافر باپ کو بھی اس سے مستثنیٰ کیا ہے یعنی ان کے نزدیک کافر باپ مسلمان بیٹی کا محرم نہیں ہے اس لیے کہ اس کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنی بیٹی کو دینِ اسلام سے ورغلانے اور گمراہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کے معنی یہ

(ا) سورہ بقرہ کے شروع میں اس گروہ کی طرف اشارہ ہے لیکن اس وقت تک یہ گروہ پوری طرح سامنے نہیں آیا تھا۔ اس صورت میں یہ بے نقاب ہوکر سامنے آ گیا ہے۔ اس گروہ کا نظریہ بعینہٖ وہی ہے جو آج وحدتِ ادیان کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

ہوئے کہ تمام کافر رشتہ دار مسلمان عورت کے محرم نہیں ہو سکتے کیوں کہ یہ علت کہ ''ان کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنی رشتہ دار مسلمان عورت کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے'' ان میں بھی پائی جاتی ہے۔

محرم کا عاقل بالغ ہونا ضروری ہے

محرم جو عورت کے ساتھ سفر کرے اس کے لیے یہ شرط ہے کہ عاقل بالغ ہو اور معاملات کو احسن طریقہ سے طے کرسکتا ہو۔

اگر کوئی محرم بالغ تو ہو لیکن صاحب عقل نہ ہو اور معاملات کو اچھی طرح طے نہ کرسکتا ہو تو وہ اس قابل نہیں ہے کہ عورت اس کے ساتھ سفر کرے۔

عورت کے ساتھ سفر حج پر جانے والے محرم کے اخراجات

جو محرم سفر حج پر عورت کے ساتھ جائے گا اس کے تمام اخراجات حج کرنے والی عورت کے ذمہ ہوں گے، یہ قول امام احمدؒ کا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ محرم اس بنا پر جا رہا ہے کہ وہ عورت حج پر جا رہی ہے اور وہ اس کے ساتھ جا رہا ہے لہٰذا اس کے اخراجات اس عورت کے ذمہ ہوں گے اور اس کو صاحبِ استطاعت جب سمجھا جائے گا جب وہ اپنے اور اپنے محرم یعنی دونوں کے لیے زاد و راحلہ کا انتظام کرسکتی ہو۔ لیکن اگر اس کے باوجود کہ کوئی عورت محرم کے اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہو مگر کوئی محرم اس کے ساتھ سفر حج پر جانے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر یہ عورت اس عورت کے حکم میں ہے جسے محرم میسر نہ ہونے کی بنا پر استطاعتِ حج نہ ہو کیوں کہ محرم کے بغیر عورت حج کی قدرت نہیں رکھتی۔

ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھا ہے:

> رہا یہ مسئلہ کہ اگر کوئی عورت اپنے محرم سے حج پر جانے کے لیے کہے تو کیا اس محرم پر اس کی یہ دعوت قبول کرنا لازم ہے؟
>
> اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک کے مطابق اس محرم پر اس کی یہ فرمائش قبول کرنا لازم ہے، لیکن دوسری روایت کے مطابق اس کے لیے لازم

نہیں کہ اس کی یہ فرمائش ضرور قبول کرے۔

ابن قدامہؒ نے لکھا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ محرم پر لازم نہیں ہے کہ ضرور اس کی اس فرمائش کو قبول کرے اور اس کے ساتھ حج پر جائے کیوں کہ حج میں شدید مشقت اور بے حد تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے تو کسی پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی خاطر یہ مشقت اور تکلیف ضرور برداشت کرے اور نہ محرم پر یہ لازم ہے کہ اس کی رشتہ دار عورت بیمار ہو تو اس کی طرف سے حج بدل کرے۔

طلاق یا وفات کی عدت گزارنے والی عورت کا حج

اگر کسی عورت کو حج کے مہینوں میں طلاق ہو جائے یا اس کے خاوند کا انتقال ہو جائے تو اس کے لیے مناسب نہیں کہ اسی سال حج کے لیے جائے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر عدت پوری ہونے تک گھر میں ٹھہرنا واجب کر دیا ہے۔ لہٰذا سوائے ضروری کاموں کے اسے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے اور اگر کسی ضروری کام سے باہر نکلنا بھی پڑے تو کم سے کم وقت باہر ٹھہرے۔ کیوں کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا يَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ

(الطلاق:۱)

”(زمانہ عدت میں) نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں۔“

اور عدت تین ”قروء“ سے پوری ہوتی ہے اور قروء سے مراد تین حیض یا تین طہر ہیں یا اگر عورت حاملہ ہو تو وضع حمل سے عدت پوری ہو جاتی ہے۔

یہ عدت اس عورت کی ہے جسے طلاق دی گئی ہو۔

لیکن وہ عورت جس کا شوہر وفات پا گیا ہو اور وہ حاملہ بھی نہ ہو تو اس کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ الَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَ يَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ

اَشۡهُرٍ وَّ عَشۡرًاO (البقرۃ:۲۳۴)

''تم میں سے جو لوگ مر جائیں ان کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں۔''

دراصل یہ چار مہینے دس دن عورت کے لیے سوگ کی مدت ہے جو وہ اپنے شوہر کی وفات پر مناتی ہے۔

قرطبیؒ نے ارشادِ باری تعالیٰ: لا تخرجوھن من بیوتھن کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جب تک عورت عدت میں ہے خاوند اسے اپنے گھر سے نہیں نکال سکتا جس میں وہ اس وقت رہتی تھی جب اس کی منکوحہ بیوی تھی اور نہ عورت کو خود اس گھر سے باہر جانے کی اجازت ہے کیوں کہ اس سلسلے میں اس پر خاوند کا حق عائد ہوتا ہے البتہ کسی حقیقی ضرورت کی بنا پر گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ لہٰذا اگر بلا ضرورت گھر سے باہر جائے گی تو گناہگار ہوگی لیکن عدت ٹوٹے گی نہیں۔ اور یہ حکم ہر مطلقہ عورت کے لیے یکساں ہے خواہ اسے طلاق رجعی ملی ہو یا بائن یا مغلظہ۔ بہرحال اسے گھر سے باہر جانا منع ہے اور یہ پابندی مرد کے سلسلۂ نسب کی حفاظت کے لیے لگائی گئی ہے۔

طلاق کی قسمیں

طلاق کی دو قسمیں ہیں:

۱- رجعی: جس کے معنی یہ ہیں کہ طلاق دینے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اگر چاہے تو عدت کے دوران طلاق سے رجوع کر کے اسے پھر بیوی بنا لے۔

۲- طلاق بائن: یعنی بینونۃ کبریٰ: اور مغلظہ سے مراد وہ تیسری طلاق ہے جو دو طلاقوں کے بعد دی جائے اور جس کے بعد میاں بیوی کے درمیان مکمل جدائی واقع ہو جائے۔

☆ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جس عورت کو طلاق رجعی ملی ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اسی گھر میں رہے جس میں وہ طلاق کے وقت رہتی تھی اور اس کو عدت پوری ہونے سے پہلے اس گھر سے نکلنا جائز نہیں خواہ شوہر کی اجازت سے ہی کیوں نہ نکلے۔ البتہ کسی ضرورت

کے ماتحت باہر جاسکتی ہے۔

☆ امام شافعیؒ کے نزدیک بھی طلاق رجعی کی صورت میں مطلقہ عورت کے لیے گھر سے نہ دن میں نکلنا جائز ہے اور نہ رات کے وقت۔

☆ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بھی طلاق رجعی کی صورت میں دن کو بھی نکلنا جائز نہیں اور رات کو بھی۔

☆ امام مالکؒ کے نزدیک طلاق رجعی والی عورت دن کے وقت ضروری حاجتوں کے لیے نکل سکتی ہے۔لیکن رات کے وقت اس کو گھر میں رہنا ضروری ہے۔

طلاق مغلّظہ کی صورت میں گھر سے نکلنے نہ نکلنے کا حکم

اگر عورت کو طلاقِ مغلظہ دی گئی ہو یعنی دو طلاقیں دینے کے بعد تیسری طلاق بھی دے دی گئی ہو تو اس صورت میں گھر سے نکلنے کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سوائے انتہائی ضروری کام کے نہ دن کو گھر سے نکل سکتی ہے نہ رات کو، بلکہ اگر شوہر نے اجازت دے دی ہو پھر بھی نکلنا جائز نہیں۔

امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دن کے وقت نکل سکتی ہے، رات کو نہیں۔

عدتِ وفات گزارنے والی عورت کے گھر سے نکلنے کے بارے میں حکم

☆ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جس عورت کا شوہر وفات پا گیا ہو اور وہ عدت میں ہو ایسی عورت دن کے وقت گھر سے نکل سکتی ہے لیکن رات کو نکلنا جائز نہیں اور یہی مسلک جمہور علماء کا ہے۔

طلاق یا وفات کی عدت گزارنے والی عورت کے حج پر جانے کے بارے میں حکم

☆ ہمارے نزدیک عدت گزارنے والی عورت، خواہ طلاق رجعی کی عدت گزار رہی

ہو یا طلاق بائن کی یا شوہر کے وفات کی، اس کے لیے مناسب نہیں کہ عدت کے دوران حج کے لیے جائے۔ تاہم اس مسئلہ پر بھی فقہاء کے درمیان بعض پہلوؤں پر اختلاف ہے جو درج ذیل ہے:

☆ حنفی مسلک:

حنفیوں کے نزدیک عورت کے لیے حج پر جانے کے جواز کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس پر عدت کی وجہ سے ایک جگہ قیام کرنا واجب نہ ہو لہٰذا اگر عورت شوہر کی موت کی بنا پر یا طلاق کی وجہ سے عدت میں ہو تو وہ حج کے لیے نہیں جاسکتی۔

☆ مالکی مسلک:

مالکیوں کے نزدیک بھی عورت اگر طلاق یا شوہر کی وفات کی بنا پر عدت میں ہو تو اس کے لیے اس گھر میں ٹھہرنا واجب ہے جہاں وہ عدت گزار رہی ہے اور حج کا احرام باندھنا اس کے لیے جائز نہیں کیوں کہ ایسا کرنے کی صورت میں اسے وہ گھر چھوڑنا پڑے گا جہاں وہ عدت گزار رہی ہے جب کہ اس کا اس گھر میں ٹھہرنا واجب ہے۔ لیکن اگر کوئی عورت دوران عدت حج کا احرام باندھ کر روانہ ہوجائے تو اس کا حج صحیح ہوگا اگرچہ گناہ گار ہوگی۔ احرام باندھنے کے بعد اسے چاہیے کہ حج کے تمام مناسک پورے کرے اور اس گھر میں نہ ٹھہرے جہاں عدت گزار رہی تھی۔

☆ حنبلی مسلک:

ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک عورت اگر وفات کی عدت گزار رہی ہے تو وہ حج کے لیے نہ جائے لیکن اگر طلاق مغلظہ کی عدت گزار رہی ہے تو وہ حج کے لیے جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ وفات کی عدت میں عورت کے لیے گھر میں ٹھہرنا واجب ہے اور طلاق مغلظہ کی عدت میں ٹھہرنا واجب نہیں ہے۔

(۲) یہ تمہیدی بحث بیشتر استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے۔

☆ شافعی مسلک:

کتاب ''الام'' میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عدت گزارنے والی عورتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (الطلاق:۱)

''اور نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں۔''

اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء نے کہا ہے کہ عورت اگر کوئی ایسا جرم کرے، جس پر حد لازم آتی ہو اسے اجرائے حد کے لیے گھر سے باہر جانا ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کردی ہے کہ عورت پر اگر کسی حق کی ادائیگی واجب ہو تو اس کو ادا کرنے کے لیے عدت کی حالت میں اسے گھر سے باہر جانے کی اجازت ہے لیکن اگر وہ ادائے حق کے لیے نہیں نکل رہی بلکہ اس کا نکلنا بدکاری کے لیے ہو تو اس کا یہ نکلنا ناجائز نکلنے سے بھی زیادہ گناہ کا باعث ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی دلیل طلب کرے تو دلیل یہ ہے کہ علماء کے درمیان اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ عدت گزارنے والی عورت ادائیگی حق اور اجراء حد کے لیے باہر جاسکتی ہے اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کو بدکلامی کی بنا پر گھر سے نکالا جاسکتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیسؓ کو نکلنے کا حکم دیا تھا۔

چناں چہ قرآن مجید، سنت نبویؐ بلکہ اجماع سے بھی یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کو اگرچہ غیر ضروری امور کے لیے گھر سے نکلنا منع ہے تاہم ایسے امور جو اس پر لازم ہیں اور جن کو ترک نہیں کیا جاسکتا ان سے اسے منع نہیں کیا جاسکتا۔ اور حج بھی انہی امور میں ہے جو اس پر لازم ہیں کیوں کہ وہ صاحب استطاعت ہے، بدن کے لحاظ سے بھی اور مال کے لحاظ سے بھی اور ساتھ جانے کے لیے اس کو قابلِ اعتماد عورت یا عورتوں کی رفاقت بھی میسر ہے۔ لہٰذا اسے حج پر جانے سے منع نہیں کیا جاسکتا۔

اگر محرم راستے میں مر جائے

اگر عورت شوہر یا محرم کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئی اور شوہر یا محرم اثناء راہ میں ہلاک ہوگیا تو اس صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا حج کو جاری رکھے یا لوٹ آئے اور واپس گھر آ کر اپنی عدت وفات پوری کرے؟

☆ شافعیوں کے نزدیک محرم یا شوہر کی وفات اگر عورت کے احرام باندھنے کے بعد واقع ہوئی ہے تو اس پر لازم ہے کہ حج کو پورا کرے۔ بشرطیکہ اسے اپنی ذات کے بارے میں شر و فساد سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو۔ اس صورت میں اس کے لیے احرام کھول کر حلال ہونا حرام ہے۔ لیکن اگر فتنہ سے محفوظ رہنے کا اطمینان نہ ہو یا شوہر اور محرم کی موت عورت کے احرام باندھنے سے پہلے وقع ہوگئی ہو تو احرام کھولنا اور گھر لوٹنا واجب ہے۔

☆ اور ''المغنی'' میں ابن قدامہؒ نے لکھا ہے کہ اگر عورت کا محرم راستے میں مر جائے تو امام احمدؒ کے نزدیک اگر وہ گھر سے زیادہ دور جا چکی ہے تب تو سفر جاری رکھے اور حج پورا کرے۔ یعنی اگر عورت شوہر کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئی اور راستے میں شوہر کا انتقال ہوگیا تو اگر جس شہر سے روانہ ہوئی تھی وہ قریب ہے پھر تو گھر واپس لوٹ آئے لیکن اگر اپنے شہر سے زیادہ دور جا چکی ہے تو اسے اختیار ہے، چاہے تو قابل اعتماد رفقاء سفر کے ساتھ سفر جاری رکھے اور حج کرے اور چاہے تو کسی ایسے شہر میں عدت گزارنے کے لیے ٹھہر جائے جہاں اسے فتنہ سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو۔

احرام باندھتے وقت

پاک صاف ہونا اور غسل کرنا

چوں کہ حج ایک عظیم عبادت ہے۔ لہٰذا جو شخص حج یا عمرے کا احرام باندھنے کا ارادہ کرے اس کے لیے مستحب ہے کہ احرام شروع کرنے سے پہلے اس کی تیاری اور اہتمام کرے۔

چناں چہ احرام کا ارادہ کرنے والے کے لیے مناسب یہ ہے کہ اپنے ناخن اور مونچھیں ترشوائے، زیر ناف بال صاف کرے، بغلوں کے بال مونڈے اور سر میں کنگھی کرے اور سر کے بال منڈوانے کا عادی ہو تو سر منڈوائے۔ تمام مسالک فقہ کے نزدیک یہ تمام اعمال مستحب ہیں، حج کے رکن یا فرض نہیں ہیں۔

یہ تمام امور عورت کے لیے اسی طرح مستحب ہیں، جس طرح مرد کے لیے، چناں چہ عورت کے لیے بھی احرام سے پہلے ناخن تراشنا، زیر ناف بال صاف کرنا، بغلوں کے بال مونڈنا اور سر میں کنگھی کرنا مستحب ہے۔

غسل کرنا مستحب ہے

احرام باندھنے سے پہلے غسل کرنا مستحب ہے۔ چناں چہ ترمذی میں ہے کہ خارجہ ابن زید بن ثابت رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ میرے باپ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''میں نے دیکھا ہے کہ احرام کی تیاری کے وقت نبی کریم ﷺ نے سب سے الگ ہو کر غسل فرمایا۔''

حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کہ جب کوئی شخص احرام باندھنے اور مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کرے تو اس کے لیے غسل کرنا اچھی بات ہے۔

یہ روایت بزارؒ، دار قطنیؒ اور حاکمؒ نے نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔

اکثر فقہاء نے جن میں طاؤسؒ، نخعیؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور حنفی و حنبلی علماء شامل ہیں، احرام باندھنے کا ارادہ کرنے والے کے لیے احرام باندھنے سے پہلے غسل کرنا مستحب قرار دیا ہے۔

حیض و نفاس والی عورت کے لیے بھی احرام سے پہلے غسل کرنا مستحب ہے

حیض یا نفاس کی حالت میں اگر کوئی عورت حج یا عمرے کا احرام باندھے تو اس کے لیے بھی مستحب یہی ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے غسل کرے۔ چناں چہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے ہاں مقام ''شجرہ'' میں محمدؒ بن ابی بکر پیدا ہوئے اور آپ کو نفاس شروع ہوگیا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ حضرت اسماء کو ہدایت کریں کہ وہ غسل کریں اور احرام باندھ لیں۔ (مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی اور دارمی)۔

امام نوویؒ نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے حیض و نفاس والی عورت کے احرام کا صحیح ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیض و نفاس والی عورت کے لیے احرام کے وقت غسل کرنا مستحب ہے۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ نفاس اور حیض کی حالت میں عورت کو احرام سے پہلے غسل کے لیے کہا جائے لیکن ہمارے یعنی شافعیوں کے نزدیک اور امام مالکؒ اور ابو حنیفہؒ اور جمہور کے نزدیک یہ غسل مستحب ہے۔ جب کہ حسن بصریؒ اور اہل ظاہر کے نزدیک واجب ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو باوجودیکہ وہ نفاس کی حالت میں تھیں غسل کرنے کا بطور خاص حکم دیا تھا۔

نیز امام احمدؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نفاس اور حیض والی عورت غسل کرے اور احرام باندھ لے اور تمام مناسب حج پورے کرے سوائے طواف کے۔ وہ طوافِ بیت اللہ نہیں کرسکتی جب تک کہ

پاک نہ ہو جائے۔

اس مسئلہ میں علماء کے مابین اختلاف ہے کہ اگر احرام کی تیاری کے وقت کسی شخص کو پانی میسر نہ آئے تو آیا وہ تیمّم کرے یا نہ کرے؟

☆ حنفیوں اور مالکیوں کے نزدیک پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمّم کرنا مستحب نہیں ہے کیوں کہ اس غسل کی غرض و غایت نظافت اور صفائی ہے اور تیمّم سے نظافت اور صفائی حاصل نہیں ہوسکتی لہٰذا تیمّم کرنا درست نہیں۔

☆ شافعیؒ اور حنبلی کہتے ہیں کہ تیمّم کرنا مستحب ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ تیمّم فرائض میں وضو کا بدل اور قائم مقام ہے تو اسے مستحبات میں بدرجہ اولیٰ قائم مقام ہونا چاہیے۔

ابن قدامہؒ نے ''المغنی'' میں لکھا ہے کہ یہ غسل سنت ہے لہٰذا پانی نہ ملنے کی صورت میں اس کی جگہ تیمّم مستحب نہیں۔ غسل واجب اور غسل مسنون میں یہ فرق ہے کہ غسل واجب کا مقصد نماز کا درست کرنا ہوتا ہے اور تیمّم اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے لیکن غسل مسنون کا مقصد نظافت اور صفائی حاصل کرنا اور بدبو کو ختم کرنا ہے اور یہ مقصد تیمّم سے حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ اس سے تو پراگندگی اور گرد و غبار میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

احرام باندھتے وقت عورت کا خوشبو لگانا

اس بارے میں درج ذیل احادیث وارہوئی ہیں:

۱- ابوداؤدؒ اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ''نبی کریم ﷺ جب احرام باندھتے تھے تو میں اس وقت میسر آنے والی بہترین خوشبو آپؐ کے لگایا کرتی تھی۔''

۲- اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''جب نبی کریم ﷺ احرام باندھنے کا ارادہ کرتے تو اس وقت میسر آنے والی بہترین خوشبو استعمال فرماتے تھے جس کے روغن کی چمک مجھے آپ کے سر اور داڑھی میں بعد ازاں بھی نظر آتی۔''

۳- اور مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ

میں نبی کریم ﷺ کے احرام باندھنے سے پہلے بھی آپ کے خوشبو لگایا کرتی تھی اور احرام کھولتے وقت بھی طواف سے پہلے آپ کے خوشبو لگایا کرتی تھی۔

۴- اور مسلمؒ میں بھی ہے کہ عروہ بن زبیرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ جب نبی کریم ﷺ احرام باندھتے تھے تو آپ انھیں کون سی خوشبو لگایا کرتی تھیں؟ تو انھوں نے فرمایا: بہترین خوشبو جو موجود ہوتی۔

۵- امام احمدؒ اور ابوداوٗدؒ نے روایت کیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ہم یعنی امہات المومنین نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ روانہ ہوتیں تو احرام باندھتے وقت اپنی پیشانیوں پر خوشبو کا لیپ لگا لیا کرتی تھیں، پھر جب ہم میں سے کسی کو پسینہ آتا تو خوشبو اس کے چہرے پر بہنے لگتی اور یہ کیفیت نبی کریم ﷺ دیکھتے مگر ہمیں منع نہ فرماتے۔

مندرجہ بالا احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ احرام باندھتے وقت خوشبو لگانا مستحب ہے اور یہ کہ اگر خوشبو احرام کے بعد بھی باقی رہے تو کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا احرام باندھنے والے کے لیے مستحب ہے کہ غسل کرنے کے بعد جس قسم کی خوشبو، میسر آئے لگائے۔ لیکن احرام باندھنے کے بعد خوشبو کا استعمال اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ سر منڈوا کر یا بال کٹوا کر حلال نہ ہو جائے۔

یہ حکم مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ہے یعنی عورت کے لیے بھی مستحب ہے کہ بوقت احرام خوشبو لگائے۔ کیوں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی حدیث اس بارے میں صریح ہے۔ آپ نے واضح لفظوں میں یہ بیان کیا ہے کہ امہات المومنین احرام کے وقت خوشبو کا لیپ لگایا کرتی تھیں، جس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہتا تھا حتی کہ ان میں سے کسی کو جب پسینہ آتا تو یہ لیپ بہہ کر اس کے چہرے پر آجاتا جسے نبی کریم ﷺ دیکھتے لیکن امہات المومنین کو خوشبو کا لیپ استعمال کرنے سے منع نہ فرماتے۔ آپ کے سکوت فرمانے کے معنی یہی ہیں کہ ایسا کرنا جائز ہے کیوں کہ نبی کریم ﷺ کسی غلط اور ناروا بات کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ صاحب فتح الباری نے لکھا ہے کہ جمہور کا مسلک یہی ہے۔

☆ احناف کے نزدیک احرام باندھتے وقت جسم اور کپڑوں پر خوشبو لگانا مستحب ہے

لیکن یہ خوشبو ایسی ہونی چاہیے، جس کا ٹھوس وجود احرام کے بعد باقی نہ رہے خواہ اس کی بو باقی رہ جائے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک احرام کے وقت جسم پر خوشبو لگانا مستحب ہے اور اس حکم میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ اور اگر یہ خوشبو احرام کے بعد بھی باقی رہے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ خواہ یہ خوشبو ٹھوس وجود رکھتی ہو اور اگر جسم پر خوشبو لگانے سے کپڑا بھی معطر ہو جائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔

امام نوویؒ ''المنہاج'' میں لکھتے ہیں کہ احرام باندھنے والے کو چاہیے کہ اپنے بدن پر خوشبو لگائے، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ کپڑوں پر بھی خوشبو لگائے اور اگر خوشبو کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے تو کوئی حرج نہیں، بلکہ اگر خوشبو ٹھوس جسم رکھتی ہو اور وہ لگی رہے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر کسی نے یہ خوشبو دار کپڑے جو احرام کے وقت پہنے تھے احرام باندھنے کے بعد اتار دیے اور پھر پہنے تو صحیح تر قول کے مطابق اس پر فدیہ لازم ہوگا۔ لہٰذا ہمارے خیال میں بہتر یہ ہے کہ احرام باندھنے والے کو چاہیے کہ احرام سے پہلے احرام کے لباس پر خوشبو لگانے سے اجتناب کرے تاکہ کسی ایسی بات میں مبتلا نہ ہو جائے جو منع ہے، مثلاً یہ کہ احرام باندھنے کے بعد اگر خوشبو میں بسے ہوئے لباس کو اتار دے اور دھوئے بغیر اس کو دوبارہ پہن لے تو ظاہر ہے اس پر فدیہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

احرام کے کپڑوں پر خوشبو لگانا ابن حجرؒ اور شیخ رملیؒ دونوں کے نزدیک مکروہ ہے اور یہ دونوں شافعی المذہب ہیں۔

صحابہ اور تابعین میں سے ایک بڑی جماعت اور محدثین اور فقہاء میں سے جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ احرام باندھتے وقت خوشبو لگانا جائز ہے اور احرام باندھ لینے کے بعد خوشبو کا استعمال حرام ہے۔ صحابۂ کرامؓ میں سے جن کا یہ مسلک ہے ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن زبیر، حضرت معاویہ، حضرت عائشہ اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین شامل ہیں۔ اور فقہاء میں ابو حنیفہؒ، سفیان ثوری، ابو یوسفؒ، احمد بن حنبلؒ اور داؤد ظاہریؒ وغیرہ شامل ہیں۔

عورت کے لیے سوگ منانے کے زمانہ میں خوشبو کا استعمال مکروہ ہے

امام شافعیؒ نے اس عورت کے لیے جو خاوند کی وفات پر سوگ کی حالت میں ہو، خوشبو کا استعمال مکروہ قرار دیا ہے۔ کیوں کہ سوگ سے مراد ہی یہ ہے کہ ہر قسم کی زینت ترک کر دی جائے اور سوگ میں بناؤ سنگھار ترک کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی خوشبو استعمال نہ کی جائے۔

روزہ دار کے لیے خوشبو کا استعمال

اگر وہ شخص جو احرام باندھ رہا ہو، روزے سے ہو تو شافعیوں کے نزدیک اس کے لیے خوشبو کا استعمال مکروہ ہے۔

قلیوبی میں ہے: احرام باندھتے وقت جسم پر خوشبو لگانی چاہیے۔ اس پر سب علماء کا اجماع ہے۔ لیکن روزہ دار کے لیے بہ وقت احرام خوشبو لگانا مکروہ ہے۔ اور سوگ میں بیٹھی ہوئی عورت کے لیے خوشبو کا استعمال حرام ہے۔

بہ وقتِ احرام خوشبو لگانے کی ممانعت

احرام کے وقت خوشبو لگانا جمہور کے نزدیک جائز ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ لیکن حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، امام مالکؒ، محمد بن حسنؒ، زہریؒ اور امام شافعیؒ کے بعض ساتھی اور بعض شیعہ علماء کا خیال ہے کہ احرام باندھتے وقت خوشبو کا استعمال ناجائز ہے۔ لیکن ان علماء میں پھر اس بات پر اختلاف ہے کہ خوشبو لگانا حرام ہے یا مکروہ، اور یہ کہ خوشبو لگانے پر فدیہ لازم آتا ہے یا نہیں؟

امام مالکؒ اور امام محمد بن الحسنؒ اس بات کے قائل ہیں کہ ایسی خوشبو لگانا جس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے مکروہ ہے۔ کیوں کہ عطاء بن ابی رباحؒ نے صفوان بن یعلیٰ بن امیہؒ سے اور صفوان نے اپنے باپ یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص مقامِ جعرانہ (۱) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس شخص نے عمرے کا احرام باندھ

---

(۱) جعرانہ مکہ والوں کا میقات ہے۔ یہ مقام مکہ سے باہر ہے۔ نبی کریمؐ انے یہاں سے عمرے کا احرام باندھا تھا

رکھا تھا اور اپنی داڑھی اور سر کو زرد رنگ سے رنگا ہوا تھا اور ایک جبہ پہن رکھا تھا۔ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میں نے عمرے کا احرام باندھا ہے اور میری کیفیت یہ ہے کہ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انزع عنك الجبة و اغسل عنك الصفرة

''یہ جبہ اتار دو اور یہ زرد رنگ جو تمہارے سر اور داڑھی پر لگا ہوا ہے اسے دھو ڈالو۔''

اس روایت کو ابن ماجہؒ کے سوا جماعت محدثین نے نقل کیا ہے۔

لیکن اس استدلال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ یہی بات امام شافعیؒ نے کہی ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے جعرانہ سے عمرے کا احرام ۸ھ میں باندھا تھا۔ لہٰذا یہ حدیث ۸ھ کی ہوئی اور ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی احادیث جن میں بوقت احرام نبی کریم ﷺ کے خوشبو لگانے کا ذکر ہے، حجۃ الوداع کے موقع کی ہیں جو ۱۰ھ کا زمانہ ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ کا خوشبو لگانے کا عمل بعد کا ہے اور حدیث یعلی بن امیہؓ دو سال پہلے کی ہے۔ لہٰذا بعد کی حدیث نے پہلی حدیث کے حکم کے منسوخ کر دیا۔

اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ احرام باندھتے وقت مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے جسم پر خوشبو لگانا مستحب ہے۔ خواہ اس خوشبو کا ٹھوس مادہ اور بو احرام کے بعد بھی باقی رہے اور خواہ اس کی وجہ سے لباس احرام معطر بھی ہو جائے۔ لیکن یہ حکم روزے دار اور سوگ میں بیٹھی ہوئی عورت کے لیے نہیں ہے۔

لیکن اگر بدن پر خوشبو لگانے سے کپڑے بھی خوشبودار ہو جائیں اور احرام باندھنے کے بعد محرم انہیں اتارے تو اگر ان میں خوشبو کا اثر موجود ہے تو ان کو دوبارہ نہ پہنے۔

احرام باندھتے وقت عورت کا مہندی لگانا

امام نوویؒ نے ''المنہاج'' میں لکھا ہے: عورت کے لیے مستحب ہے کہ احرام باندھتے وقت اپنے ہاتھوں کو رنگ لے یعنی اپنے دونوں ہاتھوں پر پہنچوں تک مہندی کا رنگ چڑھا لے

کیوں کہ یہ کھل جاتے ہیں۔ اسی طرح اپنے چہرے پر بھی کسی قدر مہندی مل لے، اس لیے کہ چہرے کو کھولنے کا حکم ہے اور اس طرح کم از کم جلد کی رنگ مہندی کے رنگ سے چھپ جائے گی۔ لیکن احرام باندھ لینے کے بعد مہندی لگانا عورت کے لیے مکروہ ہے کیوں کہ یہ بھی ایک طرح کا بناؤ سنگھار ہے۔ البتہ مرد اور مخنث احرام باندھتے وقت مہندی یا کوئی اور رنگ نہ لگائیں۔

''الدین الخالص فی ارشاد الناسک'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ ''عورت کے لیے احرام باندھتے وقت مہندی لگانا، مستحب ہے، اگر چہ اس کا خاوند نہ ہو اور خواہ وہ بوڑھی ہو۔ عورت کو چاہیے کہ اپنے دونوں ہاتھ پہنچوں تک مہندی سے رنگ لے اور اپنے چہرے پر بھی کسی قدر مہندی لگا لے تا کہ جلد کا رنگ چھپ جائے۔ کیوں کہ احرام کی حالت میں عورت کو چہرہ کھلا رکھنے کا حکم ہے اور ہاتھ بھی کبھی کبھی کھل جاتے ہیں لہٰذا ہاتھوں پر بھی مہندی لگانا مناسب ہے۔ اس کے علاوہ مہندی عورت کے لیے زینت ہے اس لیے احرام کے وقت لگانا مستحب ہے جیسا کہ خوشبو لگانا اور کنگھی کرنا۔ لیکن احرام باندھ لینے کے بعد کسی قسم کا رنگ لگانا مکروہ ہے کیوں کہ بحالتِ احرام زینت و آرائش مکروہ ہے اور مہندی وغیرہ بھی زینت میں شامل ہے۔

اوپر جو بیان ہوا یہ شافعی علماء کی رائے ہے، جس کے مطابق ایسا کرنا مذکورہ بالا حکمت کی بنا پر مستحب ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اسے محض جائز کہا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ اگر کوئی عورت چاہے تو بہ وقت احرام مہندی لگالے اور اگر نہ لگائے تو کوئی گناہ نہیں۔

پھر یہ بات ثابت ہے کہ امہات المومنین نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ نبی کریم ﷺ مہندی کی بو کو ناپسند فرماتے تھے۔ چناں چہ ایک روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے خطاب کی بیوی نے مہندی کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کے لگانے میں کوئی حرج نہیں لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی اس لیے کہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بو ناپسند تھی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کے پاس بکرۃ بنت عقبہ آئیں اس حالت میں کہ انھوں نے زرد رنگ لگا رکھا تھا اور ام المومنین سے پوچھا: مہندی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ''پاکیزہ درخت اور پاک پانی'' یعنی مہندی میں یہی دو چیزیں ہوتی ہیں اور دونوں پاک صاف ہیں۔

باوجودیکہ شافعی علماء کے نزدیک احرام سے پہلے مہندی لگانا مباح ہے تاہم اس عورت کے لیے جو خاوند کی وفات پر عدت گزار رہی ہو ان کے نزدیک مہندی لگانا حرام ہے، اسی طرح حسین عورت کے لیے حج کے موقعے پر بھی مہندی لگانا ان کے نزدیک حرام ہے خواہ وہ عدت میں نہ ہو۔

ناخنوں کا لیپ (نیل پالش)

صرف مہندی کا رنگ ایسا رنگ ہے جس کا استعمال احرام کے وقت عورت کے لیے جائز ہے، اس کے علاوہ کسی قسم کے نیل پالش سے ناخن رنگنا جن کی ٹھوس تہہ ناخن پر چڑھ جاتی ہے بالکل جائز نہیں، نہ احرام سے پہلے اور نہ احرام کے دوران۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیل پالش کی تہہ اگر ناخن پر موجود ہو تو نہ غسل درست ہوتا ہے اور نہ وضو۔ نیز یہ ایک قسم کا سنگھار ہے جس سے دوران حج بچنا ضروری ہے۔

احرام باندھنے کے بعد مرد یا عورت کے لیے مہندی لگانا

اب تک جو کچھ بیان ہوا یہ تو احرام باندھنے سے پہلے مہندی لگانے کے بارے میں تھا، لیکن احرام باندھنے کے بعد مہندی وغیرہ لگانے کا حکم مختلف ہے۔ اور وہ درج ذیل ہے:

☆ حنفیوں کے نزدیک احرام کی حالت میں مہندی لگانا جائز نہیں اس لیے کہ مہندی میں خوشبو ہوتی ہے اور احرام کی حالت میں خوشبو لگانا مرد اور عورت دونوں کے لیے منع ہے اسی لیے مہندی لگانا بھی منع ہے خواہ یہ مہندی ہاتھوں پر لگائی جائے یا سر اور داڑھی پر یا جسم کے کسی اور حصہ پر۔

☆ شافعیوں کے نزدیک عورت کے لیے بحالت احرام مہندی کا رنگ لگانا مکروہ ہے۔

☆ لیکن حنبلیوں کے نزدیک مرد اور عورت دونوں کے لیے بحالت احرام جسم کے کسی حصہ پر مہندی لگانا حرام نہیں ہے البتہ مرد کے لیے سر پر مہندی لگانا حرام ہے۔

☆☆

عورت کا احرام

اصطلاحی معنیٰ

اصطلاحِ شرع میں احرام کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص حج کرنے یا عمرہ کرنے یا دونوں بہ یک وقت کرنے کی نیت کرے۔

حنفیوں کے سوا باقی تمام مسالک فقہ میں احرام حج کا رکن ہے۔ حنفیوں کے نزدیک اگرچہ رکن نہیں ہے لیکن صحت حج کی شرط ہے اور شرط صحت ہونے کی بنا پر ان کے نزدیک بھی اسے رکن کا درجہ حاصل ہے۔

یہ بات دلائل سے ثابت ہو چکی ہے کہ نیت میں صرف اتنا شرط ہے کہ کرنے والے کو دل میں یہ معلوم ہو کہ وہ کس مخصوص عبادت کے مناسک ادا کر رہا ہے اور نیت کا مقام چوں کہ دل ہے لہٰذا زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا شرط ہے اور نہ واجب بلکہ اس سلسلے میں اتنا کافی ہے کہ انسان دل میں یہ ارادہ کرلے کہ وہ حج یا عمرے کی عبادت شروع کر رہا ہے، اس کے بعد اس پر وہ تمام باتیں حرام ہو جائیں گی، جن کا کرنا حج یا عمرے کے مناسک ادا کرتے وقت منع ہے۔

کمال بن ہمامؒ نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ: جن راویوں سے نبی کریم ﷺ کے حج کی روایات مروی ہیں ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ہمارے علم میں نہیں کہ اس نے یہ کہا ہو کہ میں نے رسول اللہ کو اس طرح نیت کرتے سنا ہے کہ ''میں نیت کرتا ہوں حج کی یا عمرے کی۔''

امام شافعیؒ نے مزید لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص احرام باندھتے وقت زبان سے حج یا عمرے کا نام لے کر نیت کرے تو میرے نزدیک ایسا کرنا مکروہ نہیں ہے۔

''المغنی'' میں ہے کہ احرام باندھتے وقت انسان کا زبان سے حج یا عمرے کا نام لے کر نیت کرنا مستحب ہے تا کہ کسی قسم کا مغالطہ باقی نہ رہے۔ اسے اس طرح کہنا چاہیے کہ نیت کرنا مستحب ہے تا کہ کسی قسم کا مغالطہ باقی نہ رہے۔ اسے اس طرح کہنا چاہیے۔

''اے اللہ! میں عمرہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں تو اسے میرے لیے آسان بنا دے اور قبول فرما۔''

یا یوں کہے:

''اے اللہ! میں حج کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں لہٰذا تو اسے میرے لیے آسان کر دے اور قبول فرما۔''

یا کہے:

''اے اللہ! میں حج اور عمرہ دونوں کرنے کا ارادہ کرتا ہوں لہٰذا تو ان دونوں کو میرے لیے آسان کر دے اور قبول فرما۔''

حیض اور نفاس والی عورت کا احرام

حیض یا نفاس کی حالت میں عورت احرام باندھ سکتی ہے۔ وہ میقات سے گزرتے وقت حج یا عمرہ کرنے کی نیت کرے گی کیوں کہ حج یا عمرے کا احرام باندھنے کے لیے پاک ہونا شرط یا رکن نہیں ہے۔ اس لیے حیض و نفاس احرام باندھنے میں مانع نہیں ہے۔ جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ مقام شجرہ میں حضرت اسماء بنت عمیسؓ کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور نفاس شروع ہو گیا تو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ وہ غسل کر کے احرام باندھ لیں۔

حیض و نفاس کی حالت میں عورت حج کے تمام مناسک ادا کر سکتی ہے سوائے طوافِ بیت اللہ کے، اور ان دو رکعتوں کے جو حج یا عمرے کا احرام باندھتے وقت پڑھی جاتی ہیں۔ یہ دو رکعت جو احرام باندھتے وقت پڑھی جاتی ہیں حج یا عمرے کی صحت کے لیے شرط نہیں ہیں کیوں کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے یہ دو رکعتیں نہیں پڑھی تھیں اور ان کا حج ہو گیا تھا۔

احرام کی قسمیں

احرام کی تین قسمیں ہیں:

۱- افراد

اس سے مراد یہ ہے کہ حاجی میقات سے صرف حج کا احرام باندھے اور حج کے تمام مناسک ادا کرنے کے بعد احرام کھول دے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک حج افراد قران اور تمتع سے افضل ہے اور مالکیوں کا قول مشہور بھی یہی ہے۔ حج افراد کرنے والے پر قربانی واجب نہیں ہے۔

۲- تمتع

اس سے مراد یہ ہے کہ میقات سے صرف عمرے کا احرام باندھا جائے۔ یعنی احرام باندھتے وقت یہ نیت کرے۔

اللھم انی ارید العمرۃ فیسرھا لی و تقبلھا منی

"اے اللہ! میں عمرہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں، تو اسے میرے لیے آسان کر دے اور قبول فرما۔"

پھر جب عمرہ کر چکے یعنی بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کر چکے تو بال منڈوا کر یا انہیں کٹوا کر احرام کھول دے پھر حج کے وقت کا انتظار کرے اور جب حج کا وقت شروع ہو تو حج کا احرام باندھ لے۔ اس صورت کو تمتع اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایسا کرنے والا شخص عمرے سے فارغ ہونے کے بعد حج شروع ہونے تک احرام کھول کر ہر چیز سے تمتع یعنی استفادہ کر سکتا ہے۔

☆ احناف اور امام احمدؒ کے نزدیک تمتع افراد سے افضل ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک قرآن سے بھی افضل ہے اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے کہ تمتع قران سے افضل ہے۔ حج تمتع کرنے والے پر ھدی یعنی دم تمتع واجب ہے۔

۳-قران

اس سے مراد یہ ہے کہ حج اور عمرہ دونوں کا احرام بہ یک وقت باندھے اور نیت اس طرح کرے:

اللھم انی ارید العمرۃ والحج فیسر ھما لی و تقبلھما منی

”اے اللہ! میں نے عمرہ اور حج دونوں بہ تک وقت کرنے کا ارادہ کیا ہے سوتو انھیں میرے لیے آسان کردے اور قبول فرما۔“

☆ احناف کے نزدیک حجِ قران افراد اور تمتع دونوں سے افضل ہے اور حج قران کرنے والا احرام اس وقت تک نہیں کھولے گا جب تک تمام مناسکِ حج سے فارغ نہ ہوجائے جیسے حج افراد کرنے والا تمام مناسک سے فارغ ہوکر احرام کھولتا ہے اور حج قران کرنے والے پر بھی جمرۂ عقبہ کی رمی (کنکریاں مارنے) سے فارغ ہونے کے بعد ہدی یعنی دم قران واجب ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص حج یا عمرہ کی تعیین کیے بغیر محض ادائے مناسک کی نیت سے احرام باندھ لے تو بھی اس کا حج صحیح ہوجائے گا اور وہ محرم ہوگا لیکن جو شخص مطلق ادائے مناسک کی نیت سے احرام باندھے اسے یہ اختیار ہے کہ حج یا عمرے میں سے جس کے مناسک ادا کرنا چاہے کرلے۔ لیکن امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ اس صورت میں اس احرام کو عمرے کا احرام قرار دے اور پھر حج کا احرام باندھ کر تمتع کرے کیوں کہ حج تمتع حج افراد سے افضل ہے۔

”المغنی“ میں ہے کہ حج یا عمرے کا احرام باندھنے والے کے لیے مستحب ہے کہ احرام باندھتے وقت یہ شرط لگا دے کہ اگر کوئی رکاوٹ پیش آ گئی تو میں اسی مقام پر احرام کھول دوں گا جہاں روک دیا جاؤں گا۔

اس شرط کے دو فائدے ہیں:

۱- ایک یہ کہ اگر دشمن یا بیماری یا زادِ راہ ختم ہوجانے یا اسی قسم کی کسی اور مجبوری کی بنا

پر رکنا پڑ جائے تو ایسی شرط لگانے والے کو احرام کھولنے کا اختیار ہوگا۔

۲- دوسرے، جب اس شرط کی بنا پر یہ شخص احرام کھولے گا تو اس پر نہ جانور کی قربانی دینا واجب ہوگا اور نہ روزے رکھنا۔

بخاری اور مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریمؐ حضرت ضباعہ بنت زبیر رضی اللہ عنہما کے پاس تشریف لائے تو انھوں نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! میں حج کا ارادہ کر رہی ہوں لیکن میں بیمار ہوں، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

حجی و اشترطی ان محلی حیث حبستی

''حج کرو لیکن احرام کے وقت یہ شرط لگا لو کہ بیماری کی وجہ سے مجھے جہاں رکنا پڑ گیا اسی مقام پر میں احرام کھول دوں گی۔''

طواف کا بیان کرتے وقت ہم اس مسئلہ پر تفصیل سے بات کریں گے کہ کسی عورت نے اگر عمرے کی نیت کی ہو اور عمرے کا طواف کرنے سے قبل ہی اسے حیض یا نفاس شروع ہو جائے اور حج کے فوت ہو جانے کا خطرہ ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے اور نبی کریم ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کو جنھوں نے تمتع کا احرام باندھا تھا ایسی صورت میں کیا حکم دیا تھا اور کس طرح وہ تمتع کا احرام باندھنے کے باوجود عمرہ کرتے ہی احرام کھولے بغیر حج میں داخل ہو گئیں تھیں اور تمتع کی بجائے قران کیا تھا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی نے حج کا احرام باندھا تو وہ حج کا ارادہ ترک کر کے اسے عمرہ میں بدل سکتا ہے اور پھر عمرہ کے بعد دوبارہ حج کا احرام باندھ کر حج تمتع کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے حج قران کا احرام باندھا تو وہ حج کو منسوخ کر کے اسے عمرہ قرار دے سکتا ہے۔ لیکن یہ حج کو عمرہ میں بدلنا صرف اس صورت میں جائز ہے جب افراد یا قران کرنے والا اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہ لایا ہو، ورنہ اگر قربانی کا جانور ساتھ ہو تو پھر احرام باندھتے وقت جو نیت کی ہے اسی پر قائم رہے اور حج کو عمرے یا قران کو تمتع میں بدلنا جائز نہیں۔ لیکن ہر ایسے شخص کے لیے جس نے حج تمتع کا احرام باندھا ہو یہ جائز ہے کہ اگر اسے حج کے فوت ہونے کا خوف ہو تو وہ احرام کھولے بغیر حج کی نیت کر لے اور تمتع کی بجائے قران کر لے۔

لیکن جس نے عمرے کی نیت سے احرام باندھا ہو وہ اسے منسوخ کر کے حج افراد قرار نہیں دے سکتا۔ اسی طرح جس نے حج قران کی نیت سے احرام باندھا ہو وہ اسے منسوخ کر کے حج افراد نہیں کر سکتا۔

احرام میں عورت کا لباس

۱- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا: یا رسول اللہ! احرام باندھنے والا کون سا لباس پہنے؟

آپ نے فرمایا:

و لا تبلسوا القمیص و لا العمائم و لا السراویلات و لا البر انس و لا الخفاف الا احدا لا یجد النعلین فیلبس الخفین و لیقطعهما اسفل من الکعبین و لا تلبسوا من الثیاب شیئا مسه الزعفران و لا الورس. (رواہ مسلم والجماعة)

"نہ قمیص اور پاجامہ پہنو اور نہ باران کوٹ پہنو، اور نہ عمامہ باندھو اور موزے بھی نہ پہنو مگر یہ کہ کسی شخص کو جو میسر نہ آئے تو وہ موزے پہن لے لیکن انھیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ ڈالے اور نہ ایسا کپڑا پہنو جو زعفران یا ورس[۱] میں رنگا ہوا ہو۔"

۲- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تنقب المرأة المحرمة و لا تلبس القفازین (احمد والبخاری والنسائی)

"احرام باندھنے والی عورت نہ تو نقاب ڈالے اور نہ دستانے پہنے۔"

---

(۱) ورس یمن کے علاقہ کا ایک خوشبودار پودا ہے جس کا رنگ زعفران سے ملتا جلتا ہے اور اسے رنگ اور خوشبو دونوں مقاصد کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

۳- مسند احمد میں ہے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو عورتوں کو منع فرماتے خود سنا ہے: آپ نے فرمایا عورتیں بحالت احرام دستانے، نقاب اور ایسے کپڑے نہ پہنیں جو زعفران اور ورس میں رنگے ہوئے ہوں۔

یہی روایت ابوداؤد میں بھی ہے۔ اس میں یہ الفاظ زائد ہیں:

و لتلبس بعد ذلك ما احبت من الوان الثياب معصفرا اوخرا او حليا او سراويل او قميصاً

''اور ان کے علاوہ جو مختلف قسم کے کپڑے پسند ہوں، پہنے، مثلاً: کسم میں رنگے ہوئے یا ریشمی کپڑے یا زیور اور شلوار قمیص پہن سکتی ہے۔''

(اسی طرح کی روایت سنن) بیہقی اور مستدرک حاکم میں بھی ہے اور اس کے راوی صحیح حدیث کے معیار کے ہیں۔

۴- امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے احرام کی حالت میں کسم میں رنگے ہوئے کپڑے پہنے اور آپ نے فرمایا:

''عورت احرام میں نہ تو ڈھاٹا باندھے، نہ برقع پہنے اور نہ کوئی ایسا کپڑا پہنے جو ورس یا زعفران میں رنگا ہوا ہو۔''

مندرجہ بالا احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ احرام باندھنے کے بعد عورت کے لیے اپنے جسم کو ہر قسم کے کپڑے سے ڈھانپنا جائز ہے خواہ یہ کپڑا سلا ہوا ہو یا بن سلا یا ایسا جو پورے بدن کو چھپا لے لیکن چہرے کو ڈھانپنا جائز نہیں بلکہ چہرے پر نقاب وغیرہ ڈالنا حرام ہے۔

چناں چہ عورت اپنے روز مرہ کے عام کپڑے پہن سکتی ہے اور جوتی اور موزے پہننا بھی جائز ہے۔ باقی وہ چیزیں جن کا پہننا بحالت احرام عورت کے لیے جائز نہیں یا جن کے جواز کے سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، ان کی تفصیل یہ ہے:

۱- خوشبو میں بسا ہوا کپڑا

۲- دستانے

۳- نقاب اور برقع

۴- کسم کے رنگ میں رنگا ہوا کپڑا

خوشبو میں بسا ہوا کپڑا

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''احرام والی عورت ایسا کپڑا نہ پہنے جو زعفران یا ورس میں رنگا ہوا ہو۔''

ورس ایک زرد رنگ کا پودا ہے، جس کی بو خوشگوار ہوتی ہے اور اس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں، یہ پودا اگرچہ ان اشیاء میں شامل نہیں ہے جن سے خوشبو تیار کی جاتی ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے یہ حکم اس لیے دیا تاکہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ بحالت احرام نہ صرف یہ کہ ہر قسم کی خوشبو سے بچنا ضروری ہے بلکہ تمام ایسی چیزوں سے اجتناب لازم ہے جن کی بو خوشگوار ہو۔

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ پوری امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ احرام کی حالت میں ورس اور زعفران میں رنگے ہوئے کپڑے پہننا حرام ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں خوشبودار ہیں، اور خوشبو لگانا احرام کی حالت میں حرام ہے۔ اور ان دونوں چیزوں یعنی زعفران اور ورس پر قیاس کر کے علماء نے ایسی تمام چیزوں کو جو خوشبو کی غرض سے استعمال کی جاتی ہیں، ان کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔

لیکن جمہور کے نزدیک ایسے رنگے ہوئے کپڑے کا استعمال بھی بحالت احرام منع ہے جس میں رنگنے کے بعد خوشبو کا اثر باقی ہو۔ چناں چہ اگر خوشبو زائل ہو جائے تو رنگے ہوئے کپڑے کا استعمال جائز ہے۔ لیکن امام مالکؒ کو اس سے اختلاف ہے ان کے نزدیک خوشبو زائل ہو جانے کے بعد بھی رنگے ہوئے کپڑے کا پہننا جائز نہیں۔

دستانے

حدیث میں لفظ ''قفازان'' آیا ہے۔ اس سے مراد ایسے دستانے ہیں جو بالعموم عورتیں

ہاتھوں میں پہنتی ہیں اور جن کے پہننے سے ہاتھوں کی انگلیوں سمیت پورا ہاتھ ڈھک جاتا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احرام والی عورت کے لیے دستانوں کا پہننا حرام ہے اور یہی امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے اور شافعیوں کے ہاں بھی صحیح تر یہی ہے اور احناف کے ہاں بھی قولِ مشہور یہی ہے۔

لیکن امام محمدؒ بن حسن الشیبانی جو کہ امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب میں سے ہیں، کی رائے اور مزنیؒ کی روایت کے مطابق امام شافعیؒ کے نزدیک بھی بحالت احرام عورت کے لیے دستانے پہننا جائز ہے اور امام مالکؒ کا ایک قول بھی اس کی تائید میں ہے اور ان حضرات کی دلیل حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی وہ حدیث ہے جو دار قطنی اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

احرام المرأة فی وجهها

''عورت کا احرام اس کے چہرے سے متعلق ہے۔''

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ بحالت احرام عورت کے لیے چہرے کے سوا جسم کے کسی حصہ کو ڈھانپنا گناہ نہیں ہے۔

لیکن ترجیح اسی بات کو ہے کہ دستانے پہننا بھی حرام ہے کیوں کہ مذکورہ بالا حدیث جس سے ان علماء نے چہرے کے علاوہ باقی جسم کو ڈھانپنے کا جواز ثابت کیا ہے ضعیف ہے اور اس پر بعض محدثین نے کلام کیا ہے۔ لیکن جن حدیثوں سے دستانے پہننے کی حرمت ثابت ہوتی ہے وہ سب صحیح احادیث ہیں اور جب تعارض پیدا ہو تو صحیح حدیث کو ضعیف حدیث پر مقدم رکھا جاتا ہے۔

مالکیوں کے نزدیک عورت اگر احرام کی حالت میں اپنے ہاتھوں کو قمیص کے اندر چھپالے تو حرام نہیں ہے۔

اور شافعیوں کا خیال ہے کہ ہاتھوں میں صرف دستانے پہننا منع ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز سے ہاتھوں کو چھپانا جائز ہے خواہ کپڑا وغیرہ ہاتھوں پر باندھ لے اگر گرہ لگا دے

تب بھی کوئی حرج نہیں۔

اللہ تعالیٰ ان شافعی علماء کو اپنی رضا سے نوازے لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ حدیث میں جو دستانوں کی ممانعت ہے اس سے مراد ہی یہ ہے کہ ہاتھوں کو کسی چیز سے نہ ڈھانپا جائے خواہ دستانے ہوں یا کوئی اور ایسی چیز جو دستانوں کی قائم مقام ہو۔ البتہ علماء مالکیہ کی یہ بات کسی قدر قابل قبول ہوسکتی ہے کہ اگر ہاتھوں کو قمیص کے اندر چھپا لیا جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن یہ کہنا کہ دستانے کے علاوہ ہر چیز سے ہاتھوں کو چھپانا اور ڈھکنا جائز ہے خواہ انہیں باندھ بھی لیا جائے یا گرہ لگائی جائے۔ تو یہ بات محلِ نظر ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ ایسا کرنے کی کوئی خاص مجبوری مثلاً بیماری وغیرہ بھی نہ ہو جس کی وجہ سے نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو اور نقصان سے بچنے کی خاطر ایسا کیا جائے۔

کسم کے رنگ میں رنگا ہوا کپڑا

احناف اور امام سفیان ثوریؒ کے نزدیک احرام کی حالت میں عورت کے لیے معصفر یعنی کسم کے پھولوں سے تیار کردہ رنگ میں رنگا ہوا کپڑا پہننا حرام ہے۔ انھوں نے کسم کو بھی خوشبو قرار دیا ہے اور اسی لیے ان کے نزدیک اس کے پہننے والے پر فدیہ واجب ہے، مگر یہ کہ اس کپڑے کو اس قدر دھولیا جائے کہ اس کا رنگ اتر کر دوسرے کپڑوں کو رنگ دار نہ کرے اور خوشبو باقی نہ رہے۔

لیکن امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ احرام والی عورت کے لیے کسم میں رنگا ہوا کپڑا پہننا جائز خیال کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کی دلیل مندرجہ ذیل روایات ہیں:

۱- حضرت عبد اللہ بن عمرؓ والی روایت جو ابوداؤدؒ، بیہقیؒ اور الحاکمؒ نے نقل کی ہے جس کے راوی حدیث صحیح کے معیار کے ہیں اور جس میں یہ اجازت ہے کہ احرام والی عورت ان کپڑوں کے سوا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے باقی ہر قسم کے اور ہر رنگ کے کپڑے مثلاً کسم میں رنگے ہوئے کپڑے وغیرہ پہن سکتی ہے۔

۲- امام بخاریؒ کی وہ روایت جس میں یہ ذکر ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے

کسم کے رنگ میں رنگے ہوئے کپڑے بحالت احرام پہنے، نیز حضرت جابرؓ کا قول ہے کہ میرے خیال میں کسم خوشبو نہیں ہے۔

بحالت احرام زیور اور سیاہ لباس

احرام کی حالت میں عورت کو اجازت ہے کہ جن کپڑوں سے منع کر دیا گیا ہے ان کے علاوہ جو زیورات اور جیسا لباس چاہے پہنے، کیوں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ عورت کے لیے بحالت احرام زیور، سیاہ یا گلابی لباس اور موزے وغیرہ پہننے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھیں۔

نیز حضرت عبداللہ بن عمرؓ والی مذکورہ بالا حدیث میں ہے کہ جس لباس سے منع کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ عورت کو اختیار ہے کہ جو لباس اسے پسند ہو پہنے مثلاً کسم میں رنگا ہوا یا ریشمی لباس یا زیور یا شلوار اور قمیص وغیرہ۔

البتہ لباس میں سب سے بہتر سفید لباس ہے جیسا کہ طبرانی علیہ الرحمہ اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم نے فرمایا:

خیر ثیابکم البیاض فالبسوھا احیاء کم و کفنوھا امواتکم

”تمہارا بہترین لباس سفید رنگ کا ہے لہٰذا اپنے زندہ انسانوں کو سفید لباس پہناؤ اور اسی میں اپنے مردوں کو کفناؤ۔“

☆☆

بحالتِ احرام عورت کے لیے

منہ ڈھانکنے کے بارے میں احکام

اس سلسلے میں درج ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:

۱- امام احمدؒ، بخاریؒ، نسائیؒ اور ترمذی نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تنتقب المرأة المحرمة ولا تلبس القفازين

"بہ حالت احرام عورت نہ تو نقاب ڈالے اور نہ دستانے پہنے۔"

۲- دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس بات سے منع فرماتے سنا ہے کہ عورتیں بحالت احرام دستانے، نقاب اور ورس یا زعفران میں رنگے ہوئے کپڑے پہنیں۔ (مسند احمدؒ)

۳- امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ احرام کی حالت میں عورت نہ کپڑے سے منہ ڈھانکے، نہ برقع اوڑھے اور نہ کوئی ایسا کپڑا پہنے جو ورس اور زعفران میں رنگا ہوا ہو۔

۴- امام احمدؒ، ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ہم احرام باندھے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ سفر کیا کرتی تھیں اور ہمارے پاس سے سوار گزرتے تھے تو جب وہ ہمارے سامنے آتے، ہم اپنی چادر کا پلو سر سے کھینچ کر چہرے پر لٹکا لیتیں اور جب وہ آگے بڑھ جاتے ہم اپنا چہرہ کھول لیتی تھیں۔

نقاب سے مراد کپڑے کا ایسا ٹکڑا ہے جس میں آنکھوں کے بالمقابل دو سوراخ

ہوتے ہیں، جسے عورت اپنے چہرے پر ڈال لیتی ہے اور سوراخوں سے دیکھتی ہے۔

فتح الباری میں ہے کہ نقاب سے مراد یہ ہے کہ اوڑھنی کو ناک اور ٹھوڑی پر باندھ لیا جائے تاکہ چہرہ چھپ جائے لیکن آنکھیں کھلی رہیں۔

مذکورہ بالا احادیث کی بنا پر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بحالت احرام عورت کے لیے کوئی چیز چہرے پر ڈال کر اپنا چہرہ چھپانا حرام ہے۔ لیکن سر کا ڈھانکنا نہ صرف یہ کہ منع نہیں بلکہ واجب ہے۔ مذکورہ بالا احادیث اس بارے میں صریح ہیں کہ نبی کریم نے بحالت احرام عورت کو نقاب اور دستانے پہننے سے منع فرمایا ہے۔ چناں چہ اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ عورت کے لیے بحالت احرام چہرہ ڈھانپنا حرام ہے۔

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ عورت کے لیے بحالت احرام چہرے کے سوا اپنے پورے جسم کو ڈھانپنا خواہ سلے ہوئے کپڑے سے ہی ڈھانپا جائے جائز ہے لیکن چہرے کو کسی بھی چیز سے چھپانا حرام ہے۔

ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھا ہے کہ عورت کے لیے بحالت احرام اپنے چہرے کو ڈھانپنا اسی طرح حرام ہے جیسے مرد کے لیے سر ڈھکنا اور اس مسئلہ میں مسالک فقہ میں سے کسی مسلک کا اختلاف ہمارے علم میں نہیں ہے۔

ابن المنذرؒ نے لکھا ہے کہ برقع پہننے کی کراہت حضرات سعد بن ابی وقاص، ابن عمر، ابن عباس اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے اور ہمارے علم میں نہیں ہے کہ اس سلسلے میں کسی نے اختلاف کیا ہو۔

لیکن علماء کے درمیان اس پر بھی اتفاق ہے کہ بحالت احرام عورت کو چند شرائط کے ساتھ اجنبیوں سے اپنا چہرہ چھپانے کی اجازت ہے۔ لیکن اتفاق کے باوجود اس میں بھی بعض جزئیات پر علماء کے درمیان کچھ اختلاف ہے جو درج ذیل ہے:

☆ مالکیوں کے نزدیک احرام کی حالت میں عورت کے لیے چہرے کے کسی ایسے حصے کا ڈھانپنا حرام ہے، جس پر سر کا اور بالوں کی لٹوں کا چھپانا موقوف ہو اسی طرح چہرے کو چھپانے کا مقصد اگر لوگوں کی نظروں سے بچنا ہو تو اس کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ جس چیز

سے چہرہ چھپایا جائے وہ لباس کے ساتھ سلی ہوئی یا بندھی ہوئی نہ ہو ورنہ حرام ہے۔ یعنی کسی ایسے کپڑے سے چہرہ چھپانا جو باقی لباس کے ساتھ سلا ہوا یا بندھا ہوا ہو، حرام ہے اور اس طرح چہرہ چھپانے پر فدیہ لازم آئے گا۔

☆ شافعیوں کے نزدیک عورت بحالت احرام اپنا چہرہ اجنبی لوگوں سے چھپا سکتی ہے لیکن کسی ایسے نقاب وغیرہ سے جو چہرے کے ساتھ مس نہ ہو۔

☆ حنفیوں کے نزدیک بحالت احرام عورت اجنبی مردوں سے اپنا چہرہ چھپا سکتی ہے لیکن اس کی صورت یہ ہو کہ چہرے کے اوپر کوئی چیز اس طرح لٹکائی جائے کہ وہ چیز چہرے کے ساتھ مس نہ ہو۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک عورت بحالت احرام اپنے چہرے کو ڈھانپ سکتی ہے لیکن کسی ضرورت کے ماتحت مثلاً اس وقت جب اس کے قریب سے اجنبی مرد گزر رہے ہوں اور ایسی صورت میں چہرہ چھپاتے وقت نقاب اگرچہ چہرے کے ساتھ چھو بھی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ چہرہ چھپانے کے لیے یہ شرط لگانا کہ نقاب وغیرہ چہرہ سے دور رہے ایک ایسی کمزور بات ہے جس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح ام المومنین حضرت عائشہؓ کی اس بات سے کہ "امہات المومنین اپنی چادروں کے پلو سروں سے کھینچ کر اپنے چہروں پر لٹکا لیا کرتی تھیں" بظاہر جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اس میں کہیں ایسی کوئی شرط نہیں ہے کہ کپڑا یا نقاب چہرے کے ساتھ مس نہ ہو اس لیے کہ جو کپڑا سر سے چہرے پر لٹکایا جائے گا وہ چہرے کے ساتھ لگنے سے محفوظ نہیں رہ سکتا، نیز اگر اس کا چہرے سے جدا رہنا شرط ہوتا تو ضرور نبی کریمؐ یہ بات کھول کر بیان فرما دیتے۔ (۱)

لہٰذا اگر چہرہ چھپاتے وقت قصد و ارادے کے بغیر کپڑا چہرے کے ساتھ چھو جائے اور عورت اسے فوراً ہی ہٹا دے تو اس پر کوئی فدیہ نہیں لیکن اگر قصداً بلا ضرورت چہرے کو مسلسل چھپائے رکھا تو اس پر فدیہ واجب ہوگا۔

---

(۱) نیل الاوطار، ج ۶، ص ۸۳ اور فقہ السنہ ج ۱، ص ۶۷۴

عورت کا لبیک پکارنا

امام بیہقیؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے کہا ہے کہ عورت نہ تو صفا اور مروہ پر چڑھے اور نہ لبیک کہتے وقت اپنی آواز بلند کرے۔

اور موطا امام مالکؒ میں ہے: امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اہل علم حضرات سے سنا ہے کہ لبیک کہتے وقت عورت کو آواز بلند کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ عورت ایسی آواز میں لبیک کہے کہ بس خود سن سکے۔ نیز امام مالکؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ عورت اس طرح لبیک کہے کہ خود سنے اور اس کے قریب والے سنیں اور اس سے زیادہ آواز بلند کرنا عورت کے لیے مکروہ ہے۔

الرویانیؒ، ابو الطیبؒ اور ابن الرفعہؒ نے لکھا ہے کہ عورت اگر بلند آواز سے لبیک کہے تو حرام نہیں ہے۔ اس لیے کہ قول صحیح کے مطابق عورت کی آواز عورت نہیں ہے لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے۔

حیض اور نفاس کی حالت میں لبیک

حیض یا نفاس والی عورت لبیک کہہ سکتی ہے کیوں کہ لبیک کے الفاظ قرآن نہیں ہیں اور حیض و نفاس کی حالت میں عورت کے لیے صرف تلاوت قرآن مجید منع ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے حیض اور نفاس والی عورت کو اجازت دی تھی کہ وہ سوائے طواف بیت اللہ اور نماز کے تمام مناسک حج ادا کرے، جس طرح باقی حاجی ادا کرتے ہیں۔

☆☆

جو باتیں احرام کی حالت میں حرام ہیں

جب کوئی شخص احرام باندھ لیتا ہے یعنی حج یا عمرہ کرنے کی نیت کرلیتا ہے تو اس پر چند مخصوص باتیں حرام ہوجاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو قرآن میں بہ صراحت مذکور ہیں اور بعض وہ ہیں جن کا ذکر نبی کریم ﷺ کی حدیثوں میں ہے۔

وہ امور جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے درج ذیل ہیں:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرة:١٩٧)

"حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں، جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔"

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَآيُّهَا الَّذِينَ امَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ (المائدة:٩٥)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو۔"

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَادُمْتُمْ حُرُمًا (المائدة:٩٦)

"اور خشکی کا شکار جب تک تم احرام کی حالت میں ہو، تم پر حرام کیا گیا ہے۔"

١- تمام ایسے امور جن کا ارتکاب محرم اپنی ذات کے بارے میں کرتا ہے مثلاً جماع یا

مبادیات جماع یا سلے ہوئے یا پورے جسم کو چھپا لینے والے کپڑوں کا پہننا (صرف مردوں کے لیے) اور ناخن تراشنا، خوشبو لگانا، سر کا ڈھکنا (مردوں کے لیے) چہرے کو چھپانا (عورتوں کے لیے) یہ افعال حرام ہیں۔

۲- اسی طرح وہ تمام افعال بھی حرام ہیں جو محرم دوسرے کے ساتھ یا دوسرے کے لیے کرتا ہے مثلاً دوسرے کے بال مونڈنا یا خشکی میں شکار کرنے کی کوشش کرنا۔ الغرض وہ امور جو بحالت احرام حرام ہیں کل انیس ہیں:

۱- جماع اور مبادیات جماع مثلاً بوس و کنار وغیرہ

۲- اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا خواہ وہ کسی کام کے کرنے کا ہو یا کسی کام سے منع کیا گیا ہو۔

۳- لڑائی جھگڑا کرنا۔

۴- سلے ہوئے یا پورے جسم کو گھیر لینے والے کپڑے پہننا (مردوں کے لیے) اور دستانے پہننا (عورتوں کے لیے)

۵- ایسا لباس پہننا جو کسی خوشبودار رنگ میں رنگا ہوا ہو۔

۶- خوشبو لگانا

۷- تیل لگانا

۸- مہندی اور خضاب لگانا

۹- پھول یا اسی قسم کی کوئی اور چیز سونگھنا

۱۰- بال مونڈنا

۱۱- ناخن تراشنا

۱۲- عورت کے لیے چہرے کا ڈھانپنا

۱۳- مرد کے لیے سر کو ڈھکنا

۱۴- نکاح کرنا

۱۵- شکار کے پیچھے جانا

۱۶۔ ایسے جنگلی جانور کے شکار میں مدد دینا جس کا گوشت کھایا جاتا ہے

۱۷۔ شکار کو بھگانا یا ضائع کرنا اور شکار کی خرید وفروخت

۱۸۔ جنگلی شکار کا گوشت کھانا

۱۹۔ قابل شکار جنگلی جانور کے انڈے توڑنا یا اس کا دودھ دوہنا یا دودھ کی خرید وفروخت کرنا۔

اس سے پہلے ان میں سے بعض ممنوع باتوں کے بارے میں گفتگو ہوچکی ہے مثلاً خوشبو، مہندی اور خضاب، چہرہ ڈھانکنا یا دستانے پہننا۔

اب یہاں ہم چند اور ایسے امور کا تفصیلی بیان کرتے ہیں جن کا ارتکاب احرام کی حالت میں عورتوں کے لیے حرام ہے۔

بال مونڈنا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَحۡلِقُواْ رُؤُوسَكُمۡ حَتَّى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهُ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضاً أَوۡ بِهِ أَذًى مِّن رَّأۡسِهِ فَفِدۡيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوۡ صَدَقَةٍ أَوۡ نُسُكٍ

(البقرۃ:۱۹۶)

"اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر سر منڈوالے تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔"

اس آیت کریمہ کے نزول کا سبب جیسا کہ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا، یہ تھا کہ میرے سر میں تکلیف تھی اور مجھے نبی کریمؐ کی خدمت میں اس حالت میں لے جایا گیا کہ میرے سر کی جوئیں میرے چہرے پر پھر رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر نبیؐ نے فرمایا:

ما كنت ارى ان الجهد قد بلغ منك ما ارى، اتجد شاة؟ الخ

"مجھے یہ خیال نہ تھا کہ تمہاری تکلیف اس قدر بڑھ گئی ہے جو میں اب دیکھ رہا ہوں، کیا تم ایک بکری کی قربانی دینے کی قدرت رکھتے ہو؟"

میں نے عرض کیا: نہیں، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ: فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

آیت کریمہ کی وضاحت کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ: روزے تین دن کے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلانا، نصف صاع فی مسکین کے حساب سے۔

ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: لعلك یوذیك هو ام رأسك؟ (غالباً تم کو تمہارے سر کے یہ کیڑے تکلیف دے رہے ہیں؟) کعب بن عجرہؓ کہتے ہیں: میں نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! اس پر آپ نے فرمایا:

احلق رأسك و صم ثلاثة ایام او اطعم ستة مساکین او انسك شاة.
''اپنا سر منڈوا دو، اور تین دن کے روزے رکھ لو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو یا ایک بکری کی قربانی دو) یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔''

مذکورہ بالا آیت کریمہ اور نبی کریم ﷺ کی حدیث شریف کی روشنی میں اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ بحالت احرام حاجی عذر کے بغیر اپنے جسم یا سر کے بالوں میں سے کچھ بھی نہیں کٹوا سکتا۔

یعنی احرام باندھنے کے بعد کسی قسم کے بال خواہ سر کے ہوں یا مونچھوں کے یا بغل کے یا پیڑو کے یا ناک اور کان کے اندر جو بال ہیں ان میں سے کسی قسم کے بال نہ کٹوا سکتا ہے نہ منڈوا سکتا ہے اور نہ نوچ کر اکھاڑنے کی اجازت ہے۔

لہٰذا اگر بھول کر یا نادانستگی میں یا ناخن سے کھجاتے وقت یا کنگھی کرے وقت بھی کوئی بال ٹوٹ جائے گا تو حاجی پر فدیہ واجب ہوگا۔

المغنی میں ابن قدامہؒ نے لکھا ہے کہ محرم کو جو تکلیف ہو رہی ہے اس کا باعث اگر بال ہو مثلاً آنکھوں میں پڑبال اگ آئیں یا بھنویں اس قدر لمبی ہو جائیں کہ آنکھیں ان کے نیچے چھپ جائیں تو فقط اس بال کو جو آنکھ کے اندر ہے، اکھاڑنا اور ان بالوں کو جو آنکھوں کے اوپر لٹک کر آنکھوں کو موند رہے ہیں، کاٹنا جائز ہے اور ان کے اکھاڑنے یا کاٹنے پر فدیہ نہیں۔

ابن قدامہؒ کی بات سے بظاہر جو سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ ایسی حالت میں جو بال کاٹا یا اکھاڑا جائے گا اسے بال نوچنا یا کاٹنا نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ اس تکلیف کا ازالہ ہے جو بالوں کی وجہ سے آنکھوں کو پہنچ رہی ہے۔

کنگھی کرنا

کنگھی کرنے سے چوں کہ بال ٹوٹ اور جھڑ سکتے ہیں لہٰذا بعض فقہاء کا خیال ہے کہ بحالت احرام کنگھی نہیں کرنی چاہیے۔

چناں چہ احناف اور مالکیوں کے نزدیک تو کنگھی کرنا بالکل منع ہے اور شافعیوں کے نزدیک کنگھی کرنا اور بالوں کو ناخنوں سے کھجانا مکروہ ہے لیکن اگر کھجالے تو فدیہ واجب نہیں البتہ اگر یہ معلوم ہو کہ کنگھی کرنے سے بال ضرور ٹوٹیں گے تو کنگھی کرنا حرام ہے اور اگر کرے گا تو فدیہ واجب ہے۔

ابن قدامہؒ نے جو حنبلی المسلک ہیں، المغنی میں لکھا ہے کہ حاجی کو احرام کی حالت میں اپنا حلیہ درست کرنے، بال سنوارنے یا کسی قسم کی زینت و آرائش کی غرض سے آئینہ بھی نہیں دیکھنا چاہیے، لیکن امام احمدؒ کا قول ہے کہ آئینہ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں البتہ نہ تو بنے سنورے اور نہ اپنے جسم سے گرد و غبار جھاڑے۔ نیز امام احمدؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر آئینہ دیکھنے کی غرض بننا سنورنا ہو تو نہ دیکھے، پوچھا گیا: زینت کے ارادے سے کیا مراد ہے؟ امام احمدؒ نے کہا: مثلاً یہ کہ بالوں کو اس غرض سے دیکھے کہ اگر منتشر ہوں تو ان کو درست کرلے۔ اسی قسم کا قول عطاء سے بھی مروی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث ہے:

ان المحرم الاشعث الاغبر

”حاجی وہ ہے جس کے بال پراگندہ ہوں اور چہرہ ولباس غبار آلود ہو...)

اسی حدیث کے آخر میں ہے:

ان اللہ یباھی باھل عرفۃ ملائکتہ فیقول: یا ملائکتی انظروا الی عبادی قد اتونی شعثاء غبراء ضاحین.

”اللہ تعالیٰ میدان عرفات میں مقیم حاجیوں پر اپنے ملائکہ کے سامنے فخر سے فرماتا ہے: ارشاد ہوتا ہے، اے میرے فرشتو! میرے ان بندوں کو دیکھو جو میرے حضور پراگندہ حال، غبار آلود چہروں اور لباس کے ساتھ حاضر ہیں اور دھوپ میں بیٹھے ہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ عورت کے لیے بھی بحالت احرام کنگھی کرنا منع ہے کیوں کہ کنگھی سے بال ٹوٹنے کا احتمال ہے اور اگر کنگھی کرتے وقت کوئی بال ٹوٹ گیا تو فدیہ واجب ہوگا۔

بال ٹوٹنے کا فدیہ

☆ شافعیوں کے نزدیک کوئی شخص اگر بحالت احرام بال توڑے گا تو اس پر ایک مد فدیہ واجب ہوگا اور دو بال پر دو مد فدیہ ہوگا اور ایک بال کے کچھ حصہ کا حکم بھی وہی ہے جو پورے بال کا ہے۔

اور اگر تین یا تین سے زائد بال توڑے ہوں تو یا تو ایک ایسی بکری ذبح کرے جس میں وہ اوصاف پائے جاتے ہوں جو قربانی کے جانور کے لیے ضروری ہیں یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے اور یا تین دن کے روزے رکھے۔

بال ٹوٹنے پر فدیہ واجب ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جان بوجھ کر توڑا ہو بلکہ اگر بلا ارادہ بھی ٹوٹ جائے تو بھی فدیہ واجب ہوگا۔

☆ حنبلیوں کے نزدیک ایک بال یا بال کا کچھ حصہ توڑنے پر ایک مسکین کو ایک مد گندم یا نصف صاع جو وغیرہ دینا فدیہ ہے۔ اسی طرح تین بالوں تک ہر بال پر اتنا ہی فدیہ ہے۔

☆ حنفیوں کے نزدیک اگر سر یا داڑھی کو ایک چوتھائی سے کم مونڈا ہے تو نصف صاع گندم یا اس کی قیمت بطور فدیہ ادا کرے۔ اور اگر سر ایک چوتھائی یا اس سے زیادہ مونڈا ہے یا گردن کے بال یا دونوں بغلیں یا ایک بغل مونڈی ہے یا پیڑو کے بال مونڈے ہیں تو محرم پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی۔ بشرطیکہ عذر کے مونڈے ہوں لیکن اگر کسی عذر کی بنا پر مونڈے ہوں تو پھر اسے تین باتوں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار ہے:

۱- یا تو ایک بکری ذبح کرے۔

۲- یا تین دن کے روزے رکھے۔

۳- یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

☆ مالکیوں کے نزدیک بارہ عدد بالوں پر جو فدیہ واجب ہے اس کی مقدار نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے۔

بحالتِ احرام نکاح

حضرت عثمانؓ بن عفان سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا ینکح المحرم ولا ینکح و لا یخطب

''حاجی بحالت احرام نہ خود نکاح کرے نہ اس کا نکاح کیا جائے اور نہ منگنی کرے۔''

اس روایت کو بخاریؒ کے علاوہ احادیث کے تمام جامعین نے روایت کیا ہے البتہ ترمذیؒ کی روایت میں ''لایخطب'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا حدیث اس بارے میں صریح ہے کہ بحالت احرام عقد نکاح کرنا جائز نہیں تاہم اس مسئلہ میں یعنی بحالت احرام نکاح کے جواز و عدم جواز میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

جو علماء نکاح سے منع کرتے ہیں

☆ شافعی، مالکی اور حنبلی علماء اور امام لیثؒ و اوزاعیؒ کے نزدیک اور یہی قول حضرت عمر، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا ہے کہ حاجی کے لیے بحالت احرام اپنا نکاح کرنا یا دوسرے کا نکاح کرانا حرام ہے۔ ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے اور ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص بحالت احرام نکاح کرے گا تو نکاح باطل ہوگا۔

☆ امام نوویؒ (شافعیؒ) لکھتے ہیں:

”جاننا چاہیے کہ احرام کی حالت میں نکاح کرنے اور نکاح کرانے کی ممانعت سے مراد یہ ہے کہ ایسا کرنا حرام ہے لہٰذا اگر کوئی شخص بحالت احرام نکاح کرے گا تو اس کا نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا، خواہ یہ شخص جو احرام میں ہے مرد ہو جس نے اپنا نکاح کیا ہو یا عورت ہو جس سے نکاح کیا گیا یا اس نے اپنی ولایت یا وکالت میں کسی دوسرے کا نکاح کرایا ہو۔ ان تمام صورتوں میں نکاح باطل ہوگا حتی کہ اگر وہ مرد یا عورت جن کا نکاح ہوا ہے اور وہ ولی جس کی ولایت میں نکاح ہوا، احرام میں نہ ہوں لیکن انھوں نے نکاح کے لیے کسی ایسے شخص کو وکیل بنایا ہو جو احرام میں ہو تو بھی نکاح باطل ہوگا۔“

☆ ابن قدامہؒ حنبلی نے المغنی میں لکھا ہے کہ جب بھی کوئی مرد یا عورت بحالت احرام خود نکاح کریں یا ان کا نکاح کیا جائے ان کا نکاح باطل ہوگا اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نکاح کرنے والے دونوں میاں بیوی احرام میں ہوں یا ان میں کوئی ایک احرام میں ہو اس لیے کہ ایسے نکاح سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

مندرجہ بالا تینوں مسالک کا نقطۂ نگاہ محض یہی نہیں ہے کہ احرام کی حالت میں نکاح ناجائز ہے بلکہ ان کی رائے کا حاصل یہ ہے کہ احرام کی حالت میں اگر نکاح کیا جائے گا تو ایسا نکاح منعقد ہی نہ ہوگا۔

ان علماء کے دلائل جو احرام کی حالت میں نکاح جائز قرار دیتے ہیں

احناف اور امام سفیان ثوریؒ اس مسئلہ میں مذکورہ بالا تینوں مسلکوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ چناں چہ حنفیوں کے نزدیک احرام کی حالت میں نکاح جائز ہے کیوں کہ احرام کی بنا پر عورت سے یہ صلاحیت سلب نہیں ہو جاتی کہ اس سے نکاح کیا جائے بلکہ احرام صرف جماع سے روکتا ہے تو گویا احرام حیض، نفاس یا ظہار سے مشابہ ہوا کہ یہ بھی فقط جماع سے روکتے ہیں، عقد نکاح میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ چناں چہ حنفیوں کی رائے یہ ہے کہ حاجی بحالت احرام اپنا نکاح بھی کرسکتا ہے اور دوسرے کا نکاح کرا بھی سکتا ہے۔ یہ لوگ اپنی اس رائے کے لیے اس حدیث کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں جو حضرت ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ ”نبی

کریمؐ نے ام المومنین حضرت میمونہؓ سے اس حالت میں نکاح کیا تھا کہ آپ احرام میں تھے۔''

لیکن جمہور علماء نے احناف کی اس دلیل کو مندرجہ ذیل روایتوں کی بنا پر رد کر دیا ہے:

۱- ابوداؤدؒ اور اثرمؒ نے حضرت ابو رافعؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ام المومنین حضرت میمونہ سے جب نکاح کیا تو آپ حلال تھے یعنی احرام کھول چکے تھے۔ نیز ابو رافعؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت میمونہؓ کے درمیان پیغام لانے لے جانے والا میں خود تھا۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

۲- ابوداؤدؒ نے ام المومنین حضرت میمونہؓ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے مجھ سے نکاح کیا ہم دونوں احرام کھول چکے تھے اور جب آپؐ نے میرے ساتھ پہلی رات گزاری اس وقت بھی آپ احرام میں نہیں تھے۔ ابوداؤدؒ نے مزید لکھا ہے کہ ام المومنین حضرت میمونہ کا انتقال مقام سرف میں ہوا اور آپ کو اسی گنبد میں دفن کیا گیا جو وہاں تعمیر کیا گیا ہے۔(۱)

سرف: تنعیم کے قریب ایک مقام کا نام ہے اور تنعیم مکہ مکرمہ کے قریب ہے اور یہ مقال حِل (۲) میں حرم سے قریب ترین ہے۔

یہ دونوں حدیثیں اس بارے میں واضح ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جس وقت حضرت میمونہؓ سے عقد کیا آپ احرام کھول چکے تھے اور جب آپ نے حضرت میمونہ کے ساتھ پہلی رات گزاری اس وقت بھی آپ احرام میں نہیں تھے بلکہ احرام کھول چکے تھے۔

ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھا ہے کہ اگر مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کو صحیح مان لیا جائے پھر بھی وہ حدیث جو ہم نے بطور دلیل پیش کی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ حاجی بحالت احرام نہ اپنا نکاح کرے نہ دوسرے کا نکاح کرائے اس حدیث پر مقدم ہے کیوں کہ یہ نبی کریم ﷺ کی قولی حدیث ہے اور قولی حدیث زیادہ قابل اعتماد ہے۔

آگے چل کر ابن قدامہؒ لکھتے ہیں کہ ام المومنین اپنی ذات کے بارے میں زیادہ بہتر

---

(۱) مصنف کتاب کا مغالطہ ہوا ہے۔ یہ بات ابوداؤد نے نہیں بلکہ امام ترمذیؒ نے لکھی ہے۔ مترجم

(۲) حدودِ حرمین کے علاوہ پوری زمین حِل ہے۔

طریقے پر جانتی ہیں اور ابو رافعؓ جنہوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے خود اس واقعہ کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ سے زیادہ جانتے ہیں اور اگر ابن عباس اس زمانے میں بڑی عمر کے ہوتے تب بھی ان دونوں کی بات حضرت ابن عباسؓ کی بات پر قابل ترجیح تھی۔ کیوں کہ ابن عباسؓ اس وقت کم سن تھے اور معاملات کی حقیقت کو سبھی سمجھنے کے قابل نہ ہوئے تھے اور نہ واقعات سے پوری طرح باخبر تھے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی اس بات کا حضرت سعید بن المسیبؒ نے انکار کیا ہے۔ سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ:

''اس معاملہ میں حضرت ابن عباسؓ کو مغالطہ ہوا ہے کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ نے ام المومنین حضرت میمونہؓ سے اس وقت نکاح کیا تھا جب آپ احرام کھول چکے تھے لہٰذا حضرت ابن عباسؓ والی حدیث نا قابل عمل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے جو کہا ہے: (و هو محرم) ''آپؐ محرم تھے'' اس سے مراد یہ ہو کہ آپ اس وقت حرم میں قیام پذیر تھے یا یہ ہو کہ آپ نے نکاح ''شہر الحرام'' (ذی الحج) میں کیا تھا جیسا کہ بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ:

قتلوا عثمان بن عفان الخليفة محرما

''ان لوگوں نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو جو کہ خلیفہ رشد تھے اس حال میں شہید کیا کہ وہ محرم تھے۔''

اس میں لفظ ''محرم'' سے بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ احرام باندھے ہوئے تھے۔ حالاں کہ واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مہینہ حرمت والے مہینوں میں سے تھا اور اس بنا پر بھی محرم تھے کہ آپ کا خون محرّم تھا۔

بعض لوگوں نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ نکاح تو نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے اس وقت کیا تھا جب آپ احرام میں نہ تھے لیکن اس نکاح کا اظہار اس وقت کیا جب آپ احرام باندھ چکے تھے۔ (واللہ اعلم)''

ابن رشدؒ نے لکھا ہے کہ دونوں حدیثوں میں اس طرح تطبیق ممکن ہے کہ جس حدیث میں بحالت احرام نکاح سے منع کیا گیا ہے اس سے نہی حرمت نہیں بلکہ نہی کراہت

مراد لی جائے یعنی بحالت احرام نکاح کرنا کرانا مکروہ ہے، اور دوسری حدیث سے جواز مراد لیا جائے تو گویا صورت یہ بنی کہ نکاح کرنا کرانا جائز تو ہے لیکن مع الکراہت۔

لیکن ہمارا رجحان جس رائے کی جانب ہے اور جو ہمارے نزدیک صحیح ہے وہ جمہور کی رائے ہے یعنی بحالت احرام اپنا نکاح کرنا یا دوسرے کا کروانا دونوں ناجائز ہیں۔

احرام کی حالت میں نکاح کا گواہ بننا

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ جس طرح بحالت احرام اپنا نکاح کرنا منع ہے اسی طرح احرام باندھنے کے بعد حاجی کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے کے نکاح میں گواہ بنے خواہ وہ مرد وعورت جن کا نکاح ہو رہا ہے، احرام کی حالت میں نہ ہوں۔ بلکہ ہمارے بعض علماء (شافعی علماء) نے تو کہا ہے کہ اگر کسی ایسے شخص کو جس نے احرام باندھ رکھا ہے نکاح میں گواہ بنایا جائے گا تو یہ نکاح ہی منعقد نہ ہوگا اس لیے کہ گواہ عقد نکاح کا رکن ہوتا ہے جیسا کہ ولی رکن ہے لہٰذا رکن کے مفقود ہونے کی بنا پر نکاح ہی منعقد نہ ہوگا۔

لیکن صحیح رائے اس سلسلے میں جمہور علماء کی ہے اور وہ یہ ہے کہ نکاح منعقد ہو جائے گا۔

بحالت احرام منگنی کرنا

اوپر جو کچھ بیان ہوا یہ بحالت احرام نکاح کے بارے میں تھا۔ اب رہ گیا احرام کی حالت میں منگنی کا مسئلہ تو اس بارے میں:

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ حدیث نبویؐ میں جو (و لا یخطب) ''اور نہ منگنی کرے'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں اس سے نہی تنزیہی مراد ہے یعنی ایسا کرنا مکروہ تنزیہی ہے، حرام نہیں ہے۔

ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھا ہے کہ بحالت احرام مرد یا عورت دونوں کے لیے منگنی کرنا مکروہ ہے بلکہ اس شخص کے لیے جو احرام میں ہو یہ بھی مکروہ ہے کہ ان لوگوں کی منگنی کرائے جو حرام میں نہ ہوں۔

احرام کی حالت میں تیل لگانا

کیا محرم اور محرمہ کے لیے جائز ہے کہ اپنے سر یا جسم پر تیل لگائیں؟
اس سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف کی نوعیت درج ذیل ہے۔

☆ حنفی مسلک

حنفی علماء کے نزدیک بحالت احرام سر اور جسم پر تیل یا شیرہ لگانا حرام ہے کیوں کہ یہ چیزیں بناؤ سنگھار کے لیے استعمال کی جاتی ہیں اور حاجی پراگندہ بال اور غبار آلود چہرے والا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ان اللہ یباھی باھل عرفات اھل السماء فیقول لھم: انظروا الی عبادی جاؤنی شعثاء غبراء. (البیقھیؒ)

''بے شک اللہ تعالیٰ اہل عرفات پر آسمان والوں کے سامنے اظہار فخر کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے: ذرا دیکھو میرے ان بندوں کو جو پراگندہ حال اور غبار آلود جسم و لباس کے ساتھ میرے حضور حاضر ہیں۔''

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حاجی کی جو ہیئت اللہ تعالیٰ کو پسند ہے وہ یہی ہے کہ وہ پراگندہ حال اور غبار آلود جسم و لباس ہو۔

ان علماء نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے کہ جو چیزیں بدن پر استعمال کی جاتی ہیں ان کی تین قسمیں ہیں:

۱- وہ چیزیں جن کے استعمال کا مقصد محض خوشبو کا حصول ہوتا ہے اور خوشبو کی غرض سے ہی بنائی گئی ہیں۔ مثلاً مشک، کافور، عنبر اور اسی نوع کی دیگر اشیاء، اس قسم کی تمام اشیاء کا استعمال احرام کی حالت میں کسی شکل میں جائز نہیں خواہ وہ تیل کی طرح چپڑی جائیں یا کسی اور صورت میں استعمال کی جائیں۔

۲- کچھ چیزیں ایسی ہیں جو نہ تو خود خوشبو ہیں اور نہ ان پر لفظ خوشبو کا اطلاق ہوسکتا ہے اور نہ ان سے کسی طرح خوشبو کا کام لیا جاسکتا ہے۔ مثلاً چربی، یہ وہ قسم ہے جس کو حاجی

احرام کی حالت میں جسم یا سر سے ملنے کے لیے استعمال کرسکتا ہے اور ایسی چیزوں کا استعمال نہ گناہ ہے اور نہ ان کے استعمال پر کسی قسم کا فدیہ لازم آتا ہے۔

۳- تیسری قسم وہ چیزیں ہیں جو بطور خود تو خوشبو نہیں ہیں لیکن وہ خوشبو کی اساس بن سکتی ہیں۔ ایسی اشیاء کو کبھی تو خوشبو اور چکنائی کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی دوا کے طور پر۔ اس کی مثال روغن زیتون ہے۔ چناں چہ ایسی چیزوں کو اگر خوشبو اور چکنائی کے لیے استعمال کیا جائے تو ان کا حکم وہی ہے جو خوشبو کی استعمال کا یعنی بحالت احرام ان کا استعمال جائز نہیں ہے لیکن اگر ان چیزوں کو بطور دوا برتنا مقصود ہو تو احرام کی حالت میں ان کا بیرونی استعمال بھی جائز ہے اور کھانا بھی جائز ہے۔

☆ مالکی مسلک

مالکیوں کے نزدیک حاجی کے لیے بحالت احرام بالوں میں یا جسم پر یا جسم کے کچھ حصہ پر تیل لگانا حرام ہے۔ یہ تیل کسی قسم کا ہو اور اگر چہ اس میں کسی طرح کی خوشبو بھی نہ ہو۔ چناں چہ کوئی شخص اگر بحالت احرام سر میں یا جسم پر تیل ملے گا تو اس پر فدیہ واجب ہوگا البتہ اگر کوئی شخص کسی بیماری کے علاج کی غرض سے کوئی ایسا تیل استعمال کرے، جس میں خوشبو نہ ہو تو اسپر فدیہ نہیں ہے۔ یہ بیماری خواہ ہاتھوں کی ہتھیلیوں یا پاؤں کے تلووں میں ہو یا جسم کے کسی اور حصہ میں۔

☆ شافعی مسلک

شافعیوں کے نزدیک ایسا تیل لگانا حرام ہے جس میں خوشبو ہو۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا تیل سر کے بالوں کے سوا جسم کے ہر حصہ پر لگانا جائز ہے اور اگر کوئی ضرورت پیش آئے تو سر کے بالوں میں بھی لگا سکتا ہے۔ چناں چہ فرقد السجی نے سعید بن جبیرؒ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ احرام کے وقت ایسا تیل استعمال کرتے تھے، جس میں خوشبو نہیں ہوتی تھی۔ (احمد، بیہقی اور ترمذی)

☆حنبلی مسلک

حنبلیوں کے نزدیک احرام کی حالت میں خوشبودار تیل پورے جسم پر یا جسم کے کسی حصہ پر لگانا حرام ہے۔ اس کے برعکس وہ تیل جس میں خوشبو نہ ہو مثلاً زیتون کا تیل، ایسے تیل کا استعمال سر کے بالوں میں بھی اور چہرے پر بھی جائز ہے۔

مندرجہ بالا مسالکِ فقہ کا خلاصہ

تمام مسالک فقہ اس بات پر متفق ہیں کہ خوشبودار تیل کا استعمال بحالت احرام ناجائز ہے کیوں کہ بحالت احرام خوشبو کا استعمال منع ہے، اسی طرح سب مسالک فقہ اس پر متفق ہیں کہ بطور دوا ایسی ہر چیز احرام کی حالت میں استعمال کرنا جائز ہے جس میں خوشبو نہ ہو۔ اس کے بعد اختلاف جس میں رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ایسے تیل کو جس میں خوشبو نہ ہو، دوا کے علاوہ استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض نے اسے مطلقاً حرام کہا ہے مثلاً مالکی اور بعض نے اسے مطلقاً جائز قرار دیا ہے جیسے حنبلی اور بعض نے ایسا تیل سر اور چہرے کے سوا پورے جسم پر لگانا جائز قرار دیا ہے اور بعض نے اس سلسلے میں اس لحاظ سے فرق کیا ہے کہ جو چیزیں خوشبو کی اساس کا کام دیتی ہیں ان کا استعمال ناجائز ہے اور جن سے خوشبو کا کام نہیں لیا جاتا ہے وہ بہرحال جائز ہیں اور یہ مسلک حنفیوں کا ہے۔

ان علماء کے مابین غیر خوشبو دار تیل کے استعمال کے سلسلے میں اختلاف کا سبب یہ نہیں ہے کہ فی نفسہٖ ایسے تیل کا استعمال حرام ہے بلکہ اصل حرمت و کراہت حج کی حالت میں زینت اور بناؤ سنگھار کے حوالے سے ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر کوئی عورت بحالت احرام غیر خوشبودار تیل اپنے جسم کے کسی حصہ پر استعمال کرلے تو نہ کوئی گناہ ہے اور نہ اس پر فدیہ ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ سر کے بالوں میں غیر خوشبودار تیل بھی نہ لگائے، اس خوف سے کہ تیل لگاتے وقت کوئی بال ٹوٹ کر گر نہ جائے۔

احرام کی حالت میں سرمہ لگانا

اس بارے میں درج ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:

۱- نبیہ بن وہبؒ روایت کرتے ہیں کہ عمر بن عبید اللہؒ کی آنکھوں میں تکلیف ہوگئی اور جب ہم مقام روحاء پر پہنچے تو ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی۔ چناں چہ انھوں نے آدمی بھیج کر ابان بن عثمانؒ سے پچھوایا کہ اس حالت میں کیا کرنا چاہیے؟ تو ابان بن عثمان نے انہیں کہلوا بھیجا کہ آنکھوں پر صبر (ایلوا) کا ضماد کرو اس لیے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک ایسے شخص کی آنکھوں پر جو احرام میں تھا اور اس کی آنکھوں میں تکلیف تھی صبر (ایلوا) کا لیپ کروایا تھا۔ (مسلم، احمد اور دارمی)

۲- نبیہ بن وہبؒ بیان کرتے ہیں کہ عمر بن عبید اللہ بن معمرؒ کی آنکھوں میں آشوب تھا۔ انھوں نے سرمہ لگانے کا ارادہ کیا تو ابان بن عثمان نے ان کو سرمہ لگانے سے منع کر دیا اور مشورہ دیا کہ آنکھوں پر ایلوے کا لیپ کریں اور حضرت عثمان بن عفانؓ کے حوالے سے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کیا تھا۔ (مسلم)

۳- شمیسہؒ بیان کرتی ہیں کہ میں احرام میں تھی کہ میری آنکھیں دکھنی آ گئیں۔ چناں چہ میں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے سرمہ لگانے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: سوائے معدنی سرمہ (اثمد) کے جو چیز چاہو آنکھوں میں لگا سکتی ہو یا آپ نے فرمایا: سوائے سیاہ سرمے کے جو سرمہ چاہو لگا سکتی ہو۔ نیز یہ کہ سیاہ سرمہ بھی حرام نہیں ہے لیکن سیاہ سرمہ زینت کے کام آتا ہے اور بحالب احرام بناؤ سنگھار ہمارے نزدیک مکروہ ہے۔ پھر آپ نے یہ بھی فرمایا: اگر تم چاہو تو صبر (ایلوا) آنکھوں میں لگا لو لیکن میں نے ایلوا لگانے سے انکار کر دیا۔ (بیہقی)

مندرجہ ذیل احادیث کی روشنی میں علماء کا اس بات پر اتفاق ہے اور یہی حنفی مسلک ہے کہ علاج کی غرض سے اور دوا کے طور پر سرمے کا استعمال جائز ہے اور زینت و آرائش کے لیے ناجائز اور اگر کسی محرم نے ایسا سرمہ لگایا جس میں خوشبو ہو تو اس پر فدیہ واجب ہے خواہ دوا

کے طور پر استعمال کیا ہو یا بغیر دوا کے۔ اور غیر خوشبودار چیز بغیر دوائی ضرورت کے استعمال کرنا منع ہے۔ کیوں کہ یہ چیز زینت کے زمرے میں آ جاتی ہے۔ لیکن یہ ممانعت کراہت تنزیہی ہے۔ اس لیے فدیہ واجب نہیں ہوتا۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ اگر محرم گرمی کی شدت کی بنا پر اپنی آنکھوں میں معدنی سرمہ سیاہ یا اسی قسم کی کوئی اور چیز ڈالے تو کوئی حرج نہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ سے مروی ہے کہ حاجی بحالت احرام سرمہ لگا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا مقصد زینت و آرائش نہ ہو، اس سے پوچھا گیا کہ مرد اور عورت دونوں لگا سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں دونوں۔

اور سرمہ لگانا مکروہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ یمن سے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ حضرت فاطمہؓ نے احرام کھول دیا ہے اور رنگین کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور سرمہ لگا رکھا ہے۔ حضرت علیؓ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو حضرت فاطمہؓ نے کہا مجھے ایسا کرنے کا حکم میرے والد محترم نے دیا ہے۔ حضرت علیؓ نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: فاطمہؓ نے سچ کہا ہے۔ (یہ روایت مسلم اور بعض دیگر کتب حدیث میں ہے)۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ سرمہ لگانا احرام کھولنے سے پہلے منع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اس کا ناپسند فرمایا تھا لیکن حضرت فاطمہؓ چوں کہ احرام کھول چکی تھیں اس لیے نبی کریم ﷺ نے انہیں سرمہ لگانے اور رنگین کپڑے پہننے کی اجازت دے دی تھی۔

علامہ خرقیؒ لکھتے ہیں کہ جس عورت نے احرام باندھ رکھا ہو وہ سیاہ سرمہ نہ لگائے اس لیے کہ بحالت احرام سیاہ سرمے کا استعمال مرد اور عورت دونوں کے لیے مکروہ ہے۔ لیکن بالخصوص عورت کے لیے مکروہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ سرمہ عورت کے لیے زینت و آرائش کا خاص ذریعہ ہے۔

ابن قدامہؒ نے لکھا ہے: احرام کی حالت میں سیاہ معدنی سرمے کا استعمال مکروہ ہے، لیکن اس کے استعمال پر فدیہ واجب نہیں ہوتا اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ ہمارے علم کی حد تک اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ اگر محرم اور محرمہ عورت نے سرمہ لگا لیا تو کم سے کم میرے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ ان پر فدیہ دینا ضروری ہو۔

مجاہدؒ کا قول بھی یہی ہے کہ سرمہ زینت ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ علاج کی غرض سے سرمے کا استعمال جائز ہے اور اگر مقصد علاج نہ ہوتو ناجائز یعنی مکروہ ہے اور اگر سرمہ خوشبودار ہوتو اس کے استعمال پر فدیہ واجب ہوگا خواہ دوا کے طور پر استعمال کیا جائے یا بغیر ضرورت کے لگایا جائے۔

احرام کی حالت میں جماع

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلۡحَجُّ أَشۡهُرٌ مَّعۡلُومَاتٌ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الۡحَجَّ فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوقَ وَلاَ جِدَالَ فِي الۡحَجِّ (البقرۃ:۱۹۷)

''حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں، جو شخص ان مقررہ مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدفعلی، کوئی لڑائی، جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔''

یہ آیت کریمہ جماع اور مبادیات جماع مثلاً بوس و کنار وغیرہ کے احرام کی حالت میں حرام ہونے کے سلسلے میں بالکل واضح ہے۔ حج کے دوران جماع کرنا ان بڑے جرائم میں سے ہے جو حج کو یکسر فاسد کردیتے ہیں اور شرعاً اس پر جو جرمانہ ہے وہ بھی سب جرمانوں سے زیادہ سخت ہے جو بسااوقات ایک اونٹ ذبح کرنے اور حج کی قضا کرنے کے لیے دوبارہ حج کرنے تک پہنچ جاتا ہے۔

حج اللہ تعالیٰ کی عبادت کے مناسک میں سے ہے۔ لہٰذا حاجی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اللہ کی عبادت کا یہ فریضہ بجا لا رہا ہو اور اس کے ساتھ اس قسم کی حکم عدولی کا ارتکاب کرے کہ جماع یا مبادیات جماع میں مشغول ہو۔ اگر ایسا کرے گا تو اس کا حج بھی فاسد ہو جائے گا۔

ابن منذرؒ نے لکھا ہے کہ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حالت احرام میں جماع کے سوا کوئی اور حرکت ایسی نہیں ہے جس کے کرنے سے حج فاسد ہو جائے۔

اور ابن رشدؒ نے لکھا ہے کہ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے کہ حاجی کے لیے ہم بستری

اسی وقت حرام ہوجاتی ہے، جب وہ احرام باندھ کر حج بیت اللہ کی نیت کرتا ہے۔

جماع سے حج اور عمرہ دونوں فاسد ہوجاتے ہیں اور اس سلسلے میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ جماع قصداً کرے یا بھول کر، اسے یہ معلوم ہو کہ جماع کرنا بحالت احرام منع ہے یا معلوم نہ ہو، ہر صورت میں جماع سے حج اور عمرہ دونوں باطل و فاسد ہوجائیں گے۔

یہی حکم حالتِ احرام میں مشت زنی، عورت کو چھونے اور بوسہ لینے کا ہے۔ اور جماع خواہ عورت کے مقام مخصوص میں کیا جائے یا عمل قوم لوط کیا جائے یا جانور کے ساتھ بدفعلی کی جائے سب کا حکم برابر ہے یہی قول امام شافعیؒ، امام ابوثورؒ اور حنابلہ کا ہے۔

امام مالکؒ نے مؤطا میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے جو حج کا احرام باندھے ہوئے تھا، اپنی بیوی سے جماع کرلیا۔ ان سب نے جواب دیا کہ دونوں میاں بیوی اسی طرح حج کے اعمال جاری رکھیں حتی کہ اپنا حج مکمل کرلیں پھر آئندہ سال دوبارہ حج کریں اور قربانی کریں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ یہ دونوں آئندہ سال جب حج کا احرام باندھیں تو ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں اور حج پورا ہونے تک ایک دوسرے سے الگ رہیں۔ نیز امام مالکؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے طواف افاضہ کرنے سے پہلے منیٰ میں اپنی بیوی سے جماع کرلیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے حکم دیا کہ وہ ایک اونٹ کی قربانی کرے۔

نیز امام مالکؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں اور میری بیوی دونوں حالت احرام میں تھے اور اسی حالت میں میں نے اپنی بیوی سے جماع کرلیا ہے تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے کہا: تمہارا حج فاسد ہوگیا ہے، اب طریق کار یہ ہے کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں دوسرے حاجیوں کے ساتھ ہر وہ عمل کرو جو وہ کریں اور جب سب حاجی احرام کھولیں تو تم بھی احرام کھول دو پھر آئندسال تم اور تمہاری بیوی دونوں دوبارہ حج کرو اور ایک ایک جانور کی قربانی کرو اور اگر تمہیں قربانی کا جانور میسر نہ آئے تو روزے رکھو، تین روزے حج کے دنوں میں اور سات گھر لوٹ کر۔ (المغنی)

مفسر قرطبی لکھتے ہیں کہ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ وقوفِ عرفہ سے پہلے جماع

کرنے سے حج فاسد ہو جاتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو اس پر آئندہ سال حج کی قضا اور قربانی کرنا واجب ہوگا۔ لیکن وقوفِ عرفہ کے بعد جماع کی صورت میں اختلاف ہے اور اس میں تحلل اول کے بعد جماع کرنے اور تحلل ثانی کے بعد جماع کرنے پر بھی حکم ے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اور بعض کے نزدیک حج فاسد ہو جاتا ہے اور بعض کے نزدیک محض فدیہ ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے اس اختلاف کی تفصیل جاننے کے لیے مختلف مسالکِ فقہ کی کتابوں سے رجوع کیا جائے۔

بوسہ و دیگر محرّکاتِ جماع کے بارے میں احکام

محدث اثرمؒ نے اپنی سند سے اور عبد الرحمٰن بن حارثؒ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ عمر بن عبد اللہؒ نے احرام کی حالت میں عائشہ بنت طلحہ کا بوسہ لے لیا پھر اس کے بارے میں علماء سے پوچھا تو متفقہ فیصلہ یہ دیا گیا کہ وہ ایک قربانی کریں۔

اور حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انھوں نے ایک شخص سے جس نے احرام کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لیا تھا۔ یہ کہا کہ تمہارا حج فاسد ہوگیا۔

عطاءؒ کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص احرام کی حالت میں بوسہ لے یا شہوت سے عورت کو چھوئے تو اس پر ایک دم واجب ہے۔

سعید بن جبیرؒ کا قول ہے کہ بحالت احرام بوسہ لینے سے مذی خارج ہو یا نہ ہو ایک دم واجب ہو جاتا ہے۔

سعید بن جبیرؒ کا قول یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص ان حرکات کا مرتکب ہوا جو جماع سے پہلے کی جاتی ہیں اور جماع نہیں کیا تو اس پر ایک گائے کی قربانی ہے۔

امام حسن بصریؒ نے ایسے شخص کے بارے میں جس نے اپنی لونڈی کی شرم گاہ پر ہاتھ مار دیا تھا، یہ فیصلہ دیا تھا کہ وہ ایک اونٹ ذبح کرے۔

بوسہ، شہوت سے نظر ڈالنا اور وہ امور جو جماع سے پہلے کیے جاتے ہیں، ان کے بارے میں فقہاء کے مسائل و احکام بہت زیادہ تفصیل طلب ہیں جو اس مختصر کتابچہ میں نہیں سما

سکتے۔ بعض فقہاء نے ان امور کے ارتکاب پر اونٹ کی قربانی ضروری قرار دی ہے اور بعض کے نزدیک اونٹ کی قربانی کے ساتھ حج یا عمرہ کی قضا بھی لازم آتی ہے، بعض کے نزدیک صرف ایک بکری ذبح کرنا کافی ہے۔ ان اختلافات کی تفصیل دیکھنے کے لیے فقہ کی ان کتابوں سے رجوع کیا جائے، جن میں ان مسائل پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

☆☆

حج کے اعمال و مناسک

حج کے ارکان بھی ہیں، واجبات بھی اور سنتیں بھی۔

حج کے ارکان چار ہیں:

۱- احرام

۲-طواف (طواف افاضہ یا طواف رکن)

۳-صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور

۴-وقوفِ عرفہ

لیکن اس میں بھی فقہاء کے درمیان کسی قدر اختلاف ہے چناں چہ بعض کے نزدیک حج کے رکن صرف دو ہیں اور بعض نے چار کے علاوہ مزید دو اعمال کو رکن قرار دیا ہے وغیرہ۔

ان ارکان کے علاوہ کچھ واجبات ہیں، جن کے بارے میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے اور یہ سارا اختلاف محض اس بات میں ہے کہ کون سا عمل رکن ہے اور کون سا واجب ہے۔ گویا ایک عمل بعض فقہاء کے نزدیک رکن ہے لیکن دوسرے فقہاء اسے واجب قرار دیتے ہیں اور اسی طرح ایک عمل بعض فقہاء کے نزدیک واجب ہے جب کہ بعض دوسرے فقہاء اسے رکن قرار دیتے ہیں۔

ہم اس مقام پر اس اختلاف سے صرف نظر کرتے ہیں محض حج کے ان اعمال کے بیان پر اکتفا کریں گے جو احرام باندھنے کے بعد حاجی کو ادا کرنے ہوتے ہیں، قطعِ نظر اس

سے کہ وہ واجب ہیں یا رکن۔ چناں چہ ہم مندرجہ ذیل موضوعات پر گفتگو کریں گے۔

۱- طواف بیت اللہ

۲- صفا اور مروہ کی سعی

۳- وقوفِ عرفہ

۴- قیام مزدلفہ

۵- رمیِ جمار

۶- بال کٹوانا

۷- قربانی

لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم نے حج کے تمام اعمال کا احاطہ کرلیا ہے بلکہ ہم اس رسالہ میں حج اور عمرہ کے محض ان اعمال و مسائل سے بحث کر رہے ہیں جن کا تعلق بطور خاص عورتوں سے ہے۔

طوافِ بیت اللہ کا بیان

بیت اللہ کا طواف چار قسم کا ہے:

۱- طوافِ قدوم: یہ سنت ہے۔

۲- طوافِ افاضہ: یہ رکن ہے۔

۳- طوافِ وداع: جسے طوافِ صدر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ واجب ہے

۴- نفلی طواف:

طواف کے شرائط، واجبات، سنتیں وغیرہ ہیں، جن کی تفصیل کتب فقہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس مقام پر ہم ان میں س بعض اہم امور کا ذکر کریں گے۔

۱- طہارت

طواف کے شرائط میں سے ایک شرط طہار ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

الطواف صلوٰة الا ان الله تعالیٰ احل فيه الكلام فمن تكلم فلا يتكلم الا بخير.

''طواف بھی نماز ہے البتہ اللہ تعالیٰ نے طواف میں باتیں کرنا جائز کر دیا ہے لہٰذا طواف کرتے وقت اگر کوئی شخص بات کرے تو صرف بھلی بات کرے۔''

یہ روایت ترمذیؒ اور دار قطنی نے بیان کی ہے اور الحاکم، ابن خزیمہ اور ابن سکنؒ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

۲۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس نبی کریمؐ ایسی حالت میں تشریف لائے کہ میں رو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر آپ نے دریافت فرمایا: ''أنفست؟'' کیا تمہیں خونِ حیض شروع ہوگیا؟ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ مین نے عرض کیا: ہاں! اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ان هذا شيء كتبه الله على بنات آدم، فاقض ما يقضي الحاج غير ان لا تطوفي بالبيت حتى تغتسل.

''یہ ایک ایسا امر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے نصیب میں لکھ دیا ہے لہٰذا اب تم وہ اعمال پورے کرو جو حاجی کرتے ہیں، سوائے طواف بیت اللہ کے، طواف تم اس وقت تک نہیں کرسکتیں جب تک کہ غسل نہ کرلو۔''

یہ روایت مسلم میں ہے۔

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نجاست حکمی اور حقیقی دونوں سے پاک ہونا صحتِ طواف کے لیے شرط ہے۔

چناں چہ نہ تو بغیر وضو کے طواف صحیح ہوگا اور نہ حالتِ جنابت میں اور نہ حیض و نفاس کی حالت میں، جب تک کہ غسل نہ کرلے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے جسم یا لباس پر نجاست لگی ہوئی ہو تو اس کا طواف بھی درست نہیں۔ یہ مسلک امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ کا مشہور قول بھی یہی ہے اور جمہور فقہاء کا مسلک بھی یہی ہے۔ یہ لوگ اس سلسلے

میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:

ان النفساء و الحائض تغتسل و تحرم و تقضی لمناسك كلها غير انها لا تطوف بالبيت حتى تطهر

''نفاس اور حیض کی حالت میں عورت غسل کر کے احرام باندھ لے اور تمام مناسک حج ادا کرے، سوائے اس کے کہ وہ بیت اللہ کا طواف اس وقت تک نہیں کرسکتی جب تک کہ پاک نہ ہوجائے۔''

یہ روایت امام احمدؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کی ہے اور اسے حسن غریب قرار دیا ہے۔

حدیث میں پاک ہونے سے مراد غسل کرنا ہے جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے جو اوپر بیان ہوچکی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ ایک ایسا امر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے نصیب میں لکھ دیا ہے لہٰذا تم وہ سب اعمال پورے کرو جو حاجی کرتے ہیں سوائے اس کے کہ بیت اللہ کا طواف نہیں کرسکتیں۔ جب تک کہ غسل نہ کرلو۔ (مسلم)

چناں چہ حیض و نفاس کی حالت میں عورت کو طواف بیت اللہ سے اس وقت تک کے لیے منع کر دیا گیا ہے جب تک کہ اس کا خون بند نہ ہوجائے۔

☆ حنفی مسلک

احناف کے نزدیک طواف کرتے وقت نجاست حکمی اور نجاست ظاہری سے پاک ہونا شرط نہیں ہے۔ البتہ سنتِ موکدہ ضرور ہے۔ چناں چہ حنفی مسلک کے مطابق لباس، بدن اور جگہ کا پاک ہونا سنت موکدہ ہے۔ اگر کسی شخص نے اس حال میں طواف کیا کہ اس کا پورا لباس نجس تھا، تب بھی اس کا طواف درست ہوگا، اور اس پر کوئی فدیہ نہیں۔ لیکن قولِ صحیح کے مطابق ایسا شخص ترک سنت کا مرتکب ضرور ہوا ہے۔

☆ طواف میں طہارت شرط نہ ہونے کی ایک روایت امام احمد بن حنبلؒ سے بھی

چناں چہ اگر کسی شخص نے بے وضو طواف کیا تو اس کا طواف صحیح تو ہوگیا البتہ اسے ایک بکری بطور فدیہ ذبح کرنا لازم ہوگا۔

اور اگر کسی مرد یا عورت نے جنابت کی حالت میں یا حیض و نفاس کی حالت میں طواف کیا تو اس کا طواف تو درست ہوگیا لیکن اس پر بطور فدیہ ایک پانچ سالہ اونٹ (بدنہ) ذبح کرنا لازم ہوگا اور جب تک مکہ میں ہے کسی وقت اس طواف کو بھی دہرا لے یعنی دوبارہ طواف کرے۔ یہ قول جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں احناف کا ہے اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبلؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔

اور یہ حضرات حیض یا نفاس کی حالت میں طواف کرنے والی عورت پر جو پانچ سالہ اونٹ (بدنہ) کی قربانی بطور فدیہ لازم قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی ان کے نزدیک اس بنا پر نہیں ہے کہ اس کا طواف درست نہیں ہوا بلکہ اس بنا پر ہے کہ وہ مسجد حرام میں حیض یا نفاس کی حالت میں داخل ہوئی۔ کیوں کہ عورت کو حیض یا نفاس کی حالت میں مسجد حرام میں داخل ہونا منع ہے لہٰذا اگر کوئی عورت حیض یا نفاس کی حالت میں مسجد حرام میں داخل ہوگی تو اس پر ایک پانچ سالہ اونٹ بطور فدیہ ذبح کرنا لازم ہوگا۔

اگر ہم مسائل حج کے بارے میں فقہاء کے اقوال کا تتبع کریں تو ہمیں بدنہ یعنی پانچ سالہ اونٹ بطور فدیہ قربان کرنے کا حکم صرف دو موقعوں پر ملتا ہے ایک بحالت احرام جماع کرنے پر اور دوسرے مسجد حرام میں بحالت جنابت یا حیض و نفاس داخل ہونے پر۔

استحاضہ کی مریض عورت کا طواف

جمہور فقہاء کے نزدیک حیض یا نفاس کی حالت میں یعنی پاک ہونے سے پہلے طواف کرنا جائز نہیں ہے لیکن اس حکم کا اطلاق ایسی عورت پر نہیں ہوتا جو استحاضہ کی مریض ہو یا جسے کسی اور علت یا خرابی کی وجہ سے خون آتا ہو۔ چناں چہ ایسی عورت جس کا خون استحاضہ نہ رکتا ہو یا جسے کسی اور وجہ سے یا اندرونی خرابی کی بنا پر خون آرہا ہو، طواف بیت اللہ کرسکتی ہے اور اس پر کوئی فدیہ یا گناہ نہیں ہے۔

امام مالکؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے ایک عورت نے مسئلہ پوچھا کہ میں اس غرض سے آئی تھی کہ بیت اللہ کا طواف کروں، لیکن جب میں مسجد حرام کے دروازے پر پہنچی تو میرا خون بہنے لگا۔ لہٰذا میں لوٹ گئی اور اس وقت تک رکی رہی کہ خون بند ہوگیا۔ اس کے بعد دوبارہ طواف کی غرض سے مسجد حرام کی جانب روانہ ہوئی اور پھر جب مسجد کے دروازے پر پہنچی تو خون بہنے لگا۔ یہ سن کر حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ شیطان کی حرکت ہے لہٰذا تم غسل کرو اور ایک کپڑا کس کر باندھ لو اور اس کے بعد طواف کرلو۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ اس عورت کو جو خون آیا یہ حیض یا نفاس کا خون نہ تھا بلکہ کسی بیماری کی وجہ سے خون آرہا تھا۔

۲- ستر

طواف کے شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ طواف کرتے وقت حاجی کے جسم کا کوئی ایسا حصہ ننگا نہ ہو جس کو چھپانا ضروری ہے۔ یہ شرط امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور فقہاء کے نزدیک ہے۔

ان کی دلیل حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے، حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع سے پہلے حج میں جس میں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو امیر الحج بنایا تھا، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مجھے ایک جماعت کے ساتھ عید قربان کے دن لوگوں میں یہ اعلان کرنے کے لیے بھیجا کہ اس سال کے بعد نہ تو کوئی مشرک حج کرسکتا ہے اور نہ کوئی شخص برہنہ حالت میں خانہ کعبہ کا طواف کرسکتا ہے۔ یہ روایت بخاری، مسلم، نسائی اور بیہقی رحمہم اللہ نے نقل کی ہے۔

نماز کی حالت میں عورت کے لیے چہرے اور ہاتھوں کے سوا پورے جسم کو ڈھانپنا واجب ہے اور یہ بات پہلے بیان ہوچکی ہے کہ طواف بھی نماز ہے۔ البتہ طواف میں اللہ تعالیٰ نے بات کرنا جائز کر دیا ہے۔ لہٰذا جو امور نماز کے لیے شرط ہیں وہی سب طواف میں بھی شرط ہیں۔

ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھا ہے کہ احرام کی حالت میں عورت کے لیے بہ یک وقت دو ایسے حکم واجب التعمیل ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے متضاد ہیں:

۱- سر کو ڈھانکنے کا حکم اور

۲- چہرے کو کھلا رکھنے کا حکم۔ اب صورت حال یہ ہے کہ پورے سر کو ڈھانکنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ چہرے کا کچھ حصہ بھی نہ ڈھانکا جائے اور نہ پورے چہرے کو کھولنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سر کا کچھ حصہ نہ کھلے۔ اس لیے سر کو اس طرح ڈھانپنا کہ اس کے نتیجے میں چہرے کا کچھ حصہ بھی ڈھک جائے زیادہ بہتر ہے کیوں کہ سر کو ڈھکنے کی تاکید زیادہ کی گئی ہے اور پورا سر واجب الستر ہے۔ نیز سر کو کھولنے کی حرمت احرام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ بغیر احرام کے بھی سر کا کھولنا عورت کے لیے حرام ہے۔ اس کے برعکس چہرے کا کھولنا صرف بحالت احرام ضروری ہے گویا احرام کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ ہمارے نزدیک تو احرام کی حالت میں بھی پورے چہرے کو ڈھانپنا مباح ہے تو اگر ستر ڈھکنے کی وجہ سے چہرے کا کچھ حصہ بھی ڈھک جائے تو یہ بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

نیز ابن قدامہؒ نے اپنی کتاب "المغنی" میں لکھا ہے کہ عورت اگر احرام میں نہ ہو تو اس کے لیے نقاب پہن کر طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے نقاب پہن کر طواف کیا، عطاءؒ پہلے نقاب پہن کر طواف کرنے کو مکروہ خیال کرتے تھے لیکن بعد ازاں اس سے رجوع کر لیا۔

ابو عبداللہؒ نے ابن جریجؒ سے روایت کیا ہے کہ عطاءؒ عورت کے لیے اگر وہ احرام میں نہ ہو کسی ہنگامی ضرورت کے ماتحت بھی نقاب پہن کر طواف کرنا مکروہ خیال کرتے تھے، حتی کہ میں نے ان کو یہ واقعہ سنایا جو حسن بن مسلمؒ نے صفیہ بنت شیبہؒ سے روایت کیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے نقاب پہن کر طواف کیا تھا۔ چناں چہ امام عطاءؒ نے اس کے مطابق اپنی رائے بدل لی۔

حنفیوں کے نزدیک طواف میں عورت کے لیے اپنے قابلِ ستر حصوں کا چھپانا واجب ہے اور وہ وہی حصے ہیں، جن کا چھپانا نماز میں واجب ہے چناں چہ طواف کرتے وقت

اگر کسی عورت کے ایسے حصہ جسم کا جس کو نماز میں چھپانا واجب ہے، چوتھا حصہ کھل گیا تو گویا اس نے واجب ترک کر دیا اور اس پر طواف کا اعادہ یعنی دوبارہ طواف کرنا واجب ہوگا یا ایک جانور بطور فدیہ ذبح کرنا لازم ہوگا۔

یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ستر یعنی جسم کے قابل ستر حصوں کو چھپانا اصل میں فرض ہے لیکن یہاں جو اسے واجب کہا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ستر نہ کرنے سے طواف باطل نہیں ہوتا بلکہ ہو جاتا ہے لیکن ایسا کرنا گناہ ہے اور ایسے طواف کا اعادہ واجب ہے اور اس شخص پر جو ایسا کرے گا بطور فدیہ جانور ذبح کرنا لازم ہوگا۔

لیکن اگر قابلِ ستر عضو کا جو حصہ طواف میں کھلا رہ گیا وہ چوتھائی سے کم تھا تو پھر کوئی حرج نہیں جیسا کہ نماز کا حکم ہے یعنی نماز میں بھی اگر قابلِ ستر عضو کا چوتھائی سے کم حصہ کھلا رہ جائے تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔

مندرجہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت نے اگر اس حال میں طواف کیا کہ اس کے جسم کا کوئی ایسا حصہ کھلا تھا جس کا کھلنا جائز نہیں، یعنی چہرے اور ہاتھ کے سوا کوئی حصہ جسم کھلا رہ گیا تو اس پر دوبارہ طواف کرنا واجب ہوگا اور بعض علماء کے نزدیک چہرے کو ڈھکنے میں کوئی حرج نہیں .... احرام کی حالت میں طواف کرتے وقت چہرے کو ڈھکنے نہ ڈھکنے کے سلسلے میں علماء کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی تفصیل اور شرائط ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

عورت پر ''اضطباع'' نہیں ہے

''اضطباع'' سے مراد یہ ہے کہ حاجی اپنی احرام کی چادر کا درمیانی حصہ اپنی دائیں بغل کے نیچے رکھے اور چادر کے دونوں کنارے بائیں کندھے کے اوپر ڈال لے۔ یہ طریقہ احناف کے نزدیک اور امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور فقہاء کے نقطہ نگاہ سے مردوں کے لیے سنت ہے، کیوں کہ حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خانہ کعبہ کا طواف اس حالت میں کیا کہ آپ کے جسم مبارک پر ایک چادر تھی جسے آپ نے اس طرح پہن رکھا تھا کہ اس کا درمیانی حصہ آپ کی دائیں بغل کے نیچے تھے اور چادر کے دونوں

کنارے آپ کے بائیں کندھے پر پڑے تھے۔

یہ روایت مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، بیہقی اور ترمذی میں ہے اور امام ترمذیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔

اس بارے میں تمام روایات متفق ہیں کہ "اضطباع" (احرام کی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر اس کے دونوں سروں کا بائیں کندھے پر ڈال لینا) صرف مردوں کے لیے مستحب ہے۔ نیز اس پر بھی سب روایات متفق ہیں کہ "اضطباع" عمرے کے طواف میں اور حج کے طوافوں میں سے صرف ایک طواف میں یعنی طواف قدوم میں یا طوافِ افاضہ میں سنت ہے۔ الغرض اضطباع صرف مردوں کے لیے ہے عورتوں کے لیے نہیں ہے کیوں کہ اضطباع میں دایاں کندھا کھولنا پڑتا ہے۔ دوسرے، عورت احرام میں چادر نہیں پہنتی، بلکہ عورت تو اپنا معمول کا لباس پہنتی ہے لہٰذا اضطباع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عورت کے لیے بہرحال ایسی صورت ہونی چاہیے جس میں اس کا ستر برقرار رہے لہٰذا اس کے لیے احرام کی حالت میں بھی چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ جسم کا کوئی اور حصہ کھولنا جائز نہیں۔

۳-عورت طواف میں "رمل" بھی نہیں کرے گی

مردوں کے لیے خواہ وہ حج کر رہے ہوں یا عمرہ طواف قدوم کے پہلے تین چکروں میں "رمل" کرنا یعنی کندھے اچکا کر اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر تیز تیز چلنا سنت ہے اور اس مسئلہ میں ہمارے علم کی حد تک علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

رمل کرتے وقت حاجی کندھے اچکا کر اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر تیز چلتا ہے۔ لیکن یہ چال دوڑنے سے کم ہوتی ہے اور اس میں اچھل کود بھی نہیں ہوتی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حجر اسود سے حجر اسود تک طواف کے تین چکروں میں "رمل" کیا اور چار چکروں میں معمول کی چال چلے۔ یہ روایت امام احمدؒ، مسلم، نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی رحمہم اللہ عنہم نے نقل کی ہے۔

عورتوں کے لیے رمل جائز نہیں ہے، حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے: عورتوں کے لیے نہ تو طوافِ بیت اللہ کے وقت تیز تیز چلنا یعنی رمل ہے اور نہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی میں (تیز چلنا) ہے۔ یہ روایت بیہقی میں ہے۔

ابن منذرؒ نے لکھا ہے کہ علماء کا اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ عورت کے لیے نہ تو طواف بیت اللہ کرتے وقت ''رمل'' ہے، نہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے وقت تیز چلنا ہے اور نہ بحالت احرام اضطباع یعنی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر اس کے دونوں سروں کو بائیں کندھے پر ڈالنا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام امور بہادری اور قوت کے اظہار کی غرض سے کیے جاتے ہیں اور عورتوں سے یہ چیز یعنی اظہار قوت و شجاعت مطلوب نہیں ہے بلکہ عورت کے لیے تو جسم کو مستور کرنا ضروری ہے اور 'رمل' اور اضطباع میں جسم کھلتا ہے۔

۴۔ عورتیں مردوں سے دور رہ کر طواف کریں

اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ طواف کرنے والے کے لیے بیت اللہ کا قرب مسنون ہے۔ کیوں کہ نماز میں انسان جس قدر بیت اللہ سے قریب ہو اتنا ہی افضل ہے اور طواف بھی نماز کی مانند ہے لہٰذا طواف میں بھی بیت اللہ کا قرب افضل ہے۔ لیکن اس قرب کے افضل ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس سے نہ تو دوسروں کو تکلیف پہنچے اور نہ خود تکلیف اٹھائے چناں چہ قریب ہونے کی کوشش میں اگر خود کو تکلیف ہوتی ہو یا دوسروں کو تکلیف پہنچے تو قریب ہونے کی بجائے دور رہنا بہتر اور افضل ہے لیکن یہ حکم مردوں کے لیے ہے۔

عورتوں کے لیے مستحب یہ ہے کہ جس وقت مرد طواف کر رہے ہوں وہ خانۂ کعبہ کے قریب نہ جائیں بلکہ دور رہ کر اس طرح طواف کریں کہ مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو۔

عورت کے لیے مستحب یہ ہے کہ رات کے وقت طواف بیت اللہ کرے کیوں کہ یہ صورت خود عورت کے لیے بھی زیادہ محفوظ ہے اور مردوں کے لیے بھی۔ بعینہٖ اگر طواف کا مقام مردوں سے خالی ہو تو عورت کے لیے بھی بیت اللہ سے قریب ہونا مستحب ہے جیسا کہ مردوں کے لیے مستحب ہے۔

اور اس مسئلہ میں اصل ابن جریجؒ کی روایت ہے۔ ابن جریجؒ بیان کرتے ہیں کہ جب ہشام بن عبد الملک نے عورتوں کو مردوں کے ساتھ طواف کرنے سے منع کیا تو حضرت عطاءؒ نے اس سے کہا کہ تم عورتوں کو طواف سے کیسے منع کرسکتے ہو جب کہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے مردوں کے ساتھ طواف بیت اللہ کیا ہے۔ اس موقع پر میں نے حضرت عطاءؒ سے پوچھا کہ: امہات المومنینؓ نے طوافِ کعبہ مردوں کی موجودگی میں، کیا حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد کیا تھا یا اس سے پہلے؟ عطاءؒ نے کہا: میں یہی سمجھتا ہوں کہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد امہات المومنین مردوں کے ساتھ مخلوط ہوکر کیسے طواف کرسکتی تھی؟ عطاءؒ نے کہا: مردوں کے ساتھ اختلاط کی صورت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ مردوں سے الگ تھلک طواف کیا کرتی تھیں۔ اس طرح مردوں کے ساتھ اختلاط نہیں ہوتا تھا۔ ایک موقع پر ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ: اے ام المومنین! آیئے، حجر اسود کو چومیں! آپ نے اس سے کہا: دور ہوجاؤ! اور حجر اسود کو جاکر چومنے سے انکار کردیا۔ الغرض امہات المومنینؓ پردے میں لپٹی لپٹائی نکلتی تھیں اور مردوں کے موجودگی میں طواف بیت اللہ کیا کرتی تھیں۔ یہ روایت بخاری اور بیہقی میں ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ عورتیں مردوں سے الگ طواف کیا کرتی تھیں اور یہ کہ عورتوں کا رات کو طواف کرنا مستحب ہے، یعنی انہیں ایسے وقت طواف کرنا چاہیے جب طواف کرنے کی جگہ مردوں سے خالی ہو۔

شافعیوں کے نزدیک عورت کے لیے حجر اسود کو چھونا یا بوسہ دینا صرف اس صورت میں مسنون ہے جب طواف گاہ مردوں سے خالی ہو خواہ رات کا وقت ہو یا دن کا۔

صفا اور مروہ کی سعی

حیض اور نفاس کی حالت میں سعی کرنا

صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا جمہور فقہاء کے نزدیک حج کے ارکان میں سے ہے اور حنفیوں کے نزدیک واجب ہے اور اکثر اہل علم کے نزدیک سعی کرنے کے لیے پاک ہونا شرط نہیں۔

ابن قدامہؒ نے لکھا ہے: اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے وقت پاک ہونا شرط نہیں۔ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے ان میں امام عطاءؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ابوثورؒ اور اصحاب الرائے شامل ہیں۔

امام حسن بصریؒ کہا کرتے تھے کہ اگر کسی شخص نے طہارت کے بغیر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی اور احرام کھولنے سے پہلے اسے یاد آ گیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پاک ہوکر دوبارہ سعی کرے۔ لیکن اگر احرام کھولنے کے بعد آیا تو پھر نہ اعادہ کی ضرورت ہے اور نہ اس پر کوئی فدیہ ہے۔

ابن قدامہؒ لکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں ہماری دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عائشہؓ کو حیض شروع ہوگیا تھا تو ان سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

اقض ما یقضی الحاج غیر ان لا تطوفی بالبیت

"جو کچھ حاجی کرتے ہیں تم بھی وہ سب ارکان بجا لاؤ، سوائے طواف بیت اللہ کے۔"

گویا طوافِ بیت اللہ کے علاوہ باقی سب اعمال بحالت حیض و نفاس جائز ہیں اور سعی بھی ایک ایسا رکن ہے، جس کا بیت اللہ سے تعلق نہیں ہے، جیسے وقوفِ عرفہ۔ تو جس طرح حیض و نفاس کی حالت میں وقوفِ عرفہ جائز ہے اسی طرح سعی بھی جائز ہے۔

ابوداوٗدؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے سنا ہے کہ عورت کو بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد اگر حیض شروع ہوجائے تو وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے اور حاجیوں کے ساتھ وقوفِ عرفہ کے لیے چلی جائے۔

الاثرمؒ نے روایت کیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ: اگر عورت کو طواف بیت اللہ اور طواف کی دو رکعت پڑھ لینے کے بعد حیض شروع ہوجائے تو اسے چاہیے کہ صفا و مروہ کی سعی کر لے۔

لیکن جس شخص کو طہارت پر قدرت ہو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ سعی بھی پاک حالت میں کرے اور اسی طرح تمام مناسکِ حج ادا کرتے وقت پاک اور طاہر ہو۔

ابنِ قدامہؒ نے لکھا ہے کہ ہمارے بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کے لیے بھی طہارت اسی قدر ضروری ہے جس قدر طواف کے لیے۔ مگر اس کے باوجود امام احمدؒ ایسے شخص پر جس نے طہارت کے بغیر سعی کی ہو، سعی کا اعادہ ضروری خیال نہیں کرتے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک سعی کے لیے حکمی اور حقیقی نجاست سے پاک ہونا اور جسم کے قابل ستر حصوں کا ڈھکا ہونا سنت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص بغیر وضو کے یا جنابت اور حیض و نفاس کی حالت میں یہ اس حالت میں کہ اس کے جسم یا لباس پر نجاست لگی ہو یا جسم کا کوئی قابلِ ستر حصہ کھلا ہو سعی کرے تو اس کی سعی درست ہوجائے گی اور اس پر دم لازم نہ ہوگا البتہ غیروں کے سامنے ستر کھولنا حرام ہے۔

کیا صفا مروہ کی سعی کا مقام اب مسجد حرام کا حصہ ہے؟

بعض علماء کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا اقوال اس وقت کے ہیں جب حرم کعبہ میں توسیع نہیں ہوئی تھی۔ جب کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب توسیع کے بعد وہ مقام جہاں سعی کی جاتی تھی، مسجد حرام کے اندر آ گیا ہے۔ لہٰذا اس کا حکم مسجد کا ہے اور مسجد میں حدیثِ اکبر کی حالت میں داخل ہونا منع ہے لہٰذا بغیر طہارت کے سعی بھی ناجائز ہے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ صفا و مروہ کا وہ مقام جہاں سعی کی جاتی ہے مسجد قرار نہیں پایا۔ اس لیے کہ حکومتِ سعودیہ نے جب مسجد حرام میں توسیع اصلاح کی تھی تو مسجد حرام اور مقام سعی کے درمیان ایک روک اور پردہ بنا دیا تھا تاکہ وہ مقام جہاں سعی کی جاتی ہے حسبِ سابق سعی کے لیے مخصوص رہے اور مسجد میں شامل نہ سمجھا جائے لہٰذا اس مقام میں حیض و نفاس والی عورت یا جنبی کا داخل ہونا مسجد حرام میں داخل ہونا شمار نہ ہوگا اگرچہ مسجدِ حرام اور مقامِ سعی کے درمیان جو حد بندی کی گئی ہے وہ ہلکی اور سادہ ہے۔

کیا عورت سعی کرتے وقت صفا و مروہ پر بھی چڑھے؟

حج یا عمرہ کرنے والے کے لیے سعی کرتے وقت صفا و مروہ پر چڑھنا اور وہاں کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھنا اور اللہ اکبر کہنا سنت ہے۔

چناں چہ مسلمؒ اور ابوداؤدؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب طواف سے فارغ ہوگئے تو صفا پر تشریف لائے اور اس پر چڑھے۔ پھر آپ نے بیت اللہ پر نظر ڈالی اور ہاتھ بلند کیے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور پھر دعا مانگی۔

اور مسلمؒ اور نسائیؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب صفا کے قریب تشریف لائے تو آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

ان الصفا و المروۃ من شعائر اللہ (البقرۃ:۱۵۷)
''یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔''

اور فرمایا: (ابدأ بما بدأ اللہ بہ) ''میں بھی اسی سے ابتدا کرتا ہوں، جس سے اللہ تعالیٰ نے ابتدا کی ہے۔'' چناں چہ آپ نے صفا سے ابتدا کی۔ اس کے اوپر چڑھے حتیٰ کہ بیت اللہ نظر آ گیا اور آپ نے اپنا رخ قبلہ کی طرف کرلیا۔ اسی حدیث میں ہے کہ آپ پھر مروہ پر تشریف لائے اور وہاں بھی آپ نے وہی کچھ کیا جو صفا پر کیا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت کے لیے بھی صفا و مروہ پر مردوں کی مانند چڑھنا ضروری ہے؟

ابن قدامہؒ لکھتے ہیں: عورت کے لیے مسنون نہیں ہے کہ وہ مردوں کی مانند صفا و مروہ پر چڑھے یہ اس لیے تا کہ مردوں کے ساتھ ٹکراؤ پیدا نہ ہو اور ویسے بھی صفا و مروہ پر نہ چڑھنا عورت کے ستر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

☆ مالکیوں کے نزدیک اگر مردوں سے ٹکراؤ کا خدشہ نہ ہو تو عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے صفا و مروہ پر چڑھنا سنت ہے لیکن اگر مردوں اور عورتوں میں اختلاط و مزاحمت کا خطرہ ہو تو پھر عورتوں کو نہیں چڑھنا چاہیے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک عورتوں کے لیے صفا و مروہ پر چڑھنا صرف اس حالت میں مسنون ہے جب وہاں کوئی مرد موجود نہ ہو، لیکن عورت کے صفا و مروہ پر نہ چڑھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سعی کرتے وقت صفا و مروہ کے درمیان والے پورے علاقہ پر سعی بھی نہ کی جائے۔ چناں چہ قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ حاجی پر لازم ہے کہ سعی کرتے وقت صفا و مروہ کے درمیان والے پورے علاقہ پر سعی بھی نہ کی جائے۔ چناں چہ قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ حاجی پر لازم ہے کہ سعی کرتے وقت صفا و مروہ کے پورے علاقہ پر سعی کرے اور صفا کے نچلے حصہ کے ساتھ اپنی ایڑیاں ٹکا کر سعی شروع کرے اور مردہ کی طرف چلے پھر اگر پہاڑی پر نہ چڑھ سکے تو اپنے پاؤں کی انگلیاں مروہ کے نچلے حصہ کے ساتھ لگائے۔

ابن قدامہؒ نے لکھا ہے کہ سعی کرتے وقت عورت کے لیے بھی صفا اور مروہ کے پورے علاقہ کی سعی کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح مرد کے لیے واجب ہے۔

عورت کے لیے مستحب ہے کہ وہ رات کو سعی کرے

عورت کے لیے مستحب یہ ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی رات کے وقت کرے یعنی ایسے وقت جب سعی کرنے کا مقام لوگوں سے خالی ہو۔ لیکن اگر عورت دن کے وقت سعی کرلے تو بھی اس کی سعی درست ہوگی اور اس پر کوئی فدیہ یا گناہ نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے ہم بخاری اور بیہقی کی روایت بیان کر چکے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور دیگر امہات المومنین رات کے وقت نکل کر سعی کیا کرتی تھیں۔

سعی میں عورت 'رمل' نہ کرے

طواف وسعی کرتے وقت میلین اخضرین کے درمیان ''رمل'' کرنا سنت ہے۔ لیکن یہ حکم مردوں کے لیے ہے، عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بیان کردہ حدیث میں ہے (جو پہلے گزر چکی ہے) کہ طواف اور سعی کرتے وقت رمل یعنی کندھے اچکا کر تیز تیز چلنے کا حکم عورتوں کے لیے نہیں ہے۔

وقوفِ عرفہ

اس پر تمام علماء کا اجماع ہے کہ عرفات میں وقوف (قیام کرنا) حج کا ایسا رکن ہے جس کے بغیر حج نہیں ہوتا۔ گویا جس نے وقوفِ عرفہ نہیں کیا، اس کا حج ہی نہیں ہوا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جب آپ میدانِ عرفات میں قیام فرما تھے۔ اس وقت آپ کی خدمت میں کچھ لوگ نجد سے آئے ہوئے تھے اور انھوں نے پوچھا تھا: یا رسول اللہ! حج کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

> الحج عرفة فمن جاء قبل صلوٰة الفجر من ليلة جمع فقد تم حجه
>
> ''حج وقوفِ عرفہ ہے، جو شخص 'لیلۃ جمع' (مزدلفہ کی رات) نمازِ فجر سے پہلے عرفات میں پہنچ گیا اس کا حج قبول ہوگیا۔''

یہ حدیث امام احمدؒ، چاروں اصحاب، کتب مشہور اور بیہقیؒ اور حاکمؒ نے نقل کی ہے اور امام ترمذیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔

''لیلۃ الجمع'' سے مزدلفہ کی رات مراد ہے اور وقوفِ عرفہ کی مدت یوم عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ کے زوالِ شمس کے وقت سے یوم النحر یعنی دسویں ذی الحج کے طلوعِ فجر تک ہے۔ یہ مسلک احناف، امام مالکؒ امام شافعیؒ اور جمہور کا ہے۔

وقوفِ عرفہ کے لیے محض اتنا کافی ہے کہ حاجی یوم عرفہ یعنی ذی الحج کی نو تاریخ کو

میدانِ عرفات کے کسی حصہ میں بحالت احرام موجود رہے۔ خواہ کھڑا رہے یا بیٹھا یا لیٹا رہے یا کسی سواری پر ہو۔

یہ مسلک احناف اور شافعیوں کا ہے اور امام مالکؒ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ البتہ یہ ضرورت ہے کہ وقوف اگر دن کے وقت کیا جائے تو احناف اور مالکیوں کے نزدیک قیام کی مدت غروب آفتاب کے بعد تک ہونی چاہیے یعنی غروبِ آفتاب کے بعد بھی کچھ دیر رکنا چاہیے۔

وقوفِ عرفہ کے لیے طہارت شرط نہیں

ابن قدامہؒ نے ''المغنی'' میں لکھا ہے کہ وقوفِ عرفہ کے لیے نہ تو طہارت شرط ہے، نہ پردہ لگانا اور نہ استقبال قبلہ اور نہ نیت۔ اور اس مسئلہ میں کسی امام کا اختلاف ہمارے علم میں نہیں، یعنی ہمارے علم کی حد تک اس مسئلے پر سب کا اتفاق ہے۔

اور ابن منذرؒ کہتے ہیں کہ میدان عرفات میں اگر کوئی شخص بغیر طہارت کے وقوف کرلے تو اس کا حج ہوگیا اور اس پر کوئی فدیہ نہیں۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر عورت کو حج میں حیض یا نفاس شروع ہوجائے تو وہ حیض اور نفاس کی حالت میں وقوف عرفہ کرسکتی ہے۔ کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے (جب آپ کو حیض شروع ہوگیا تھا) فرمایا تھا:

افعلی ما یفعله الحاج غیر الطواف بالبیت

''ہر وہ کام کرو جو حاجی کرتے ہیں، سوائے طوافِ بیت اللہ کے۔''

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ وقوفِ عرفہ بغیر طہارت کے جائز ہے اور ام المومنین حضرت عائشہؓ نے نبی کریم ﷺ کے حکم سے حیض کی حالت میں وقوف عرفہ کیا۔

عرفہ میں مسلسل تکبیر و تہلیل

یعنی اللّٰہ اکبر اور لا الٰہ الا اللّٰہ کا ورد کرنا

عرفہ کے دن اللہ کے ذکر اور دعا کی کثرت مستحب ہے کیوں کہ یہ ایسا دن ہے کہ

اس میں جو دعا مانگی جائے اس کے قبول ہونے کی توقع ہے۔

اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کہنے اور دعا مانگنے کے لیے بھی طہارت شرط نہیں ہے چناں چہ عورت حیض و نفاس کی حالت میں اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کہہ سکتی ہے اور جو دعا چاہے مانگ سکتی ہے اور ادعیۂ ماثورہ یعنی جو دعائیں قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی پڑھ سکتی ہے البتہ جمہور کے نزدیک اس حالت میں عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ عبادت کے طور پر قرآن مجید کی تلاوت کرے۔

مزدلفہ میں رات گزارنا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّآلِّينَ○ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ○

(البقرۃ:۱۹۸،۱۹۹)

”پھر جب عرفات سے چلو، تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں دی ہے ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

آیت کریمہ میں مشعر حرام کا ذکر ہے، مشعر حرام سے مراد مزدلفہ ہے، مزدلفہ کے تین نام ہیں: ۱-مزدلفہ ۲-جمع ۳-مشعر حرام۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حاجیوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ حج کے سب سے اہم رکن وقوفِ عرفہ کی ادائیگی سے فارغ ہوجائیں تو عرفات سے مزدلفہ یعنی مشعر حرام کی جانب روانہ ہوں اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کرکے پڑھیں اور یہ جمع

بین الصلوٰتین جمع تاخیر کہلاتی ہے یعنی مغرب کی نماز آخر وقت میں اور عشاء کی نماز اول وقت میں جمع کر کے پڑھی جائیں۔ نیز، عشاء کی نماز قصر پڑھیں، یعنی صرف دو رکعت فرض ادا کریں۔

مزدلفہ میں رات گزارنے کے سلسلے میں فقہاء کرام کی حسب ذیل آراء ہیں:

☆ حنبلیوں کے نزدیک مزدلفہ میں رات کو ٹھہرنا واجب ہے اور اگر کوئی شخص قیام مزدلفہ نہ کرے تو اس پر ایک جانور ذبح کرنا لازم ہوگا۔

☆ شافعیوں کے نزدیک مزدلفہ میں رات کے نصف ثانی میں کم از کم ایک ساعت قیام کرنا واجب ہے اور ساعت سے مراد ایک لحظہ ہے۔ اگر کوئی حاجی آدھی رات کے بعد مزدلفہ میں ایک لحظہ بھی نہ ٹھہرا تو اس پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی۔

☆ حنفیوں کے نزدیک مزدلفہ میں رات گزارنا سنت ہے اور یوم النحر کی فجر سے پہلے مزدلفہ میں حاضر ہونا یعنی محض پایا جانا واجب ہے خواہ یہ حاضری صرف ایک لحظہ کے لیے ہو۔ اگر کوئی شخص یہ حاضری ترک کر دے گا تو اس پر ایک جانور کی قربانی لازم ہوگی۔

☆ مالکیوں کے نزدیک بھی مزدلفہ میں رات گزارنا واجب نہیں بلکہ واجب محض رکنا ہے کہ رات کے وقت یعنی طلوعِ فجر سے پہلے پہلے فقط اتنی دیر مزدلفہ میں ضرور ٹھہرا جائے جتنی دیر میں عرفہ سے منیٰ کی طرف سفر جاری رکھتے ہوئے مزدلفہ میں سواری روک کر اتر سکے۔ اور یہ بھی اس صورت میں واجب ہے جب کوئی عذر نہ ہو۔ اگر کسی عذر اور مجبوری سے نہ اتر سکے تو اترنا بھی واجب نہیں۔

مالکیوں کے نزدیک واجب محض رات کے وقت اترنا ہے خواہ رات کے کسی حصہ میں اترا جائے یعنی نصف اول میں ہو یا نصف آخر میں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

چوں کہ موجودہ زمانے میں رات کو قیام مزدلفہ کی وہ صورت جو حنفیوں، شافعیوں اور حنبلیوں کے مسلک ہیں بیان ہوئی مشکل ہے کیوں کہ معلّمین اپنی گاڑیاں عرفہ سے سیدھی منیٰ لے جاتے ہیں اور یہ گاڑیاں مزدلفہ میں محض تھوڑی دیر کے لیے رکتی ہیں لہٰذا اگر گاڑیاں واپس چلی جائیں اور حاجیوں کو مزدلفہ میں چھوڑ جائیں تو مزدلفہ میں رات گزارنے کے بعد منیٰ لوٹنے کے لیے انہیں کافی مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا لہٰذا حاجیوں کو مالکی مسلک

کے مطابق عمل کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ مالکی اپنے مسلک کے سلسلے میں کافی مضبوط دلائل رکھتے ہیں۔(۱)

مندرجہ بالا مسالک فقہ کو دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مزدلفہ میں رات گزارنے کے مسئلہ پر مختلف فقہاء کا جو اختلاف ہے اس کی اصل بنیاد محض رخصت و عزیمت ہے۔ اس بارے میں احناف اور حنبلیوں کے مذہب میں زیادہ شدت ہے جس کا سبب یہ ہے کہ دونوں عزیمت پر عمل کر رہے ہیں اور شافعی مسلک میں کم شدت اور مالکی مسلک میں بہت ہی آسانی ہے۔ گویا یہ حضرات رخصت پر عمل کر رہے ہیں تو اس سلسلہ میں ہم وہ بات کہتے ہیں جو امام عبد الوہاب شعرانیؒ نے میزان الاعتدال میں مسالک فقہ کے درمیان مطابقت پیدا کرتے ہوئے کہی ہے کہ معاملہ کو ترازو کے سپرد کر دیجیے اور حسب موقع وہ حالات عمل کیجیے یعنی بوقت وسعت وسہولت عزیمت پر عمل کیجیے اور بوقت تنگی و مجبوری رخصت پر عمل کر لیجیے۔

☆☆

---

(۱) تفسیر قرطبی، ج ۲، ص ۴۲۵

رمیِ جمار

(کنکریاں مارنا)

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ شیطان کے ستونوں کو کنکریاں مارنا واجبات حج میں سے ہے اور اگر کوئی شخص اسے ترک کر دیتا ہے تو پھر وہ مندرجہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر کے فدیہ دے:

۱- ایک بکری کی قربانی کرے لیکن اگر قربانی کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو ۲- دس دن کے روزے رکھے جن میں سے تین روزے ایام حج میں اور سات روزے گھر لوٹ کر لیکن اگر کسی میں روزے کی طاقت بھی نہ ہو تو ۳- چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

اس فدیہ کے سلسلے میں بھی مختلف مسالک فقہ کے درمیان کسی قدر اختلاف ہے۔ بعض فقہاء کا رجحان شدت کی جانب ہے اور بعض کا رجحان آسانی کی طرف ہے۔ تفصیلات کے لیے کتبِ فقہ سے رجوع کیا جائے۔

اس مقام پر جس بات کی طرف ہم بطور خاص اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ رمی جمار کرتے وقت انسانوں کے ہجوم کی زیادتی ایک ایسی صورت حال ہے کہ حاجی کو دورانِ حج جن مشکلات سے دو چار ہونا پڑتا ہے ان میں اس سے زیادہ سخت کوئی اور مرحلہ نہیں۔ بالخصوص کمزوروں، بوڑھوں اور عورتوں کے لیے۔ اس لیے کہ اس موقع پر حاجی انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں پھر رہا ہوتا ہے اور اس قدر شدید دھکم پیل ہوتی ہے کہ بہت سے حاجی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس بات کا نتیجہ ہوتی ہے کہ لاکھوں حاجی اس بات کے

خواہش مند ہوتے ہیں کہ جلد از جلد اور کم سے کم وقت میں رمی جمار سے فارغ ہوجائیں جو کسی طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ دراصل یہی وہ مسئلہ ہے جس پر تفصیلی گفتگو کے بعد اس کا حل ہم پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

جمرۂ عقبہ

حاجی مزدلفہ میں رات گزارنے یا وقوف کرنے کے بعد جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارنے کے لیے منیٰ کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارنے کے چار اوقات ہیں:

۱- وقت اداء: یعنی وہ وقت جب کنکریاں ماری جائیں تو یہ رکن ادا ہو جاتا ہے یہ وقت دس ذی الحجہ کے طلوع فجر سے گیارہ ذی الحجہ کی فجر تک ہے۔

۲- وقت مستحب: دس ذی الحجہ کے دن سورج نکلنے سے زوال کے وقت تک۔

۳- وقت مباح: دس ذی الحجہ کے دن وقت زوال سے سورج غروب ہونے تک۔

۴- وقت مکروہ: دس ذی الحجہ کو سورج طلوع ہونے سے پہلے اور سورج غروب ہونے کے بعد کا وقت۔ اور مکروہ بھی اس صورت میں ہے جب ان اوقات میں بغیر عذر کی رمی کی جائے، اگر کوئی عذر ہو تو پھر مکروہ نہیں ہے۔ چناں چہ ضعیف اور بوڑھے لوگوں کے لیے سورج طلوع ہونے سے پہلے اور چرواہوں کے لیے رات کے وقت رمی کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے کیوں کہ عذر موجود ہے۔

فقہاء نے ایک اور وقت کو بھی مکروہ کہا ہے اور اس سے ان کی مراد وہ وقت ہے جب رمی جمار کے لیے انسانوں کا ہجوم اس قدر زیادہ ہوتا ہے جو بہت سے لوگوں کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسے وقت کا انتخاب کرنا جس وقت کو فقہاء نے وقت مستحب لکھا ہے مکروہ ہے کیوں کہ ایسے ہی وقت میں ہجوم زیادہ ہوتا ہے جو ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔ اور یہ لوگ اپنی بات کے لیے ایسے شرعی دلائل رکھتے ہیں جو ان کے نزدیک قابل ترجیح ہیں۔

اس سلسلے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ جس وقت کو فقہاء نے وقت مستحب لکھا ہے اس کا

نام وقتِ عزیمت ہونا چاہیے اور جس وقت کو فقہاء نے وقت مکروہ لکھا ہے اس کا نام وقتِ رخصت ہونا چاہیے کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

ان اللّٰہ یحب ان توتی رخصه کما توتی عزائمه (مسند احمد)

''اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس کی رخصتوں سے بھی اسی طرح استفادہ کیا جائے، جس طرح اس کی عزیمتوں پر عمل کیا جاتا ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے نتیجے میں انسانوں پر سے وہ شدید تنگی رفع ہوجائے گی جو بعض امور کو بجا لاتے وقت بسا اوقات آدمی کو ہلاکت کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ اور اسی بنا پر ہم نے یہ کہا ہے کہ جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارنے کے چار اوقات ہیں:

۱- وقتِ ادا: یہ وقت قربانی کے دن یعنی دس ذی الحجہ کی آدھی رات سے گیارہ ذی الحجہ کی فجر تک ہے۔

۲- وقت عزیمت: یہ وقت یوم النحر (قربانی کے دن) یعنی دس ذی الحجہ کے طلوعِ آفتاب سے وقتِ زوال تک ہے۔

۳- وقتِ مباح: یہ وقت زوال آفتاب سے غروبِ آفتاب تک ہے۔

۴- اور وقتِ رخصت: یہ لیلۃ النحر یعنی قربانی کے دن سے پہلی رات کو آدھی رات گزرنے کے بعد سے فجر تک اور یوم النحر کا سورج غروب ہونے کے بعد سے اگلے دن کی فجر طلوع ہونے تک ہے۔

جن فقہاء کے نزدیک یوم النحر یعنی ذی الحجہ کی دس تاریخ کی آدھی رات کے بعد رمی جمار جائز ہے وہ یہ ہیں: عطاءؒ، ابن ابی لیلیٰ، عکرمہ بن خالد اور امام شافعیؒ۔ ان حضرات کی دلیل ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کو یوم النحر کی رات بھیجا اور انھوں نے رمی جمار کی اور اس کے بعد طواف افاضہ کیا۔ (اس حدیث کو ابوداوٗدؒ اور بیہقیؒ نے روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند بالکل صحیح ہے)۔

ان حضرات کی دوسری دلیل وہ روایت ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت اسماءؓ رات کو مزدلفہ کے قریب اتریں اور وہاں کھڑے ہوکر آپ نے نماز پڑھی۔ پھر دریافت کیا: کیا چاند غروب ہوگیا؟ تو آپ کو بتایا گیا کہ ہاں چاند غروب ہوگیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اب چل پڑو۔ چناں چہ سب چل پڑے اور حضرت اسماءؓ نے رمی جمار کیا پھر واپس آ کر اپنی قیام گاہ پر نماز فجر پڑھی۔ (یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے)۔

اور جن فقہاء کے نزدیک جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارنا یوم النحر کی فجر یا یوم النحر کے طلوع آفتاب کے بعد واجب ہے، ان کی دلیل بھی بعض دیگر احادیث صحیحہ میں ملتی ہے اور دونوں قسم کی روایات میں مطابقت کی صورت یہی ممکن ہے کہ جو علماء اس سلسلے میں شدت کے قائل ہیں ان کی روایات کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان پر عمل کرنا مستحب ہے اور جن روایات سے سہولت پیدا ہوتی ہے ان پر عمل کرنا مباح ہے۔

اگر کسی شخص نے بغیر کسی عذر کے جمرۂ عقبہ کی رمی کو یوم النحر یعنی دس ذی الحجہ کا آفتاب غروب ہونے کے بعد تک مؤخر کر دیا تو وہ رات کو رمی کر لے جو اگرچہ مکروہ ہے لیکن اس پر کوئی فدیہ از قسم قربانی وغیرہ نہیں ہے۔ یہ مسلک احناف اور امام شافعیؒ کا ہے اور امام مالکؒ کا مسلک بھی ایک روایت کے مطابق یہی ہے اور ان حضرات کی دلیل یہ روایت ہے:

نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کی زوجہ (صفیہ بنت ابی عبید) کی بھانجی کو مزدلفہ میں حیض شروع ہوگیا جس کے نتیجے میں صفیہ اور ان کی بھانجی دونوں پیچھے رہ گئیں۔ اور منیٰ ایسے وقت پہنچیں کہ دسویں ذی الحجہ کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ جس وقت پہنچیں اسی وقت رمی جمرہ کرلیں اور اس تاخیر کے باوجود ان پر کوئی فدیہ از قسم ذبح وغیرہ عائد کرنا ضروری نہ خیال کیا۔ یہ روایت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقیؒ نے نقل کی ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عورت اگر دس ذی الحجہ و نصف شب کے بعد جمرۂ عقبہ کی رمی کرے گی تو اس کی رمی صحیح ہوگی۔ لیکن اس پر سب علماء کا اجماع ہے کہ اگر اس تاریخ سے پہلے کرے گی تو صحیح نہیں ہوگی۔

ایامِ تشریق میں رمیِ جمار

ایامِ تشریق میں شیطان کے ستونوں پر کنکریاں مارنے کے تین اوقات ہیں:

۱- وقت ادا: یہ وقت زوال آفتاب سے دوسرے دن کے طلوع آفتاب تک ہے۔

۲- وقت عزیمت: (جس میں رمی کرنے کا زیادہ ثواب ہے) یہ زوال آفتاب سے اسی دن کے غروبِ آفتاب تک کا وقت ہے۔

۳- وقت رخصت: یہ وقت غروبِ آفتاب سے دوسرے دن کے طلوعِ آفتاب تک ہے۔

ایامِ تشریق سے ذی الحجہ کی گیارہ، بارہ اور تیرہ تاریخ مراد ہے۔ اور ان ایام میں رمی جمار کا اول وقت زوال آفتاب کے بعد کا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایامِ تشریق میں) شیطان کے ستونوں پر زوال آفتاب کے وقت یا زوالِ آفتاب کے بعد کنکریاں ماریں۔ (یہ روایت احمد، ابن ماجہ اور ترمذی میں ہے اور ترمذیؒ نے اس کو حسن قرار دیا ہے)۔

نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ ”ایام تشریق کے تینوں دنوں میں رمی جمار سورج کے وقت زوال سے پہلے نہیں کی جاسکتی۔“ یہ روایت بیہقی میں ہے۔

البتہ حنفیوں کے نزدیک اس شخص کے لیے جو جلدی جانا چاہے، یوم النحر (کوچ کے دن) بارہ تاریخ کو اور جو تاخیر سے جانا چاہیے اس کے لیے تیسرے دن (۱۳/تاریخ) کو زوال سے پہلے رمیِ جمرات جائز ہے۔ امام بیہقیؒ نے طلبہ بن عمرؒ کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب کوچ کے آخری دن سورج پوری طرح بلند ہوجائے تو رمی جمار اور منیٰ سے واپسی جائز ہے۔

لیکن اس روایت کے بارے میں بیہقیؒ نے لکھا ہے: اس میں طلحہ بن عمر المکی ہے جو

ضعیف ہے۔

چناں چہ عورتوں کی رمی جمار کے سلسلے میں جو بات ہم زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وقت ایسا ہونا چاہیے، جس میں لوگوں کا ہجوم کم ہو اور یہ وقت مغرب کے بعد سے دوسرے دن کا سورج طلوع ہونے تک ہے۔ہم یہ بات اس بنا پر کہہ رہے ہیں کہ یہ ضرورت کا تقاضا ہے اور عورتیں اسی طرح مردوں کے ہجوم سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔ البتہ یوم النفر یعنی روانگی کے دن، اس دن زوال آفتاب کے بعد کا وقت عورتوں کے لیے مناسب ہے۔

رمی جمار کے لیے دوسرے کو نائب بنانا

اگر کوئی شخص بیمار ہو، یا بیہوش ہوجائے، یا کمزور ہو اور خود رمی جمار نہ کرسکے تو فقہاء کے نزدیک جائز ہے کہ ایسی صورت میں یا تو کوئی شخص اس کے ہاتھ میں کنکری پکڑا دے اور وہ خود اسے جمرات پر مارے یا پھر کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے بطور نائب رمی جمار کرے۔ ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ ایک شخص بہ یک وقت دو کنکریاں پھینکے۔ ایک اپنی طرف سے اور دوسری اس شخص کی طرف سے جو معذور ہے اور جس نے اسے رمی جمار کے لیے اپنا نائب بنایا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص قید میں ہو یا کوئی ایسا عذر ہو جو رمی کرنے سے مانع ہو تو اس کے لیے بھی کسی دوسرے کو نائب بنانا جائز ہے۔ ابن ماجہ میں ابوالزبیرؒ کے حوالے سے حضرت جابرؓ سے روایت ہے۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حج کیا اور ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے بھی تھے تو عورتوں اور بچوں کی طرف سے تلبیہ اور رمی جمار ہم نے کیا۔

المجموع میں امام نوویؒ نے لکھا ہے ''مناسب یہ ہے کہ جو شخص خود رمی جمار کرنے سے معذور ہو، وہ اپنی طرف سے رمی کے لیے کسی ایسے شخص کو اپنا نائب بنائے جو احرام میں نہ ہو یا جو اپنی رمی جمار کرچکا ہو۔ لیکن اگر اس نے کسی ایسے شخص کو نائب بنایا جس نے ابھی اپنی طرف سے رمی جمار نہیں کیا تو پھر مناسب یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی طرف سے رمی جمار کرے پھر اس کی طرف سے جس نے اسے رمی جمار کے لیے اپنا نائب بنایا ہے اور اگر کسی شخص نے عذر

کی بنا پر رمی جمار کے لیے دوسرے شخص کو اپنا نائب بنایا اور نائب رمی کر آیا، بعد میں اس کا عذر دور ہوگیا تو زیادہ صحیح ہے کہ اگر رمی جمار کا وقت ابھی باقی ہے تو اس کے لیے مستحب ہے کہ وہ دوبارہ رمی جمار خود کرے لیکن ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہے جب نائب نے اس کی طرف سے رمی عذر دور ہونے سے پہلے کی ہو۔ لیکن اگر نائب نے عذر ہونے کے بعد رمی کی ہے تو پھر نائب بنانے والے کے لیے ضروری ہے کہ دوبارہ خود رمی کرے۔ اس پر سب علماء کا اتفاق ہے۔

احرام کھولتے وقت بال کٹانا

بال منڈوانا یا کٹوانا امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب ظاہر کے مطابق حج اور عمرے کے اعمال میں سے ایک اہم عمل ہے۔ اور امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

اکثر علماء کا خیال ہے کہ یہ عمل یعنی بال منڈوانا یا کٹوانا واجب ہے۔ اور اگر کوئی حاجی اسے چھوڑ دے تو اس پر ایک جانور کی قربانی بطور کفارہ لازم آئے گی اور امام شافعیؒ کے نزدیک بال کٹوانا یا منڈوانا حج کے ارکان میں سے ہے۔

عمرے کی صورت میں بال کٹوانے یا منڈوانے کا وقت صفا اور مروہ کی سعی سے فارغ ہونے کے بعد ہے اور حج میں یوم النحر یعنی دس ذی الحجہ کو جمرۂ عقبہ کی رمی کر لینے کے بعد کا ہے۔ لیکن اگر حاجی اپنے ساتھ قربانی کا جانور لایا ہو تو پھر وہ ذبح کے بعد بال کٹوائے یا سر منڈوائے اور بال کٹوانے یا سر منڈوانے کا عمل امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کے نزدیک بھی صرف ایامِ نحر میں ہونا ضروری ہے۔ ایام النحر سے مراد وہ دن ہیں جن میں قربانی کی جاسکتی ہے لیکن امام شافعیؒ، امام احمدؒ بن حسن اور امام احمدؒ کے مشہور مسلک کے مطابق اگر کوئی شخص بال کٹوانا ان دنوں سے مؤخر کر دے تو جائز ہے اور اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

عورتوں کے لیے سنت بال کٹوانا ہے، منڈوانا نہیں۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے

روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لیس علی النساء حلق انما علیهن التقصیر

''عورتوں کے لیے بال منڈوانا ضروری نہیں، ان کے لیے صرف بال کٹوانا کافی ہے۔''

یہ روایت ابوداوٗدؒ نے بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ روایت دارقطنی اور طبرانی میں بھی ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

اور اس مسئلہ پر علماء کا اجماع ہے۔ بلکہ فقہاء کی ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ عورت کا سر منڈوانا ''مثلہ'' کے حکم میں داخل ہے۔ یہ بات ابن المنذرؒ نے لکھی ہے۔

عورت کے لیے کس قدر بال کٹوانا ضروری ہے؟

اس مسئلہ میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ عورت کو احرام کھولتے وقت بالوں کی کتنی مقدار کٹوانا ضروری ہے۔

☆ امام مالکؒ کے نزدیک ضروری ہے کہ عورت اپنے بالوں کی تمام مینڈھیوں میں سے کچھ نہ کچھ کٹوائے۔ لیکن اس کی مقدار مقرر نہیں ہے۔ جس قدر کٹوالے، کافی ہوگا۔ لیکن یہ کافی نہیں کہ بعض چوٹیوں میں سے کٹوالے اور باقی کو اس طرح رہنے دے۔

☆ شافعیوں کے نزدیک کم سے کم مقدار تین بال کٹوانا ہے۔

☆ امام احمد بن حنبلؒ کا قول یہ ہے کہ ہر چٹیا میں سے انگلی کے ایک پور کے برابر کٹوائے اور یہی قول ابن عمرؓ امام شافعیؒ، اسحاقؒ اور ابوثورؒ کا ہے۔

ابوداوٗدؒ نے لکھا ہے کہ امام احمدؒ سے میں نے خود سنا ہے جب ان سے عورت کے بال کے کٹوانے کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا عورت اپنے پورے سر کے بال کٹوائے؟ تو انھوں نے جواب دیا: ہاں اپنے بالوں کو سر کے اگلے حصہ میں اکٹھا کر کے بقدر ایک پور انگلی ہر طرف سے کٹوائے۔

اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کہ عورت جب اپنے بال کٹوانا چاہے تو سر کے

بال سر کے اگلے حصہ میں اکٹھے کر کے ان میں سے انگلی کے ایک پور کے برابر کٹوائے۔

عطاءؒ کا قول ہے کہ تین انگلیوں کے برابر بال مٹھی میں لے کر کٹوائے۔

ھدِی (قربانی کا جانور)

ھدی سے مراد وہ قربانی کا جانور ہے جو ثواب اور قربِ الٰہی حاصل کرنے کی خاطر حرم کعبہ کی طرف لے جایا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ○لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ (الحج:۳۶،۳۷)

''اور (قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے، تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے، پس انھیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمھارے لیے مسخر کیا ہے تا کہ تم شکریہ ادا کرو۔ نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''

قربانی کرنے والے حاجی کیلیے مستحب یہ ہے کہ اپنے قربانی کے جانور کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ بشرطیکہ ذبح کرنا بخوبی جانتا ہو۔ اس لیے کہ حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے سات اونٹ اپنے دست مبارک سے کھڑے ذبح کیے۔ (یہ روایت نسائی اور ابوداؤدؒ نے نقل کی ہے)۔

لیکن جو شخص خود اچھی طرح ذبح نہ کرسکتا ہو اس کے لیے یہ مستحب ہے کہ اپنے جانور کو اپنے سامنے ذبح کرایے۔ جیسا کہ حضرت عمران بن حصینؓ نے روایت کیا ہے کہ نبی

کریم ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا:

یا فاطمة قومی فاشهدی اضحیتك فانه یغفر لك بكل قطرة من دمها كل ذنب عملتیه و قولی: ان صلاتی و نسكی و محیای و مماتی لله رب العالمین○ لا شریك لك و بذالك امرت و انا اول المسلمین○ (الانعام:۱۶۳،۱۶۴)

''اے فاطمہ! اٹھو اور اپنے جانور کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھو۔ کیوں کہ اس کے خون کے ہر قطرے کے عوض ہر گناہ جو تم نے کیا ہے معاف کیا جاتا ہے اور کہو: میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والی بھی میں ہوں۔''

حضرت عمرانؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ طریقہ کیا آپ کے اور آپ کے اہل بیت کے لیے مخصوص ہے۔ کیوں کہ اس کے مصداق و اہل تو آپ ہی ہیں، یا سب مسلمانوں کے لیے عام ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں، بلکہ سب مسلمانوں کے لیے عام ہے۔''

ھدی ذبح کرنے کے لیے کسی کو نائب بنانا

قربانی کرنے والے کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے جانور کو ذبح کرنے، اس کا گوشت تقسیم کرنے اور اس کی کھال اور جھول ٹھکانے لگانے کے لیے کسی شخص کو اپنا نائب مقرر کر دے۔

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ذبح ہوتے وقت آپ کے اونٹوں کی نگرانی کروں اور ان کی کھالیں اور جھولیں تقسیم کر دوں۔ نیز آپ نے مجھے یہ حکم بھی دیا تھا کہ قربانی کا گوشت یا کھال اور جھول میں سے کوئی چیز بطور اجرت قصائی کو نہ دوں۔ حضرت علیؓ نے کہا: قصائی کو ہم اپنے پاس سے دیا کرتے تھے۔ (اس روایت کو ترمذی کے سوا ساتوں محدثین نے نقل کیا ہے)۔

ھدی کے سلسلے میں بعض جاہلانہ خیالات کی نشان دہی

بہت سے حاجی یہ خیال کرتے ہیں کہ ہر حاجی پر حج میں قربانی کرنا واجب ہے۔ نیز یہ کہ جس حاجی پر جانور ذبح کرنا لازم ہو وہ ضرور اس کو صرف انہی تین دنوں میں ذبح کرے جو قربانی کے لیے مقرر ہیں۔ اور ذبح صرف اس مقام پر کرے جو ذبح کے لیے مخصوص ہے، یعنی منیٰ میں۔ اس کے علاوہ جن کی مالی حالت کمزور ہوتی ہے یا جو لوگ طبعاً بخیل واقع ہوئے ہیں، وہ ایسے جانور خریدتے ہیں جو بیمار اور کمزور ہونے کی بنا پر کم قیمت کے ہوتے ہیں اور پھر اسے ذبح کر دیتے ہیں۔ جب کہ اس کا گوشت کھانے کے قابل نہیں ہوتا اور اس گوشت کو ایسے فقراء اور ضرورت مند لوگ بھی کھانا پسند نہیں کرتے جو بھوک کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہوں۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ منیٰ میں جانوروں کا گوشت سڑ جاتا ہے اور اس میں سے بدبو کے بھبکے اٹھتے ہیں اور پوری فضا متعفن ہو جاتی ہے اور ہر طرف بیماری کے جراثیم پھیل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ صورت حال بہت تکلیف دہ اور ضرر رساں ہے۔ شریعت اسلامیہ جو انسانوں کی صحت اور خوشگوار زندگی کی متمنی ہے اسے کسی حال میں پسند نہیں کر سکتی۔

مسئلہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ از روئے شریعت صرف حج قران اور تمتع کرنے والے حاجی پر جانور کی قربانی واجب ہے۔ اور جس نے حج افراد ادا کیا ہو اس پر جانور ذبح کرنا واجب نہیں ہے۔ چناں چہ اس سلسلے میں شریعت کے جو صحیح احکام ہیں، وہ اگر حاجیوں کو معلوم ہو جائیں اور وہ حاجی جس پر قربانی واجب نہیں ہے وہ قربانی کی رقم بطور صدقہ دے دے اور جس پر قربانی واجب ہو صرف وہ قربانی کرے۔ تو یہ شکایات جو ہر سال سننے میں آتی ہیں، نہ پیدا ہوں۔

اسی طرح یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ ذبح صرف منیٰ میں کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ پورے مکہ جہاں چاہیں ذبح کرنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

ان منیٰ کلها منحر و ان مکة و فجاجها منحر

''منیٰ پورے کا پورا ذبح کی جگہ ہے اور مکہ میں اور اس کی گھاٹیوں میں بھی ذبح کیا جا سکتا ہے۔''

وقت ذبح کے بارے میں شیخ محمود شلتوت کی رائے

ھدی کو ذبح کرنے کا وقت نہ تو قرآن مجید میں بتایا گیا ہے اور نہ کسی حدیث صحیح میں متعین کیا گیا ہے۔ اس لیے جس پر جانور ذبح کرنا واجب ہو وہ اپنا جانور وقتِ وجوب کے بعد جب چاہے ذبح کرسکتا ہے اور اس کے لیے کوئی ایسا وقت مقرر نہیں ہے کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے وقت ذبح کرنا جائز ہی نہ ہو۔ البتہ وہ قربانی جو صرف قربانی کے تین مخصوص دنوں میں کی جاتی ہے اس کا ان تین دنوں میں ہونا ضروری ہے اور یہ قربانی ہدی کے علاوہ ہے اور یہ قربانی اگر تسلیم کرلیا جائے کہ واجب ہے تب بھی حاجی اور مسافر پر واجب نہیں ہے۔[1]

(۱) فتاویٰ شیخ محمود شلتوت، ص ۱۵۶

طواف

(خواتین کی مشکلات)

طوافِ قدوم

حج میں تین طواف ہیں: ۱- طوافِ قدوم ۲- طوافِ افاضہ ۳- طوافِ وداع

طوافِ قدوم

اس کو طوافِ تحیہ بھی کہتے ہیں اور طواف لقاء بھی۔ یہ طواف احناف، شافعیوں اور حنبلیوں کے نزدیک سنت ہے۔ کیوں کہ یہ کعبہ کا سلام ہے اور جس طرح تحیۃ المسجد کا دوگانہ واجب نہیں ہے اسی طرح یہ طواف بھی واجب نہیں ہے۔ دراصل مسجد حرام کا تحیہ طواف ہے، لہٰذا ہر شخص جو یہاں حاضری دے، خواہ حج کا احرام باندھ کر آیا ہو یا غیر محرم ہو، اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مسجد حرام میں داخل ہوتے ہی طواف کعبہ کرے گا۔

چناں چہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ میں تشریف لائے تو پہلا جو کام آپ نے کیا وہ یہ تھا کہ وضو کر کے بیت اللہ کا طواف کیا۔ (یہ روایت بخاری، مسلم اور بیہقی میں ہے)۔

امام مالکؒ اور بعض شافعی علماء کے نزدیک طوافِ قدوم ہر اس شخص پر واجب ہے جو حج کا احرام باندھ کر مکہ میں داخل ہو خواہ وہ مکہ کا رہنے والا ہی جو مکہ سے باہر گیا ہو اور اب واپس آیا ہو۔ لیکن حیض اور نفاس کی حالت میں عورت پر طوافِ قدوم واجب نہیں ہے۔

طوافِ عمرہ

البتہ جس شخص نے عمرے کا احرام باندھا ہو اس پر طوافِ عمرہ واجب ہے۔ کیوں کہ یہ طواف عمرے کا رکن ہے۔ اور اس مسئلہ پر تمام علماء کا اجماع ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے کہ اس بات پر تمام فقہاء کا اجماع ہے کہ جو شخص حج تمتع کرنا چاہتا ہو اور اس نے عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول دیا ہو تا کہ حج کی تاریخ آنے پر دوبارہ احرام باندھے، اس پر دو طواف واجب نہیں ایک طواف عمرے کا، اور دوسرا طوافِ افاضہ۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ طوافِ قدوم اور عمرے کا طواف دو مختلف طواف ہیں اس لیے کہ عمرہ کرنے والے کے لیے طوافِ قدوم کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس پر صرف عمرے کا طواف واجب ہے۔

اسی طرح جو حاجی حج افراد کا احرام باندھتا ہے اس پر ایک طواف واجب ہے اور وہ ہے طوافِ افاضہ۔ اب اگر وہ طوافِ قدوم بھی کرتا ہے تو وہ گویا سنت ادا کرتا ہے۔

البتہ حج قران کرنے والے کے سلسلے میں اختلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابو ثورؒ کے نزدیک حج قران کرنے والے کے لیے بھی صرف ایک طواف یعنی طوافِ افاضہ اور ایک سعی کافی ہے۔

اس کے برعکس: امام ابو حنیفہؒ امام ابو سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ کے نزدیک حج قران کرنے والے کے لیے دو طواف اور دو سعی واجب ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک پہلی رائے قابل ترجیح ہے۔

اگر عورت کو حج کا احرام باندھنے کے بعد طواف سے پہلے حیض شروع ہو جائے؟

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی عورت نے حج کا احرام باندھا اور ابھی اس نے بیت اللہ کا طواف بھی نہیں کیا ہوتا کہ اسے حیض یا نفاس شروع ہو جاتا ہے۔ یہ مشکل اسے بھی پیش آ سکتی ہے جس نے حج افراد یا حج قران کا باندھا ہو اور اسے بھی جس نے حج تمتع کی نیت کی ہو۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس سے اس عورت کے لیے تو کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی جو حج قران یا حج افراد کر رہی ہو کیوں کہ ان دونوں پر صرف ایک طواف یعنی طوافِ افاضہ کے سوا کوئی اور طواف واجب نہیں ہے، اس لیے کہ حج افراد کی صورت میں تو اس پر عمرے کا طواف ہے ہی نہیں۔ اور طوافِ قدوم عذر کی بنا پر ساقط ہوگیا۔ اسی طرح حِج قران کی صورت میں طوافِ قدوم عذر کی بنا پر ساقط ہوگیا۔ اب وہ صرف طوافِ افاضہ کرے گی جو اس کے حج اور عمرہ دونوں کے لیے کافی ہوگا، اس مسئلہ پر تمام مسالک فقہ کے علماء کا اجماع ہے۔

لیکن اگر کسی عورت نے حج تمتع کا احرام باندھا ہے تو پھر مسئلہ کسی قدر پیچیدہ ہو جاتا ہے کیوں کہ اس طرح متعدد صورتیں پیدا ہوں گی۔

۱- حج تمتع کی نیت سے عمرہ کا احرام باندھا اور حیض یا نفاس شروع ہوگیا اور پھر ایام حج سے پہلے پاک ہوگئی۔ اس صورت میں وہ پاک ہونے سے پہلے طواف بیت اللہ نہ کرے بلکہ پاک ہونے کے بعد طوافِ بیت اللہ کر کے احرام کھول دے اور پھر حج کا احرام باندھ لے اور حج تمتع کرے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ احرام نہ کھولے اور اسی احرام سے حج میں داخل ہوجائے اور تمتع کی بجائے حج قران کرلے۔ اس صورت میں وہ طوافِ افاضہ کے بعد احرام کھول دے گی۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جب اسے یہ خوف نہ ہو کہ اس کا حج فوت ہوجائے گا۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ احرام باندھتے وقت حیض یا نفاس کی حالت میں ہو اور وقت کی تنگی کی وجہ سے اس کا خیال یہ ہو کہ حج سے پہلے پاک نہیں ہوگی تو وہ تمتع کی بجائے حج افراد کی نیت کرلے اور اس پر جانور ذبح کرنا واجب نہ ہوگا۔ یا پھر قران کی نیت کرلے۔ اس صورت میں اس کے لیے ایک ہی طواف، حج و عمرہ دونوں کے لیے کافی ہوگا۔ یعنی طوافِ افاضہ کرے گی اور اس پر ایک جانور کی قربانی بھی واجب ہوگی۔

۳- تیسری صورت یہ ہے کہ اگر ایسا ہو کہ ایک عورت حج تمتع کی نیت سے عمرے کا احرام باندھے اور طوافِ بیت اللہ اور صفا و مروہ کی سعی کرنے سے پہلے ہی اسے حیض شروع ہوجائے اور اسے یہ اندیشہ ہو کہ کہیں حج ہی فوت نہ ہوجائے کیوں کہ وہ ابھی تک پاک نہیں

ہوئی تو اس صورت میں وہ کیا کرے؟ کیوں کہ ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عمرہ کا طواف عمرہ کے ارکان میں سے ہے۔ یعنی اگر طواف نہ کیا جائے تو عمرہ ہو ہی نہیں سکتا۔

اس سلسلے میں علامہ خرقیؒ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی عورت تمتع کی نیت سے احرام باندھے، پھر اسے حیض شروع ہو جائے اور اسے ڈر ہو کہ کہیں حج ہی فوت نہ ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ عمرے کی بجائے حج کی نیت کر لے اور اس صورت میں وہ قران کرے گی اور طوافِ قدوم چھوٹ جانے کی وجہ سے اس پر طواف قدوم کی قضا نہیں ہوگی۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے ابن قدامہؒ المغنی میں لکھتے ہیں:

اس بات کا حاصل یہ ہے کہ تمتع کی نیت کرنے والی عورت کو اگر عمرہ کا طواف کرنے سے پہلے حیض شروع ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اب وہ طواف بیت اللہ نہیں کر سکے گی۔ کیوں کہ یہ طواف نماز کا حکم رکھتا ہے۔ دوسرے، حیض کی حالت میں مسجد حرام میں بھی داخل نہیں ہو سکتی اور طواف کیے بغیر عمرہ کا احرام بھی نہیں کھول سکتی۔ لہٰذا اگر اسے حج کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ انتظار کرنے کی بجائے عمرے کے ساتھ ہی حج کا احرام باندھ لے اور تمتع کی بجائے قران کر لے۔ یہ قول امام مالکؒ اوزاعیؒ، شافعیؒ اور بہت سے دوسرے علماء کا ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ وہ عمرے کو ترک کر دے اور صرف حج کی نیت کر لے۔

امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ ''امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ اگر (تمتع کی نیت سے احرام باندھنے والی عورت کو طواف سے پہلے حیض شروع ہو جائے اور) وہ عمرہ چھوڑ دے تو اس کا حج صحیح ہو جائے گا۔ لیکن یہ بات سوائے امام ابو حنیفہؒ کے کسی اور نے نہیں کہی۔ اس سلسلے میں امام ابو حنیفہؒ کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عروہؒ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے عمرے کا احرام باندھا، لیکن جس وقت مکہ پہنچی تو حیض شروع ہو گیا، اس لیے میں طواف بیت اللہ اور صفا و مروہ کی سعی نہ کر سکی۔ چناں چہ میں نے اس بات کی شکایت نبی کریم ﷺ سے کی تو آپ نے فرمایا:

انقضی رأسك و امتشطی، و اهلّی بالحج و دعی العمرة

''تم اپنے سر کے بال کھول دو اور کنگھی کر لو اور حج کا احرام باندھ لو اور عمرہ چھوڑ دو۔''

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا۔ پھر جب حج مکمل ہوگیا تو نبی کریم ﷺ نے مجھے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے ساتھ تنعیم کی طرف بھیجا اور وہاں سے میں نے عمرے کا احرام باندھا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

هذه عمرة مكان عمرتك

''یہ عمرہ تمہارے اس عمرہ کی جگہ ہے جو رہ گیا تھا۔''

(یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے)

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے (حیض شروع ہوجانے کی وجہ سے) اپنا عمرہ چھوڑ دیا تھا اور حج کا احرام باندھ لیا تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے ارشاد میں یہ الفاظ موجود ہیں: ۱-دعی عمرات (تم اپنا عمرہ چھوڑ دو) ۲- امتشطی (کنگھی کرلو) ۳- هذه عمرة مكان عمرتك (یہ عمرہ تمہارے اس عمرہ کا بدل ہے جو چھوٹ گیا تھا)

ابن قدامہؒ لکھتے ہیں کہ اس کے برعکس ہماری دلیل مندرجہ ذیل روایات ہیں:

۱- حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ نے عمرہ کا احرام باندھا۔ پھر جب آپ مقام سرف میں پہنچیں تو حیض شروع ہوگیا .... اور جب نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے تو آپ رو رہی تھیں، آپ نے دریافت فرمایا۔ تمہیں کیا ہوا؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: مجھے حیض شروع ہوگیا ہے جب کہ لوگوں نے (عمرہ کرکے) احرام کھول دیا ہے اور میں نے یہ احرام کھولا اور نہ ہی طوافِ بیت اللہ کیا اور لوگ اب حج کے لیے جا رہے ہیں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ان هذا امر كتبه الله على بنات آدم فاغتسلي ثم اهلي بالحج''

''یہ بات تو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بیٹیوں کے مقدر میں لکھی ہے (جس سے چارہ نہیں) سو تم اب غسل کرو، اور حج کا احرام باندھ لو۔''

چناں چہ میں نے ایسا ہی کیا اور تمام مناسک حج ادا کیے۔ حتی کہ جب میں پاک ہوگئی تو بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا و مروہ کی سعی کی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

قد حللت من حجك و عمرتك

''تمہارا (حج اور عمرہ دونوں کا) احرام پورا ہوگیا۔''

حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اپنے دل میں کچھ کھٹک سی محسوس کرتی ہوں کہ میں نے طوافِ بیت اللہ اس وقت تک نہیں کیا جب تک میں حج سے فارغ نہیں ہوگئی۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما سے کہا:

فاذهب يا عبد الرحمن فاعمرها من التنعيم

''اے عبد الرحمٰن! انہیں تنعیم لے جاؤ تاکہ یہ وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کرلیں۔''

۲- طاؤسؒ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے: حضرت ام المومنین بیان کرتی ہیں، میں نے عمرہ کا احرام باندھا پھر روانہ ہوئی اور ابھی طواف نہیں کیا تھا کہ حیض شروع ہوگیا پھر میں نے حج کی نیت کر کے تمام مناسکِ حج ادا کیے۔ پھر روانگی کے دن نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

يسعك طوافك لحجك و عمرتك

''تمہارا یہ طواف تمہارے حج اور عمرہ دونوں کے لیے کافی ہے۔''

لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے میرے ساتھ عبد الرحمٰن ابن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو بھیجا اور وہ مجھے تنعیم لے کر گئے اور وہاں سے میں نے احرام باندھ کر عمرہ کیا۔ (یہ روایت مسلم میں ہے)۔

ان دونوں روایتوں سے وہ تمام باتیں ثابت ہو جاتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں کیوں کہ عمرہ کی نیت کرنے کے بعد حج میں داخل ہو جانا سب کے نزدیک جائز ہے۔ خواہ اسے حج کے فوت ہونے کا خطرہ نہ ہو، لہٰذا اگر واقعی حج کے فوت ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے تو بدرجہ اولیٰ عمرہ کو حج میں بدل دینا جائز ہے۔

سر کے بال نہ کھولے

اگر کوئی عورت عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد (حیض آجانے کی وجہ سے) حج کی نیت کرے تو اسے چاہیے کہ سر کے بال نہ کھولے۔

ابن منذرؒ نے لکھا ہے کہ تمام علماء جن کے بارے میں مجھے یاد ہے ان کا اس پر اجماع ہے کہ اگر کسی عورت نے عمرہ کا احرام باندھا ہو، تو جب تک اس نے طوافِ بیت اللہ نہ کیا ہو، وہ اس احرام پر حج کا احرام باندھ سکتی ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ان صحابہ کرام کو جن کے ساتھ قربانی کے جانور تھے۔ یہ حکم دیا تھا کہ وہ عمرہ کے ساتھ ہی حج کی نیت کرلیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عمرہ کے احرام میں ہوتے ہوئے حج کی نیت کرسکتا ہے۔ لیکن عمرہ ترک کرنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ

"جب حج اور عمرہ کی کرو تو اسے پورا کرو۔"

اور عمرے کا ترک کرنا اس لیے بھی جائز نہیں کہ جو عورت حیض شروع ہوجانے کی بنا پر عمرے کا احرام باندھنے کے بعد حج کی نیت کرنے پر مجبور ہوگئی ہے وہ بغیر کسی نقصان کے اپنا عمرہ بھی کرسکتی ہے۔ لہٰذا عمرہ چھوڑنا جائز نہیں ہے۔

باقی رہی حدیثِ عروہ جس میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: انقضی رأسك و امتشطی و دعی العمرة (کہ بال کھول دو اور کنگھی کرو اور اپنا عمرہ چھوڑ دو) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو روایت کرنے میں حضرت عروہؒ منفرد ہیں اور اس کی تائید میں نہ صرف کوئی اور روایت موجود نہیں بلکہ یہ روایت ان سب روایتوں کے خلاف ہے جو ام المومنین حضرت عائشہؓ سے اس موقع کے بارے میں مروی ہیں جب آپ کو حیض شروع ہوگیا تھا۔ جب کہ یہی روایت حضرت طاؤسؒ، قاسمؒ، اسودؒ وغیرہم سے بھی مروی ہے اور ان میں سے کسی نے اس بات کا ذکر نہیں کیا جو حدیث عروہ میں ہے بلکہ حضرت جابرؓ اور طاؤسؒ کی روایتوں سے تو اس اضافہ کی مخالفت صاف معلوم ہوتی ہے۔

پھر حماد بن زیدؒ نے ہشام بن عروہؒ سے روایت کیا ہے کہ میرے باپ حضرت عروہؒ نے مجھ سے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے حیض شروع ہونے کا واقعہ بیان کیا۔ اس میں انھوں نے کہا کہ ایک سے زائد افراد نے مجھ سے یہ بات بیان کی کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ عمرہ چھوڑ دو، اپنا سر کھول دو اور کنگھی کرو وغیرہ وغیرہ۔ یعنی پوری حدیث بیان کی۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ الفاظ جو حضرت عروہؒ کی روایت میں دوسری روایات سے زائد ہیں، حضرت عروہؒ نے ام المومنین عائشہؓ سے خود نہیں سنے۔ لہٰذا ان کی روایت میں اضافہ چوں کہ دوسری روایات کے خلاف ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عروہؒ کو وہم ہوا ہے۔ یہ اس لیے بھی کہ یہ بات قرآن مجید اور اصولِ دین دونوں کے خلاف ہے کیوں کہ اس کے علاوہ کوئی اور موقع ایسا نہیں ہے کہ اگر عمرے کو پورا کرنا ممکن ہو تو عمرہ کا ترک کرنا جائز قرار دیا گیا ہو۔

نیز یہ امکان بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے جو ارشاد فرمایا: (دعی االعمرۃ) ''عمرہ چھوڑ دو'' اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عمرے کو اسی طرح رہنے دو اور حج کی نیت کرلو۔ یا یہ مراد ہو کہ عمرہ کے ارکان ادا نہ کرو، بلکہ حج کی نیت کرلو، حج کے ساتھ عمرہ از خود ہو جائے گا کیوں کہ عمرے کے ارکان حج کے ارکان میں داخل ہیں۔

اور ام المومنین حضرت عائشہؓ نے جو تنعیم سے احرام باندھ کر عمرہ کیا، اس عمرے کا حکم حضرت عائشہؓ کو نبی کریم ﷺ نے نہیں دیا تھا، بلکہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے خود نبی کریمؐ سے عرض کیا تھا کہ میں اپنے دل میں کچھ ایسا محسوس کر رہی ہوں کہ میں نے جب تک حج نہیں کرلیا اس وقت تک طوافِ بیت اللہ ہی نہیں کیا۔ اس بنا پر نبی کریم ﷺ نے حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ سے کہا تھا کہ یا عبد الرحمن فاعمرها من التنعیم ''اے عبد الرحمٰن! ان کو تنعیم لے جاؤ، تاکہ یہ وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کریں۔

شیخ اثرمؒ نے اسودؒ کے حوالے سے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے: اسودؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ام المومنین حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کیا آپ نے حج کرنے کے بعد عمرہ کیا تھا؟ اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا: بخدا یہ عمرہ نہ تھا بلکہ صرف زیارت

تھی، میں نے جا کر بیت اللہ کی زیارت کی تھی۔

امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو عمرہ صرف اس لیے کرایا تھا کہ حضرت عائشہؓ نے اس پر اصرار کیا تھا، اور عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! اور لوگ دو دو عبادتیں (حج اور عمرہ) کر کے جا رہے ہیں اور میں صرف ایک عبادت یعنی حج ہی کر سکی ہوں۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ نے حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ سے فرمایا: اے عبد الرحمٰن! انہیں عمرہ کرا لاؤ۔ چناں چہ حضرت عبد الرحمٰنؓ ام المومنین حضرت عائشہؓ کو حرم کے آخری کنارے (تنعیم) تک لے گئے اور حضرت عائشہؓ نے وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کیا۔

خرقیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا طوافِ قدوم رہ گیا تھا۔ لیکن آپ پر اس کی قضا لازم نہیں تھی۔ ورنہ نبی کریم ﷺ آپ کو اس کی قضا کا حکم دیتے اور نہ حضرت عائشہ نے طوافِ قدوم کی قضا کی۔

اگر طواف سے پہلے حیض شروع ہو جائے تو ھدی واجب ہے

جب عمرہ کا احرام باندھنے والی عورت حیض شروع ہو جانے کی وجہ سے عمرے کے ساتھ حج کی نیت کر لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ تو اب وہ گویا قران کر رہی ہے اور اس پر قربانی کرنا لازم ہو جاتا ہے اور قربانی کے لیے بکری ذبح کرنا ایک اونٹ ذبح کرنا، یا اونٹ کا ساتواں حصہ بطور قربانی دینا واجب ہوگا اور یہ قربانی چاروں ائمہ کے نزدیک حرم میں اور یوم النحر یعنی دس ذی الحجہ کے دن پیش کی جانی ضروری ہے۔ اس لیے کہ ابتداء میں اس نے عمرے کا احرام باندھا تھا اور پھر حج بھی کر لیا تو گویا اس نے عمرہ اور حج دونوں کا فائدہ اٹھایا۔ اسی کو قرآن کریم اور صحابۂ کرام کی اصطلاح میں تمتع کہتے ہیں یعنی فقہاء کے ''قران'' و ''تمتع'' پر قرآن کی زبان میں لفظ تمتع کا اطلاق ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (البقرۃ:۱۹۶)

''تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے تو وہ حسب مقدور قربانی دے۔''

گویا اس فائدہ اٹھانے میں قران کرنے والا اور تمتع کرنے والا دونوں شامل ہیں۔

طوافِ افاضہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ثم لیقضوا تفثھم و الیوفوا نذورھم و لیطوفوا بالبیت العتیق (الحج:۲۹)

''پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔''

اس آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ قربانی اور ارکان حج میں سے جو کچھ ان کے ذمہ باقی رہ گیا ہے مثلاً سر منڈوانا، شیطان کے ستونوں پر کنکریاں مارنا اور اپنا حلیہ درست کرنا وغیرہ۔ یہ سب ادا کر کے بیت العتیق یعنی خانہ کعبہ کا طواف کریں۔ اور یہی طواف جو جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارنے کے بعد کیا جاتا ہے، طوافِ افاضہ کہلاتا ہے، اور اسی کو طوافِ زیارت یا طواف رکن کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ حج کے ارکان میں شامل ہے۔ اس پر مسلمانوں کے تمام مسالکِ فقہ کا اجماع ہے کہ طوافِ افاضہ حج کا رکن ہے اور اگر حاجی یہ طواف چھوڑ دے تو اس کا حج باطل ہو جاتا ہے۔

طوافِ افاضہ کا وقت

☆ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک طوافِ افاضہ کا وقت یوم النحر (قربانی کے دن) کی آدھی رات سے شروع ہوتا ہے اور اس کے ختم ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے لیکن اس طواف کا ایام تشریق سے موخر کرنا مکروہ ہے۔ اگرچہ اس تاخیر پر دم یعنی جانور ذبح کرنا لازم نہیں آتا۔

☆ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس طواف کا وقت یوم نحر (۱۰ ذی الحجہ) کی فجر طلوع ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی انتہا کے سلسلے میں ان دونوں ائمہ میں اختلاف ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ طواف ان دنوں میں سے کسی ایک دن ضرور ہو جانا چاہیے جن میں قربانی ہو سکتی ہے اور اس سے مؤخر کرے گا تو ایک جانور ذبح کرنا واجب ہوگا۔

امام مالکؒ کے نزدیک طوافِ افاضہ کو ایام تشریق کے آخری دن تک مؤخر کردینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن جلدی کر لینا افضل ہے۔ اور ان کے نزدیک اس کا وقت ماہِ ذی الحجہ کے آخری دن تک باقی رہتا ہے۔ اگر اس سے بھی مؤخر کرے گا تو اس پر ایک جانور کی قربانی لازم ہوگی۔ لیکن مؤخر کردینے کے باوجود اس کا حج صحیح ہوجائے گا۔ کیوں کہ امام مالکؒ کے نزدیک پورا ذی الحجہ کا مہینہ ہے۔

عورتوں کو طوافِ افاضہ میں جلدی کرنا چاہیے

طوافِ افاضہ یوم نحر (قربانی کے دن) یعنی دس ذی الحجہ کو کرلینا افضل ہے۔ امام احمدؒ امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ اور امام بیہقیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دس ذی الحجہ کو پہلے مکہ جا کر طوافِ افاضہ کیا پھر منی واپس تشریف لائے اور نماز ظہر ادا کی۔

لہٰذا عورت کو اگر حیض آجانے کا ڈر ہو تو اس کے لیے طواف افاضہ میں جلدی کرنا اور یوم نحر ہی میں کرلینا بدرجۂ اولیٰ مستحب ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کو حکم دیا کرتی تھیں کہ وہ طوافِ افاضہ یوم نحر یعنی دس ذی الحجہ کو ہی کرلیا کریں، اس اندیشے سے کہ کہیں ان کو حیض نہ شروع ہوجائے۔

عطاءؒ کہتے ہیں کہ اگر عورت کو یہ ڈر ہو کہ حیض شروع ہوجائے گا تو اسے چاہیے کہ رمی جمار سے پہلے طوافِ افاضہ کرلے۔

اگر طوافِ افاضہ سے پہلے حیض شروع ہوجائے

اگر کسی عورت کو وقوفِ عرفہ اور رمی جمرہ کے بعد طوافِ افاضہ کرنے سے پہلے حیض شروع ہوجائے تو وہ کیا کرے؟

اس صورت میں اگر عورت کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ پاک ہونے تک مکہ میں قیام کرسکے تو کوئی دقت نہیں ہے۔ وہ انتظار کرے اور پاک ہونے کے بعد طوافِ افاضہ کرلے۔ بلکہ عورت کو چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرے کہ پاک ہونے تک مکہ میں ہی قیام کرسکے اور طوافِ افاضہ کرلے۔ لیکن اگر اس کے لیے یہ ممکن نہ ہو کہ وہ طوافِ افاضہ کرنے

کے لیے پاک ہونے تک مکہ میں رک سکے کیوں کہ اس کے ساتھی یا وہ سواری جس سے اسے واپس جانا ہے اپنے سفر پر روانہ ہونے کے لیے تیار کھڑے ہوں تو ایسی صورت میں یہ عورت کیا کرے؟

اس سلسلے میں فقہاء کی مختلف آراء ہیں جو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا خیال ہے کہ چوں کہ طوافِ افاضہ حج کا رکن ہے اور اگر رکن ادا نہ ہو تو حج باطل ہو جاتا ہے اور جب تک دوبارہ نہ کرے حج اس کے ذمہ باقی رہتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں عورت اگر کوئی دوا استعمال کرلے جس سے حیض وقتی طور پر رک جائے تاکہ وہ طوافِ افاضہ کرسکے تو کوئی حرج نہیں۔

سعید بن منصورؒ نے حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی عورت ایسی دوا خرید لے جس سے اس کا حیض رک جائے تاکہ وہ طوافِ افاضہ کرسکے تو حضرت ابن عمرؓ نے اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا اور ایسی عورتوں کے لیے آپ نے درختِ اراک (کریر) کا پانی تجویز کیا۔

امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور شافعیوں کی رائے

اس سلسلے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں، جن میں سے مشہور قول یہ ہے کہ جس عورت کو ماہواری کے دنوں میں کسی دن خون آتا ہو اور کسی دن نہ آتا ہو اس کا وہ دن جس دن اسے خون نہ آئے طہر کا دن ہے، یعنی اس دن وہ پاک ہے۔ امام شافعیؒ کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے ان کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے مسلک سے بھی امام شافعیؒ کی اس رائے کی تائید ہوتی ہے اور اس رائے کے مطابق مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ جس عورت کو ایک دن خون آتا ہو اور ایک دن نہ آتا ہو اس کے لیے جائز ہے کہ جس دن اسے خون نہ آئے اس دن چوں کہ وہ پاک ہے لہٰذا وہ مناسب موقع دیکھ کر جلدی سے طوافِ افاضہ کرلے۔

احناف کی رائے

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک (اور امام احمدؒ سے جو دو روایتیں ہیں ان میں سے بھی ایک روایت سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ) جس عورت کا خون نہ رکتا ہو اس کا طواف درست ہے۔ لیکن اگر وہ حائضہ ہے تو اس پر ایک پانچ سالہ اونٹ یا ایک گائے کی قربانی واجب ہوگی۔ لہٰذا اس نے اگر حیض کی حالت میں طوافِ افاضہ کرلیا اور ایک پانچ سالہ اونٹ یا ایک گائے کی قربانی دے دی تو اس کا حج پورا ہوگیا اور فرض ادا ہوگیا۔

مالکی مسلک

علامہ ابن رشدؒ نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ کے اصحاب میں سے ایک گروہ کا قول ہے کہ طواف قدوم، طواف افاضہ کی طرف سے کافی ہوسکتا ہے۔ گویا ان کی رائے یہ ہے کہ حج میں صرف ایک طواف واجب ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے طوافِ قدوم کرلیا تھا تو طوافِ افاضہ نہ کرسکنے کے باوجود اس کا حج مکمل ہوگیا۔

مالکیوں کی اس رائے کی بنیاد ان کے اس قول پر ہے کہ طوافِ قدوم واجب ہے۔ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ: ابن حکمؒ نے امام مالکؒ سے روایت کیا ہے کہ اگر کوئی شخص طوافِ افاضہ کیے بغیر گھر لوٹ گیا اور اس نے طوافِ قدوم اور صفا و مروہ کی سعی کرلی تھی تو یہ طواف اور سعی اس کے لیے طوافِ افاضہ کا قائم مقام ہوجائیں گے۔ لیکن اس صورت میں اس پر قربانی لازم آئے گی۔ اسی طرح طوافِ افاضہ اور سعی اس شخص کے لیے جس نے مکہ میں داخل ہوتے وقت طوافِ قدوم اور سعی نہ کی ہو طوافِ قدوم کا بدل ہوجائے گا۔ لیکن اس صورت میں بھی اس پر قربانی لازم ہوگی اور جس نے یہ بات کہی ہے اس نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ طوافِ قدوم کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بھی واجب ہے، جس طرح طوافِ افاضہ واجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قائم مقام ہوسکتے ہیں۔ نیز یہ اس لیے بھی صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حاجی پر صرف ایک طواف فرض کیا ہے جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے:

وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ

''اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو۔''

اسی آیت کے سیاق میں آگے چل کر ارشاد ہے:

وَ لْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (الحج:۲۹)

''اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔''

اس آیت کا پہلی آیت پر جو واؤ کے ساتھ عطف ہے اس سے مالکیوں کے نزدیک یہی ثابت ہوتا ہے کہ صرف ایک طواف واجب ہے، جو طوافِ قدوم ہو یا طوافِ افاضہ۔ اور اسی سے مالکیوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص طوافِ قدوم کر لے تو اس کا یہی طواف افاضہ کا قائم مقام ہو جائے گا۔

لیکن ان تمام آراء پر ایک دوسرے کی طرف سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً احناف کی یہ رائے کہ حائضہ طواف کر سکتی ہے، جمہور کی رائے کے خلاف ہے۔ اور اسی طرح مالکیوں کی یہ رائے بھی کہ طوافِ قدوم طوافِ افاضہ کا قائم مقام ہو سکتا ہے، جمہور کی رائے کے خلاف ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب آراء اجتہاد پر قائم ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی رائے

امام ابن تیمیہؒ کی رائے ان سب سے مختلف ہے جو ان کے مجموعۂ فتاویٰ میں موجود ہے۔ ان کے نزدیک بغیر طہارت کے طوافِ کعبہ جائز نہیں جیسا کہ حنفیوں نے سمجھ رکھا ہے کیوں کہ امام ابن تیمیہؒ کے خیال میں طواف کے لیے طہارت واجب ہے اور ابن تیمیہؒ امام مالکؒ سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ چناں وہ طوافِ قدوم کو طوافِ افاضہ کا بدل نہیں تسلیم کرتے یعنی ان کے نزدیک یہ صحیح نہیں کہ اگر کسی نے طوافِ قدوم کر لیا ہے تو وہ اگر طوافِ افاضہ نہ کر سکے تو اس کے لیے بس طوافِ قدوم ہی کافی ہے۔ اس کے باوجود ابن تیمیہؒ کے نزدیک ایسی حائضہ عورت کے لیے جو پاک ہونے تک نہ رک سکتی ہو، یہ جائز ہے کہ طوافِ افاضہ اسی حالت میں کر لے اور اس پر بطور فدیہ جانور ذبح کرنا بھی واجب نہیں ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کا کہنا یہ ہے کہ تمام واجبات کے سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ جن کے ادا کرنے کی قدرت ہو وہ ادا کرلے اور جن کے ادا کرنے سے انسان عاجز ہو وہ اس پر سے ساقط ہوجائیں گے۔ چناں چہ اسے چاہیے کہ بیت اللہ کا طواف کرے اور بہتر یہ ہے کہ اگرچہ حیض کی حالت میں ہے، غسل کرلے جس طرح احرام باندھتے وقت غسل کیا جاتا ہے بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ لنگوٹ باندھ لے جس طرح استحاضہ کی حالت میں لنگوٹ باندھا جاتا ہے، اور اس صورت میں اس پر بطور فدیہ جانور کی قربانی واجب نہیں ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے اپنی اس رائے کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ اس حالت میں عورت معذور ہے، لہٰذا معذور ہونے کی بنا پر اس سے طہارت کی شرط ساقط ہوگئی۔ ان کا یہ استدلال ان نصوص پر مبنی ہے جو شرعی معاملات میں عذر کی حالت کے لیے بالعموم موجود ہیں اور ان اصولوں پر مبنی ہے جو اس صورت سے مشابہ ہیں۔

چناں چہ اصول یہ ہے کہ تمام عبادات خواہ وہ واجب ہوں یا مستحب، جب کوئی شخص ان کے بعض ایسے اعمال کو جو ان میں واجب الادا ہوں، ادا کرنے سے عاجز ہو تو یہ اعمال صرف اس بنا پر ساقط نہیں ہوجائے کہ وہ ان کے ادا کرنے سے عاجز ہے بلکہ اس بنا پر ساقط ہوجاتے ہیں کہ ایسی صورت کے لیے نبی کریم ﷺ کی یہ ہدایت موجود ہے کہ:

اذا امرتکم بامر فاتوا منه ما استطعتم

”جب میں تم کو کسی کام کے کرنے کا حکم دوں تو اس کو بقدر استطاعت بجالاؤ۔“

اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشاد کے مطابق ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن:١٦)

”لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔“

طہارت نماز کے لیے بھی شرط ہے بلکہ طواف کے مقابلے میں نماز کے لیے طہارت کی شرط کہیں زیادہ سخت ہے۔ لیکن اگر کسی عورت کو استحاضہ کا خون آتا ہو یا کسی شخص کو مسلسل قطرہ قطرہ پیشاب آنے کا مرض ہو یا اسی طرح کا کوئی اور عذر ہو تو ایسے تمام لوگ طواف

کر سکتے ہیں اور نماز بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس پر تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے۔ حالاں کہ ''حدث'' یعنی ناپاک ہونا ان کے لیے بھی وہی حکم رکھتا ہے جو اور لوگوں کے لیے۔ اور یہ فرق (یعنی ان کے لیے نماز اور طواف ناپاک ہونے کے باوجود جائز ہے جب کہ دوسروں کے لیے جائز نہیں ہے) محض اس بنا پر ہے کہ وہ معذور ہیں۔ اور جب نماز کے شرائط عذر پر ساقط ہو سکتے ہیں تو طواف کے شرائط عذر کی بنا پر بدرجۂ اولیٰ ساقط ہونے چاہئیں۔ نماز پڑھنے کے لیے کپڑا میسر نہ ہونے کی صورت میں بغیر لباس کے نماز پڑھ سکتا ہے اور استحاضہ والی عورت حکمی نجاست اور حقیقی نجاست کی موجودگی میں نماز پڑھ سکتی ہے اور جنبی اور حائضہ پانی میسر نہ آنے کی صورت میں اکثر علماء کے نزدیک بغیر تیمّم کے بھی نماز پڑھنا جائز ہے تو اسی طرح حج میں بھی جب اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ اس صورت کے سوا کسی اور طرح حج کر سکے تو وہ پھر اسی طرح حج کرے گی۔ کیوں کہ کوئی اور صورت اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ گویا یہ وہ آخری صورت ہے جس پر اسے قدرت حاصل ہے۔ بعینہٖ جیسے کوئی شخص پیدل طواف نہیں کر سکتا تو سوار ہو کر کرے گا، اور نجاست سے پاک ہو کر نہیں کر سکتا تو اسی حالت میں کرے گا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر طوافِ افاضہ سے پہلے کسی عورت کو حیض شروع ہو جائے تو وہ معذور ہے۔ لیکن اس عذر کی بنا پر اس پر سے طوافِ افاضہ ساقط نہیں ہوگا بلکہ طواف کا ایک واجب (یعنی طہارت) ساقط ہو جائے گا اور وہ حیض کے باوجود طواف کرے گی۔

بعض لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اس پر بطور فدیہ ایک جانور کی قربانی واجب ہے لیکن ہمارا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اس پر جانور ذبح کرنا لازم نہیں کیوں کہ اگر کوئی شخص بحالت مجبوری کسی واجب کو ترک کر دے تو اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب نہیں۔ اس کے برعکس اگر بھول کر یا لاعلمی کی بنا پر واجب ترک کرے گا تو اس پر ''دم'' واجب ہوگا۔ نیز یہ بات صحیح روایت سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حائضہ کے لیے طوافِ وداع ساقط کر دیا تھا۔

اور جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ طہارت طواف میں فرض بھی ہے اور شرط بھی تو یہ بات واضح ہے کہ طہارت کی شرط جس شدت کے ساتھ نماز کے لیے ضروری ہے اس شدت کے

ساتھ طواف کے لیے نہیں ہے، اور سب جانتے ہیں کہ مجبوری اور عذر کی بنا پر نماز کی شرائط بھی ساقط ہو جاتی ہیں لہٰذا طواف میں کسی ایسی ہی شرط کے ساقط ہونے کی گنجائش بدرجہ اولیٰ ہے۔

طوافِ وداع

حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ینفر احد حتی یکون آخر عهده بالبیت (صحیح مسلم)

”کوئی حاجی گھر کی طرف کوچ نہ کرے جب تک کہ بیت اللہ کی سب سے آخری زیارت یعنی طواف نہ کرلے۔“

یہ حدیث اس سلسلے میں واضح اور صریح ہے کہ مکہ سے باہر جانے والا اس وقت تک نہ جائے جب تک بیت اللہ کے سات چکر (طواف) لگا کر فارغ نہ ہو لے۔ طواف وداع میں صفا و مروہ کی سعی شامل نہیں ہے اور طواف وداع کو طواف صدر بھی کہتے ہیں، یعنی روانگی کا طواف۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ طواف وداع واجب ہے اور اگر کوئی شخص اسے ترک کر دے تو اس پر ایک دم یعنی جانور کی قربانی واجب ہوگی۔ شافعیؒ مسلک کے مطابق بھی یہی بات صحیح ہے اور جمہور علماء کا قول بھی یہی ہے اور امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام حسن بصریؒ اور حکمؒ، حمادؒ اور سفیان ثوریؒ، اسحاقؒ اور ابوثورؒ کا قول بھی یہی ہے۔

امام مالکؒ داؤد ظاہریؒ اور ابن المنذرؒ کا کہنا یہ ہے کہ طوافِ وداع سنت ہے اور اس کے ترک کر دینے پر کوئی فدیہ لازم نہیں آتا۔

مجاہدؒ سے اس سلسلے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک طواف وداع واجب ہے اور دوسری یہ کہ سنت ہے۔

طوافِ وِداع اور حائضہ

مندرجہ بالا اختلاف کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت جس نے حج کرلیا ہو اور طواف افاضہ بھی کر چکی ہو اسے اگر طواف وداع کرنے سے پہلے حیض شروع ہو جائے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ پر تمام فقہی مسالک کا اجماع ہے کہ ایسی عورت سے طواف وداع ساقط ہو جاتا ہے اس لیے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ حج سے فارغ ہوکر روانہ ہونے سے پہلے وہ سب سے آخر میں بیت اللہ کا طواف کریں لیکن اس سلسلے میں اس عورت کے لیے جسے حیض شروع ہو جائے تخفیف کردی گئی ہے۔" یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔

نیز حضرت عروہ سے مروی ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ: ام المومنین حضرت صفیہ بن حیی بن اخطب رضی اللہ عنہا کو طواف افاضہ کے بعد حیض شروع ہوگیا۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ اس بات کا یعنی انہیں حیض شروع ہوجانے کا ذکر میں نے نبی کریم ﷺ سے کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا (أ حابستنا هي؟) کیا یہ اب ہمیں روانگی سے روکے گی؟ تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ طواف افاضہ کرچکی ہیں، اس کے بعد حیض شروع ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: "فلتنفر اذا" پھر کوئی حرج نہیں، اب وہ کوچ کرسکتی ہیں۔ (یہ روایت امام مسلم نے نقل کی ہے)۔

امام نوویؒ نے لکھا ہے: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ طوافِ وداع ہر حاجی پر واجب ہے لیکن حائضہ عورت سے ساقط ہو جاتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس طواف کے ترک کردینے کی بنا پر دم لازم نہیں آتا۔

اور یہی امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور تمام علمائے اسلام کا مسلک ہے کیوں کہ حدیث میں یہ بات موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "فلتنفر اذاً" کہ اب وہ کوچ کرسکتی ہے۔ لیکن آپ نے انہیں فدیہ ادا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ لہٰذا ایسی عورت پر کوئی فدیہ نہیں ہے۔

نیز امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ طواف افاضہ حج کا رکن ہے، جس کا ادا کرنا بہرحال ضروری ہے اور کسی حج کرنے والے سے کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتا۔ خواہ حیض شروع ہوجائے یا کوئی عذر ہو، اور حائضہ کو پاک ہونے تک مکہ ہی میں رکنا چاہیے تاکہ حیض سے پاک ہونے کے بعد طواف افاضہ کر کے واپس جائے اور اگر وہ

طوافِ افاضہ کیے بغیر وطن واپس چلی گئی تو اس کا احرام ختم نہیں ہوگا اور مسلسل احرام کی حالت میں رہے گی کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت صفیہؓ کو طواف وداع کیے بغیر کوچ کی اجازت اس وقت تک نہیں دی جب تک آپ کو یہ معلوم نہ ہوگیا کہ وہ طواف افاضہ کرچکی ہیں۔

نیز ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ ہماری دلیل یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ حضرت صفیہؓ کو حیض شروع ہوگیا ہے تو آپ نے فرمایا: أحابستنا هي؟ کیا اس کا ارادہ یہ ہے کہ ہم اب کوچ نہ کرسکیں؟ لیکن جب آپ کو بتایا گیا کہ وہ دس ذی الحجہ کو طواف افاضہ کرچکی ہیں تو آپ نے فرمایا: (فلتنفر اذاً) تو اب وہ کوچ کرسکتی ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طواف افاضہ کیے بغیر چارہ نہیں اور کسی نے یہ طواف نہ کیا ہو تو اسے رکنا پڑ جائے گا اور اگر وہ حلال ہونے کی نیت سے احرام کھول دے تب بھی حلال نہیں ہوگا اور اس کا احرام ختم نہیں ہوگا کیوں کہ احرام باندھنے کے بعد اگر کوئی شخص حرام ختم کرنے کی نیت سے احرام کھول دے تو احرام ختم نہیں ہوتا جب تک حج یا عمرہ جس کی نیت کی تھی پورا نہ کرلے۔ لہٰذا حائضہ بھی اگر طواف افاضہ کیے بغیر مکہ سے چلی جائے گی تو اس کا احرام اس وقت کھلے گا اور وہ اس وقت حلال ہوگی جب لوٹ کر مکہ جائے اور بیت اللہ کا طواف (طوافِ افاضہ) کرے۔

اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے کہ ''کیا وہ اب ہمیں روکنا چاہتی ہے؟'' اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ قافلہ والوں پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی روانگی اس وقت تک موخر کردیں، جب تک حائضہ عورتیں طواف افاضہ نہ کرلیں۔

اگر کوئی عورت طوافِ زیارت مؤخر کردے، یعنی کوچ کے وقت کرے

اگر عورت حیض سے پاک ہوجائے لیکن وہ طوافِ زیارت نہ کرسکے بلکہ وہ کوچ کے وقت طوافِ زیارت کرے تو کیا اس کا یہ طواف طوافِ وداع کی طرف سے کافی ہوجائے گا۔

اس سلسلے میں ابن قدامہؒ لکھتے ہیں کہ اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں:

۱- ایک یہ کہ اس کا یہی طوافِ زیارت اب طوافِ وداع کے قائم مقام ہوجائے گا۔ کیوں کہ حکم صرف یہ ہے کہ بوقت روانگی ایک آخری زیارت (طواف) ضرور کرے اور وہ اس

نے کرلی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو امور تحیۃ المسجد کے لیے بتائے گئے ہیں، ان کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اگر اسی قسم کا کوئی فرض یا واجب ادا کرلیا جائے تو تحیۃ المسجد ادا ہو جاتا ہے۔

۲- دوسری روایت یہ ہے کہ یہ طواف جو طواف زیارت کی نیت سے کیا جا رہا ہے طواف وداع کے قائم مقام نہیں ہوگا کیوں کہ یہ دونوں طواف علیحدہ علیحدہ واجب عبادتیں ہیں لہٰذا محض ایک طواف دوسرے طواف کی طرف سے کافی نہ ہوگا، جس طرح دو فرض نمازیں علیحدہ علیحدہ ادا کرنا ضروری ہیں۔ ایک پڑھ لینے سے دوسری نماز ادا نہیں ہوگی اور اس پر سے فرض ساقط نہ ہوگا۔

لیکن ہم ان دونوں روایتوں میں پہلی کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ اس کے دلائل زیادہ معقول اور وزنی ہیں۔

طوافِ وداع حائضہ کے علاوہ کسی اور حاجی سے ساقط نہیں ہوتا

طوافِ وداع جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں جمہور فقہاء کے نزدیک (سوائے امام مالکؒ کے جو اسے مستحب قرار دیتے ہیں) واجب ہے۔ لہٰذا شریعت نے اگر اس مسئلہ میں حیض و نفاس والی عورتوں کے لیے تخفیف کردی ہے تو یہ استثناء ہے جو صرف انہی تک محدود ہے۔ ان کے سوا کسی اور حالت کے لیے یہ تخفیف نہیں ہوسکتی۔

اس لیے اگر کوئی شخص طواف وداع کرنے سے پہلے مکہ سے چلا گیا تو اگر وہ کہیں قریب ہی گیا ہے تو واپس آ کر طواف وداع کرے لیکن اگر دور چلا گیا ہے تو ایک قربانی کا جانور بھیج دے۔ یہ قول عطاء، سفیان ثوری، شافعی، اسحاق اور ابوثور رحمہم اللہ کا ہے۔ اور اس سلسلے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس نے یہ طواف عمداً چھوڑا ہے یا بھول کر، یا کسی عذر کی بنا پر چھوڑا ہے یا بغیر عذر کے۔ کیوں کہ یہ حج کے واجبات میں سے ہے اور ترک واجب کے سلسلے میں عمد و خطا اور عذر و عدم عذر سب برابر ہے۔

☆☆

سفر مدینہ منورہ

قبر مبارک کی زیارت مستحب ہے

مدینہ منورہ میں حاضری اور نبی کریم ﷺ کے مزارِ اقدس کی زیارت بلاشبہ حج کا رکن نہیں ہے، حج صرف مکہ مکرمہ میں ہی ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ حج کرنے مکہ مکرمہ ہی آیا کرتے تھے۔ چناں چہ بیت اللہ کا حج کر لینے کے بعد فریضہ حج مکمل ہو جاتا ہے، مدینہ منورہ جانا نہ تو حج کا رکن ہے اور نہ فرض اور نہ واجب۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مدینہ منورہ جانا ہی نہیں چاہیے۔ اس کے برعکس تکمیل حج کے بعد مسلمان کے لیے اس سے بڑی محروم نصیبی و بدقسمتی اور کوئی نہیں کہ وہ مدینہ منورہ حاضری نہ دے سکے۔

اگر ان مرویات سے صرف نظر بھی کرلیا جائے جن کو بیہقیؒ اور دار قطنیؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے (جو لوگوں کی زبان پر عام ہیں، اور حج و مناسک کی کتب میں موجود ہیں اور جن کی رو سے روضۂ اقدس کی زیارت کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور زیارت قبر مبارک ترک کرنے والا مستوجب عتاب قرار پاتا ہے) کیوں کہ ان روایات پر بہت سے محدثین نے کلام کیا ہے، بلکہ بعض علماء نے انھیں موضوع قرار دیا ہے۔ تاہم مدینہ منورہ کی غیر معمولی عظمت و فضیلت، مسجد نبویؐ میں نماز کا بے پایاں اجر و ثواب اور روضۂ نبویؐ کا شوق مومن کو کشاں کشاں مدینہ منورہ پہنچا دیتا ہے۔

ابن ماجہ کی روایت کے مطابق مسجد نبوی میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ہے۔ اسی مسجد مبارک میں سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کا مزار

اقدس ہے جس کی زیارت تمام مستحب اعمال میں سب سے زیادہ افضل ہے اسی بنا پر امت مسلمہ میں ہمیشہ سے یہ ایک طریقہ جاریہ اور سنت مستمرہ رہی ہے۔ لہٰذا حاجی کو چاہیے کہ وہ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد ضرور عازم مدینہ ہو اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھنے کے ثواب کے علاوہ نبی کریم ﷺ کے روضۂ اقدس پر نذرانہ صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کرے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ما من احد مسلم علی عند قبری الا رد اللہ علی روحی حتی ارد علیہ السلام

''جو شخص بھی میری قبر پر مجھے صلوٰۃ وسلام کا نذرانہ پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس وقت میری روح میرے جسم میں لوٹا دیتا ہے اور میں اسے سلام کا جواب دیتا ہوں۔''

یہ روایت ابوداؤد نے بھی بیان کی ہے۔ لیکن اس میں ''عند قبری'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ ''قبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دینا مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا مروج طریقہ ہے، جس پر سب کا اتفاق ہے اور ایک ایسا نیک کام ہے، جس کی رغبت دلائی گئی ہے اور بعض مالکی اور ظاہری علماء کے نزدیک قبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہونا واجب ہے۔''

البتہ بعض حنبلیوں نے بہ نیت زیارت سفر کرنا جائز قرار دیا ہے اور ان کی دلیل حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تشدد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد: المسجد الحرام و مسجدی ھذا والمسجد الاقصیٰ

''قصد و ارادے سے سفر نہ کیا جائے سوائے تین مسجدوں کے: ۱۔مسجد حرام، ۲۔مسجد نبویؐ ۳۔مسجد اقصیٰ۔

یہ روایت کتب ستہ کے علاوہ مسند احمد میں بھی ہے۔

اس کا جواب امام امین محمود خطاب نے اپنی کتاب ''ارشاد الناسک'' میں یہ دیا ہے کہ:

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ

کسی مسجد یا کسی خاص مقام کی طرف شد رحال یعنی قصد و ارادے کے ساتھ اس خیال سے ہرگز سفر نہ کرو کہ اس مکان کو کوئی خصوصیت یا فضیلت حاصل ہے، سوائے ان تین مساجد کے۔ لیکن انسان جب کسی جگہ کو دیکھنے یا کسی جگہ علم حاصل کرنے کے لیے جاتا ہے تو اس کا یہ سفر اس جگہ کی خصوصیت یا فضیلت کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ اس شخص کی وجہ سے ہوتا ہے جو وہاں رہتا ہے۔

امام احمدؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

لا ینبغی للمصلی ان یشد رحاله الی مساجد یبغی فیه الصلوٰة غیر المسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ و مسجدی هذا

"کسی نماز پڑھنے کے لیے مناسب نہیں کہ وہ نماز پڑھنے کے لیے کسی خاص مسجد کا قصد و ارادے سے سفر کرنے، سوائے مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری اس مسجد (مسجد نبوی) کے۔"

اس روایت کی روشنی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اس جگہ کو دیکھنے یا کسی سے ملاقات کرنے کے لیے جانا اس نہی سے مستثنیٰ ہے، کیوں کہ اس پر اجماع ہے کہ تجارت کے لیے قصد و ارادے سے سفر کرنا یا دیگر دنیاوی امور کے لیے سفر کرنا جائز ہے اور جہاد کے لیے جانا، دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنے اور علم حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا واجب یا کم از کم مستحب ہے۔

الغرض اس سلسلے میں قابل ترجیح قول یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہونا اور اس غرض سے سفر کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ انتہائی پسندیدہ اور مستحب عمل ہے۔[1] اس سلسلے میں امام غزالیؒ اپنی کتاب "احیاء علوم الدین" کی جلد دوم کے باب "آداب السفر" میں لکھتے ہیں:

"اسی قسم کے سفروں میں (یعنی جائز سفروں میں) سے انبیاء علیہم السلام، صحابہ

---

(۱) ارشاد الناسک، ص: ۲۲۳، ۲۲۳

کرامؓ، تابعین عظام اور تمام علماء و اولیاء رحمہم اللہ کی قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنا ہے، یعنی اس غرض سے شد رحال جائز ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد: (لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد مسجدی هذا والمسجد الحرام و المسجد الاقصیٰ) ''سفر کے لیے کجاوے نہ کسے جائیں مگر تین مسجدوں کے لیے یعنی ۱-میری یہ مسجد (مسجد نبوی) ۲-مسجد حرام ۳-مسجد اقصیٰ'' صرف انہی مساجد کے بارے میں ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ باقی تمام مساجد ایک جیسی ہیں، کسی کو دوسری پر کوئی فضیلت نہیں، اس لیے کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے سفر نہ کیا جائے۔ لہٰذا آپ کے اس ارشاد کا اطلاق روضۂ رسول ﷺ کی زیارت یا دوسرے انبیاء اور صلحاء کی قبروں کی زیارت کے لیے جانے پر نہیں ہوتا۔

ان اقوال و آراء کی روشنی میں یہ ثابت ہوگیا کہ قبر نبی ﷺ کی زیارت مستحب ہے اور یہ استحباب مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہے۔

حیض اور نفاس کی حالت میں مسجد نبویؐ میں یا قبرِ نبیؐ پر جانا

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عورت مدینہ منورہ میں قیام کرنے کے بعد روانگی کی تیاری کر رہی ہوتی ہے مگر وہ حیض یا نفاس کی حالت میں ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا وہ عورت مسجد نبویؐ میں داخل ہوسکتی ہے تاکہ قبر نبی ﷺ کی زیارت کر سکے۔

اس مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ اس حالت میں مسجد نبویؐ میں داخل ہونے کا حکم وہی ہے جو دوسری مسجدوں میں داخل ہونے کا ہے۔ جب کہ جنابت یا حیض و نفاس کی حالت میں مسجد میں داخل ہونے کے جواز و عدم جواز میں علماء کے تین اقوال ہیں:

۱- علماء کے ایک گروہ کے نزدیک ایسی حالت میں مسجدوں میں داخل ہونا مطلقاً ناجائز ہے۔

۲- دوسرے گروہ کے نزدیک ایسی حالت میں مسجد میں ٹھہرنا منع ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص مسجد میں رُکے بغیر صرف اس میں سے گزر جائے تو جائز ہے۔

۳- علماء کا تیسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اس حالت میں مسجد میں ٹھہرنا اور گزرنا سب

جائز ہے۔

پہلے گروہ کے علماء میں فقہاء مالکیہ شامل ہیں، جن کا کہنا ہے کہ جنبی، حائضہ اور نفاس والی عورت کا مسجد میں داخل ہونا بالکل ناجائز ہے، خواہ ٹھہرنے کے لیے ہو یا محض ایک دروازے سے گزر کر دوسرے دروازے تک جانے کے لیے ہو اور خواہ یہ مسجد اس کے گھر کی مسجد ہو، البتہ چور، درندے یا کسی ظالم کے خوف کی صورت میں یہ جائز ہے کہ تیمّم کر کے مسجد میں داخل ہو جائے اور رات وہاں گزارے۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا (النساء:۴۳)

”جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ، نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جان لو کہ کیا کہہ رہے ہو اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ غسل نہ کرلو، الا یہ کہ راستہ سے گزرتے ہو۔“

اس آیت کریمہ میں نماز سے مراد نماز بھی ہے اور نماز پڑھنے کے مقامات بھی اس لیے کہ سورہ حج میں صلوٰۃ کو مقام صلوٰۃ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَّ بِيَعٌ وَّ صَلَوَاتٌ وَّ مَسَاجِدُ (الحج:۴۰)

”تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں مسمار کر ڈالی جاتیں۔“

اس سے ثابت ہوا کہ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ سے مراد مسجد میں سے گزرنا ہے۔ نیز ان فقہاء نے اپنے مسلک کے لیے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو مسلمؒ نے روایت کی ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا احل المسجد لحائض و لا جنب

”میں مسجد میں حیض والی عورت اور جنبی کے داخل ہونے کی جائز نہیں ٹھہراتا۔“

علماء کے دوسرے گروہ نے جنبی اور حائضہ عورت کا مسجد میں داخل ہونا اور گزرنا چند

شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ ان شرائط کی تفصیل یہ ہے:

☆ حنفیوں کے نزدیک جنابت اور حیض و نفاس کی حالت میں عورت کا مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں مگر یہ کہ کوئی ضرورت لاحق ہو مثلاً یہ کہ غسل کے لیے پانی مسجد کے علاوہ کہیں موجود نہ ہو یا گھر کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہو اور اگر صورت ایسی ہو کہ نہ تو دروازے کو کسی دوسری طرف کھولا جا سکتا ہو اور نہ وہ شخص جو مسجد سے گزرنے پر مجبور ہے کسی اور مکان میں رہنے پر قادر ہو۔

☆ شافعیوں کے نزدیک حیض اور نفاس کے ساتھ خواہ خون کتنا ہی کم آ رہا ہو مسجد میں داخل ہونا اور ٹھہرنا یا بار بار آنا حرام ہے، البتہ صرف گزرنا جائز ہے۔ کیوں کہ مذکورہ آیت کریمہ میں اس کی اجازت موجود ہے۔ لیکن یہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مسجد ناپاک ہونے کا ذرا بھی اندیشہ ہو، اس کے باوجود اس کا مسجد میں سے گزرنا مکروہ ہے۔ کیوں کہ اس کا حدث یعنی نجاست حکمی انتہائی شدید ہے اور اگر مسجد کے آلودہ ہونے کا اندیشہ ہو تب بھی مسجد میں داخل ہونے کے جواز کی شرط یہ ہے کہ ایک دروازے سے داخل ہو اور دوسرے سے باہر نکل جائے۔ یعنی اس کا مسجد میں سے یہ گزرنا کسی ضرورت اور مجبوری کے ماتحت ہو۔

☆ جنبیوں کے نزدیک جنبی اور حیض و نفاس والی عورت کے لیے بغیر ٹھہرے مسجد میں سے گزرنا جائز ہے، خواہ اس وقت اسے خون آ رہا ہو۔ لیکن اس شرط کے ساتھ مسجد کے آلودہ ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور مسجد میں ٹھہرنا صرف اس وقت جائز ہے جب خون آنا بند ہو چکا ہو۔ یہ لوگ بھی اپنے مسلک کے دلائل رکھتے ہیں جسے ابن قدامہؒ نے المغنی میں بیان کیا ہے کہ:

> ''حیض و نفاس والی عورت اور جنبی کے لیے مسجد میں ٹھہرنا ناجائز نہیں ہے لیکن ہمارا مسلک یہ ہے کہ ''الا عابری سبیل'' میں ٹھہرنے کی ممانعت میں جو استثناء ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ گزرنا مباح ہو۔''

نیز حضرت عائشہؓ سے مروی ہے(۱) کہ

''نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ناولینی الخمرة من المسجد۔

''مجھے مسجد میں سے چٹائی کا ٹکڑا لا دو۔ میں نے عرض کیا: میں حائضہ ہوں۔

آپؐ نے فرمایا:

ان حیضتك لیست فی یدك (مسلم)

''تمہارا حیض تمہارے ہاتھوں میں نہیں ہے یعنی ہاتھ تو ناپاک نہیں ہیں۔''

نیز حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ''ہم جنابت کی حالت میں مسجد سے گزر جایا کرتے تھے۔ اس روایت کو ابن منذرؒ نے بیان کیا ہے۔ نیز زید بن اسلم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ جنابت کی حالت میں مسجد میں سے گزر جایا کرتے تھے۔ یہ روایت بھی ابن منذرؒ نے بیان کی ہے۔ اس روایت میں تمام صحابہ کرام کی طرف اشارہ ہے گویا یہ ایسا مسئلہ تھا جس میں کسی کو اختلاف نہ تھا۔ اس کے مقابل وہ حدیث جو ہم نے پہلے بیان کی ہے کہ (لا احل المسجد لجنب ولا حائض) اس کے بارے میں ابن رشدؒ نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے کہ یہ حدیث علمائے حدیث کے نزدیک مستند نہیں ہے۔ نیز اس حدیث کو امام احمدؒ نے بھی ضعیف قرار دیا ہے جب کہ ابن قطانؒ نے اسے صحیح اور حسن لکھا ہے۔

تیسرے گروہ میں جو علماء شامل ہیں ان میں مزنیؒ داؤد ظاہریؒ اور ابن منذرؒ شامل ہیں۔ ان کے نزدیک جنبی کے لیے مسجد میں ٹھہرنا بغیر کسی شرط کے جائز ہے اور اس جواز کی دلیل ان کے پاس یہ ہے کہ آیت: وَلَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى (النساء:۴۳) میں صلوٰۃ سے مجازاً موضع صلوٰۃ مراد لینے کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہاں صلوٰۃ سے اس کے حقیقی معنی یعنی نماز مراد ہیں۔ لہٰذا ''عابری سبیل'' سے مسجد میں سے گزرنے والا مراد نہیں لیا جاسکتا بلکہ اس سے وہ مسافر مراد ہے جسے سفر میں ہونے کی وجہ سے پانی نہ مل سکے اور وہ جنبی ہوتو اس وقت تک نماز کے قریب نہ جائے جب تک تیمّم نہ کرلے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ملنے کے لیے کافر بھی مسجد نبویؐ میں آیا کرتے تھے جن کے جنبی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لہٰذا اگر جنبی کا مسجد میں داخل ہونا اور ٹھہرنا منع ہوتا تو آپ ﷺ کافروں کو مسجد میں آنے کی اجازت نہ دیتے۔ قاضی ابوطیب الطبریؒ نے لکھا ہے کہ:

---

(۱) مصنف کو مغالطہ ہوا ہے۔ یہ روایت ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے نہ کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے۔ (مترجم)

''حائضہ عورت کو اگر اپنے آپ پر پختہ اعتماد نہ ہو اور نہ اس نے کس کر لنگوٹ باندھ رکھا ہو تو اس کے لیے مسجد میں داخل ہونا مکروہ ہے۔ لیکن اگر اسے اعتماد ہو کہ اس کی وجہ سے مسجد آلودہ نہ ہو گی تو پھر مکروہ نہیں ہے۔''

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حیض کی حالت میں عورت مسجد میں داخل ہو سکتی ہے بشرطیکہ اسے یہ اطمینان ہو کہ اس کی وجہ سے مسجد آلودہ نہ ہو گی۔ یہ مسلک حنبلیوں اور بعض علماء ظاہریہ کا ہے اور مزنیؒ ابن منذرؒ اور قاضی ابو طیب الطبریؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ لیکن حنفیوں، مالکیوں اور شافعیوں کے نزدیک ضرورت اور مجبوری کے بغیر جنابت اور حیض و نفاس والی عورت کا مسجد میں جانا جائز نہیں ہے۔

اس ہم دیکھتے ہیں کہ اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض علماء نے عزیمت کو ملحوظ رکھا ہے اور بعض نے رخصت کو اور ہر ایک کے پاس اپنی بات کی دلیل موجود ہے۔ لیکن ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ حیض و نفاس والی عورت کو زیادہ محتاط طریقے پر عمل کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ مدینہ سے کوچ کرتے وقت قبر مبارک کی زیارت کے لیے نبی کریم ﷺ کی مسجد مبارک میں اس حالت میں داخل نہ ہو بلکہ اس کے لیے یہ کافی ہے کہ باب جبریل کے ایک طرف کھڑے ہو کر نبی ﷺ پر صلوٰۃ و سلام کا نذرانہ پیش کر دے اور لوٹ جائے۔ اس طریقے میں ادب و احتیاط کا پہلو زیادہ ہے۔ واللہ اعلم

و اٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين